بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

اکرم التفاسیر

سُبْحٰنَ الَّذِیٓ

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

15

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ
اکرم التفاسیر
سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ
الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی
15

بے شمار لوگوں کی اصلاح کا سبب بننے والی حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کی سمجھنے میں انتہائی آسان، فرقہ پرستی سے پاک اور موجودہ زمانہ کے مطابق لکھی ہوئی قرآن اردو تفسیر وٹس ایپ پر فری حاصل کریں۔

یاد رکھیں گناہ جہالت کا پھل ہوتا ہے اور یہ بڑی شرم اور بدبختی کی بات ہے اگر ہم ساری زندگی میں اتنا بھی نہ جان سکیں کہ قرآن میں لکھا کیا ہے۔ لیکن اب آپ کے پاس آسان طریقہ موجود ہے۔ قرآن کی تفسیر ہر وقت آپ کی جیب میں ہو گی اور آپ کو جب بھی دن میں فارغ وقت جہاں بھی حاصل ہو آپ کچھ صفحے روزانہ پڑھتے رہیں اس طرح کچھ ہی وقت میں آپ پورے قرآن کی تفسیر سمجھ سکتے ہیں جس سے آپ کے ہزاروں عقائد و اعمال کی اصلاح ہو کر شریعت کے مطابق ہو جائیں گے اور آپ کی دنیا اور آخرت دونوں جہاں بہترین ہو جائیں گے۔ ہر پارہ کی علیحدہ علیحدہ تفسیر موجود ہے۔

اپنے وٹس ایپ سے اوپر دیئے گے نمبر پر میسج کریں کہ آپ کو لکھی ہوئی تفسیر چاہیے۔ جبکہ ویب سائیٹ سے بھی آپ یہی تفسیر آڈیو، وڈیو اور تحریر کردہ حاصل کر سکتے ہیں۔

اپنے دوستوں رشتہ داروں سے یہ پوسٹ شئیر کر کے ڈھیروں ثواب حاصل کریں

اکرم التفاسیر

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

پارہ 15

بار اوّل .... دسمبر 2014ء

تعداد .... دو ہزار

قیمت .... 470 روپے

ناشر .... ملک عبدالقدیر اعوان

ناظم اعلیٰ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ

دار العرفان منارہ، ضلع چکوال

نے انتخاب جدید پریس لاہور سے طبع کروایا

اویسیہ کتب خانہ

اویسیہ سوسائٹی۔ کالج روڈ۔ لاہور

از دلِ خیزد بر دلِ ریزد

اکثر احباب سوچتے ہوں گے اسرار التنزیل کے ہوتے ہوئے اکرم التفاسیر کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس بارے میں عرض کردوں کہ نہ تو خود شنائی کی پہلے کوئی تمنا تھی نہ اب ہے اور نہ ان شاء اللہ آئندہ ہوگی۔ نہ ہی یہ خیال دل میں آیا کہ مجھے کوئی بڑا عالم یا مفتی یا مفسرِ قرآن کہے نہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کبھی اپنا وقت قربان کیا۔ ہاں! یہ خواہش ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم اور استاد المکرم حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی خصوصی توجہ سے جو علوم ومعارف عطا فرمائے انہیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچاؤں اور اپنا فریضہ ادا کروں۔

ایک اور بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اپنے وقتِ نزول سے تا حال اور آئندہ تا قیامت بلکہ اس سے بھی آگے حساب وکتاب' جنت ودوزخ کی بات کرتا ہے اور تمام انسانیت کو راہنمائی اور ہدایت فراہم کرتا آیا ہے اور ان شاء اللہ کرتا رہے گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں' قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اب اس کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ رسول اور نہ ہی کوئی کتاب یا صحیفہ اس لیے کہ تمام مخلوق کے مسائل کا حل اس میں موجود ہے۔ ہر زمانے کے لوگ اپنے اپنے حالات کے مطابق استفادہ کرتے آئے ہیں' آئندہ بھی کرتے رہیں گے اور یہ خصوصیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے کلام ہی کی ہوسکتی ہے۔ پہلے وقتوں میں آج کی طرح نقل وحمل و رسل و رسائل کے مواقع اتنے نہیں تھے اس لیے ایک سے دوسری جگہ علوم وایجادات پہنچنے میں سالہا سال لگ جاتے تھے۔

زمانہ حال کی جدید ایجادات اور خصوصاً الیکٹرانک ایجادات نے تو پوری دنیا کو ایک گھر کی صورت میں یکجا کر دیا یعنی Global Village اور سالوں کی مسافت سمٹ کر سیکنڈ کے ہزارویں حصہ تک آ گئی ہے اس لیے زمانے اور وقت کی رفتار بھی اتنی ہی تیزی سے تبدیل ہو

رہی ہے۔ آنے والے وقتوں میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی، ان کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی پر ایمان لانے والوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً جدید علوم کے ماہرین اور سائنسدانوں کی کثیر تعداد اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو رہی ہے اور یورپ میں تو بہت ہی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔

بات کہاں سے کہاں تک چلی گئی! بات تو ہو رہی تھی اسرار التنزیل کے ہوتے ہوئے اکرم التفاسیر کے منظر عام پر آنے کی لہٰذا اسرار التنزیل کی اپنی ایک افادیت ہے۔ یہ 1971ء کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی معیت میں اپنے گھر کی حاضری کا شرف بخشا جس میں ساتھیوں کی کثیر تعداد بھی مقامِ ملتزم پر حاضر تھی۔ جس دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا' عطا و کرم کی اس بارش میں اہلِ بصیرت نے دیکھا کہ فہمِ قرآن کا پیغام قلب پر وجدان کی صورت میں نازل ہوا۔ اسی پیغام کو اہل دل کی امانت سمجھتے ہوئے سپردِ قلم کر دیا کہ شاید اپنے اہل تک پہنچ جائے۔

اسرار التنزیل کا انداز عام فہم اور اجمالی ہے جبکہ اکرم التفاسیر میں حالاتِ حاضرہ کے مطابق ذرا بحث کو وسیع کیا گیا ہے۔ یہ بات اہلِ علم پر عیاں ہے اور پڑھنے والوں کے لیے رشد و ہدایت کا موجب بنے گی۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے' نجاتِ اخروی کا سبب بنائے اور رضائے الٰہی نصیب فرمائے (آمین)

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

امیر محمد اکرم
مولانا محمد اکرم اعوان
شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ
دارالعرفان منارہ ضلع چکوال

امیر المکرم بحیثیت مفکرِ قرآن

یہ اعجازِ قرآن ہے کہ بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور علوم میں ارتقاء کے باعث مفسرینِ کرام قرآنی علوم کی وہ جہتیں بھی آشکار کر رہے ہیں جو پہلے مفسرین کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ اگر یہ قرآن و حدیث کی معین کردہ حدود کے اندر اور اللہ کے دین اور شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں تو یہ بھی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کا ہی پرتو ہے جو بطور علم لدنّی ان علمائے ربانی کو عطا ہوئے۔ امیر المکرم کے خطابات سے ماخوذ اکرم التفاسیر بھی فی زمانہ حالات و واقعات اور علوم جدیدہ کا احاطہ کرتے ہوئے علم لدنّی کی ایسی روشن مثال ہے جس میں نہ صرف علوم مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ضیاء نظر آتی ہے بلکہ برکاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قلوب کو تحریک بخشتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

قرآن کے مضامین میں اس قدر وسعت اور تنوع ہے کہ ان کی کسی فہرست کو حتمی قرار دینا ممکن ہی نہیں لیکن قرآن حکیم کا ہر مضمون ایک نظریہ اور فکر کی بات کرتا ہے۔ امیر المکرم سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ قران میں کثرت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تذکرہ نظر آتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ موسیٰ اور فرعون ہر زمانہ، ہر دور اور ہر معاشرے کے دو مرکزی کردار بھی ہیں جن کے مابین حق و باطل کا معرکہ مسلسل بپا ہے اور قرآن میں جا بجا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے حوالے سے حق و باطل کے اسی معرکے کا تذکرہ ہے۔ حق و باطل کا یہی معرکہ قرآن کا مرکزی مضمون ہے۔ گرانقدر علمی مباحث قرآن کی معروف تفاسیر کی زینت تو نظر آتے ہیں لیکن قرآن کے اس مرکزی مضمون یا بالفاظ دیگر ''فکرِ قرآنی'' پر بہت کم بات کی گئی۔

دشمنانِ اسلام آج کھل کر قرآن کی مخالفت پر تل گئے اور اس کے پیغام کو دبانے کے

لیے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں لیکن کیا وہ قرآن کے عائلی قوانین سے خائف ہیں، قانون وراثت سے پریشان ہیں، جنت و دوزخ یا ثواب وعذاب سے گھبرا رہے ہیں؟ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کفار کا تو ان پر ایمان ہی نہیں۔ آج ساری کی ساری طاغوتی قوتیں اس قرآنی فکر سے لرزہ براندام ہیں جو دائمی غلبہ حق کی نوید دیتی ہے اور امیر المکرم اسی قرآنی فکر کے نقیب ہیں۔ اکرم التفاسیر میں آپ نے اسی فکرِ قرآنی کو اجاگر کیا ہے' جو اس تفسیر کا طرہ امتیاز ہے۔

امیر المکرم کفار کے لیے اللہ تعالیٰ کے اٹل قانون قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ کی روشنی میں طاغوتی قوتوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ تمہارے لیے دائمی شکست کا فیصلہ فرما دیا گیا ہے اور ذلت و رسوائی تمہارا مقدر ہے۔ غلبۂ حق کو روکنا اب تمہارے بس کی بات نہیں۔ اپنے خطابات میں آپ بکھری ہوئی ملت کو دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آؤ پھر کسی یکتائی سے عہد غلامی کرلو۔ تمہاری ذمہ داری کوئی ایک معاشرہ، قوم یا ملک نہیں بلکہ پوری انسانیت ہے۔ قرآن نے انقلاب دشمن سازشوں سے آگاہ کرتے ہوئے یہود کی طویل فردِ جرم بیان کی ہے جس میں انبیاء علیہم السلام سمیت اہلِ حق کے قتل کے جرائم بھی ہیں۔ امیر المکرم نے قرآنی فرمودات کی روشنی میں عالمی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے عصرِ حاضر میں یہود کے سازشی کردار کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ صیہونیت صرف عالمِ اسلام ہی کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی دشمن نظر آتی ہے۔

یہ دور اسی فکرِ قرآنی کی پہچان کا دور ہے اور امیر المکرم نے بھر پور انداز میں اسے اجاگر کیا ہے۔ کفر اپنے لیے اس خطرے کو اس حد تک پہچان چکا ہے کہ عملی اقدام پر اتر آیا ہے لیکن حضرت امیر المکرم قرآن کی روشنی میں حالات و واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے غزوۃ الہند کی نوید دے رہے ہیں۔ آپ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 12 کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''کفار کے لیے یہ آیۂ کریمہ قیامت تک کے لیے نوید شکست ہے اور میں بڑی بے باکی سے کہتا ہوں، پورے یقین، پورے ایمان سے منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ دنیا کی کافر سپر طاقتیں پھر شکست سے دوچار ہوں گی اور ان شاء اللہ پھر غلبۂ اسلام ہوگا۔''

چونکہ تفسیر کا انداز بیانیہ ہے، تو امیر المکرم کے زوردار اندازِ بیان میں فکرِ قرآنی جب قاری تک پہنچتی ہے تو اس کے دل میں ایک تحریک بپا کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اسے آنے والے انقلاب کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔

امیر المکرم نے فکرِ قرآنی کی بات کرتے ہوئے امت میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھیلائی گئی اس غلط فہمی کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ حالات کو بدلنے کے لیے کسی امام مہدی کا انتظار کیا جائے۔ یہ موہوم امید افیون سے کم نہیں جس نے امت کو سلا دیا کہ اب کفر سے نبٹنا ہمارے بس کی بات نہیں اور یہ کام امام مہدی ہی کریں گے۔ حضرت کے خطبات بے عملی کی اس کیفیت سے بیداری کا پیغام ہیں کہ اُمت پہ ابھی بے بسی کا دور نہیں آیا۔ ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہے اور ہر فرد کو امام مہدی کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ امیر المکرم امام مہدی کی آمد کی بجائے غلبۂ حق کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔ یہی قرآنی فکر ہے جو ہر عہد میں حق و باطل کے معرکے کو مہمیز کرتی ہے، جو ہر دور میں خونِ مسلم کو گرم اور اُمتِ مسلمہ کو متحرک رکھتی ہے۔

امیر المکرم نے اکرم التفاسیر میں یہ فکر اس قدر نمایاں طور پر پیش کی ہے کہ وہ مفسرِ قرآن سے آگے مفکرِ قران نظر آتے ہیں اور یاد رہے! ہر انقلاب کے پیچھے کوئی مفکر ہوتا ہے۔

چھ جلدوں پر محیط تفسیر ''اسرار التنزیل'' کے حوالے سے امیر المکرم کی پہچان بطور مفسرِ قرآن تو مسلمہ ہے لیکن اب ''اکرم التفاسیر'' کی صورت آپ نے جس طرح قرآنی فکر کو اجاگر کیا ہے، آپ کا تعارف بطور ''مفکرِ قرآن'' حاوی نظر آتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مفکرِ قرآن امیر المکرم کو صحت اور عمر دراز عطا فرمائے کہ یہ بیانیہ تفسیر نہ صرف مکمل ہو بلکہ آپ انقلاب بپا ہوتا ہوا بھی دیکھیں۔

ابوالاحمدین

ابوالاحمدین

فہرست مندرجات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ
مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط

اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ (البقرہ:32)

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ مَنْ زَانَتْ بِہِ الْعُصُرُ

پارہ 15 سبحٰن الذیٓ

سورۂ بنی اسرآءیل رکوع 1 آیات 1 تا 10

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا
الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۱﴾ وَاٰتَيْنَا
مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ
وَكِيْلًا ؕ﴿۲﴾ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ﴿۳﴾ وَقَضَيْنَآ
اِلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِی الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا
كَبِيْرًا ﴿۴﴾ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ
شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ؕ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ﴿۵﴾ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ
الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ﴿۶﴾ اِنْ
اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۫ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ
الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ
وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ﴿۷﴾ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ
عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ﴿۸﴾ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِیْ لِلَّتِیْ

هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝٩ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝١٠

پاک ہے وہ (ذات) جو اپنے بندے (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم) کو ایک رات میں مسجدِ حرام (مسجدِ کعبہ) سے مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) تک جس کے گرد اگرد ہم نے برکتیں کر رکھی ہیں، لے کر گیا تاکہ ہم انہیں اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہی (اللہ) سننے والا دیکھنے والا ہے ﴿۱﴾ اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب عطا فرمائی اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا کہ تم میرے سوا کسی کو اپنا کارساز مت بنانا ﴿۲﴾ ان لوگوں کی نسل جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا، بے شک وہ (نوح علیہ السلام) بڑے شکرگزار بندے تھے ﴿۳﴾ اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کو بتا دیا تھا کہ تم ضرور زمین میں دو بار فساد کرو گے اور بہت بڑی سرکشی کرو گے ﴿۴﴾ پس جب ان دو میں پہلی (بار) کے وعدے (سزا) کا وقت آیا تو ہم نے تم پر اپنے سخت لڑائی والے بندے مسلط کر دیے پس وہ شہروں کے اندر گھس گئے اور وہ وعدہ پورا ہو کر رہا ﴿۵﴾ پھر ہم نے (توبہ کے بعد) تم کو ان پر غلبہ دیا اور ہم نے مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائی اور ہم نے تمہاری جماعت کو بڑھا دیا اگر تم نے اچھے کام کیے ﴿۶﴾ تو اپنے ہی لیے اچھے کام کیے اور اگر بُرے کام کیے تو اپنے ہی لیے۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا (تو ہم نے پھر اپنے بندے مسلط کر دیے) تاکہ (مار مار کر) تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور جس طرح وہ پہلی مرتبہ مسجد (بیت المقدس) میں گھسے تھے اسی طرح پھر اس میں داخل ہو جائیں اور جس چیز پر ان کا بس چلے اسے تباہ و برباد کر دیں ﴿۷﴾ امید ہے کہ تمہارا پروردگار (اللہ) تم پر رحم فرمائے اور اگر پھر وہی (حرکتیں) کرو گے تو ہم بھی وہی (سلوک) کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے ﴿۸﴾ بے شک یہ

قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے اور ایمان والوں کو جو نیک کام کرتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے ﴿۹﴾ اور یہ بھی (بتاتا ہے) کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۱۰﴾

تفسیر و معارف

پندرھواں پارہ شروع ہوتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ مکّی سورہ ہے۔ چونکہ اس میں بنی اسرائیل کے بہت اہم واقعات کا تذکرہ ہے اس لیے اِسے سورۂ بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ معراج کا ذکرِ خیر ہے لہٰذا یہ سورۃ الأسراء بھی کہلاتی ہے۔

واقعہء معراج:

فرمایا: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ①

فرمایا، پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو رات میں سیر کرائی مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک۔ وہ مسجدِ اقصیٰ جس کے گرداگرد ہم نے بہت برکت رکھی ہے تاکہ انہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں۔ بے شک اللہ دیکھنے، سننے والے ہیں۔ واقعہء معراج ہجرت سے تین سال قبل یعنی نبوت کے دسویں سال پیش آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم رات میں آرام فرما رہے تھے کہ جبرائیل امین تشریف لائے، جنت کی سواری بُراق بھی ساتھ لائے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو جگایا آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اُن کے ہمراہ پہلے بیت اللہ تشریف لے گئے اور وہاں سے بُراق پر جلوہ افروز ہو کر بیت المقدس تشریف لے گئے۔

اس سفر کو اَسراء اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ راتوں رات کیا جانے والا سفر تھا اور رات کے سفر کو اَسراء کہتے ہیں۔ بیت المقدس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے دو رکعت ادا فرمائیں اور تمام انبیاءؑ کو وہاں لایا گیا سب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اقتدا میں یہ دو رکعت ادا کیے یوں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو امام الانبیاءؑ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ بیت المقدس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو آسمانوں پر لے جایا گیا، سدرۃ المنتہٰی سے بھی آگے جہاں تک اللہ کریم نے چاہا وہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلّم تشریف لے گئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم مکۃ المکرمہ سے مسجد اقصیٰ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ فرمایا: بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ۔۔۔ بیت المقدس ایسی جگہ ہے جس کے گرداگرد یعنی ماحول کو ہم نے برکتوں سے بھر دیا ہے۔ وہاں ظاہری برکات بھی بے شمار ہیں کہ سرسبز وشاداب علاقہ ہے اور ہر موسم کے پھل وافر مقدار میں ہر طرف دستیاب ہوتے ہیں۔ وہاں اللہ کی نعمتوں کی بہت فراوانی ہے اور باطنی برکات بھی ہر آن برستی ہیں کہ یہ تجلیاتِ باری کا ماخذ ہے۔ بیت المقدس بہت سی اقوام کا قبلہ بھی رہا ہے اور اس پر برکات کے نزول کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ بہت سے انبیاءؑ کی آرام گاہ ہے تو ظاہراً بھی اور باطناً بھی یہ بے پناہ برکات کا مجموعہ ہے۔

معراج، جسمِ مبارک کے ساتھ ہوا:

بعض لوگوں کی رائے میں معراج ایک روحانی سفر تھا اور روحِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم نے تمام حالات کا مشاہدہ کیا۔ حق یہ ہے کہ روحانی واقعات ومعجزات سے تو سیرت پاک پُر ہے جبکہ یہاں تو بات شروع ہی اس اعلان سے کی گئی ہے کہ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ۔۔۔ اللہ ہر کمزوری سے پاک ہے، قادرِ مطلق ہے جو چاہے کرسکتا ہے۔ اُس زمانے میں شب بھر میں مکہ مکرمہ سے بیت المقدس پہنچنا اور واپس پلٹ آنا انوکھی بات تھی بلکہ ناممکنات میں سے تھا کہ یہ مہینوں کا سفر تھا لیکن یہ اللہ کریم کی قدرت کاملہ کا اظہار تھا، اللہ کریم، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو بالائے آسمان اور اُس سے بھی آگے جہاں تک چاہا لے گئے۔ جو لوگ معراج کو روحانی سفر کہتے ہیں انہیں سوچنا چاہیے کہ اللہ کریم نے اس آیہء مبارکہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے بِعَبْدِهٖ کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے معنی ہیں 'بندہ'۔ اور 'بندہ' نہ تو صرف روح کو کہتے ہیں نہ ہی صرف بدن کو بلکہ روح مع الجسد کو 'بندہ' کہتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اپنے جسمِ مبارک سمیت بیت اللہ سے بیت المقدس اور بیت المقدس سے سدرۃ المنتہیٰ اور اس سے آگے جہاں تک اللہ نے چاہا تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بنفس نفیس برزخ کے حالات کا مشاہدہ فرمایا۔ جنت کا مشاہدہ فرمایا، دوزخ کو دیکھا اور آخرت کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا یکتا اور عجیب وغریب معجزہ ہے۔ اللہ کریم کے تمام نبیؑ برگزیدہ ہستیاں ہیں اور ہر نبیؑ سے اللہ کا تعلق اس درجے کا رہا کہ ہر نبیؑ پر اللہ کی طرف سے وحی آتی تھی لیکن وحی زمین پر آتی رہی۔ انبیاءؑ کو اللہ کریم سے شرفِ ہمکلامی نصیب ہوا، جیسے موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ تھے لیکن زمین پر ہی بات ہوتی رہی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم وہ واحد ہستی ہیں جو ان بلندیوں پر اپنے جسمِ عنصری سمیت تشریف لے گئے۔

ایک لطیف نکتہ:

بِعَبْدِہٖ میں دوسری بات یہ فرمادی کہ سب سے بلند ترین مقام، مقامِ بندگی ہے یعنی اللہ کریم کا بندہ ہونا اور اعلیٰ ترین مقامات حاصل ہونے کے باوجود کوئی اللہ کی ذات وصفات میں شریک نہیں۔ ان ساری بلندیوں کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے بندے ہیں، اس کی ذات وصفات میں شریک نہیں ہیں۔ وہ مخلوق ہیں اور اللہ خالق ہے۔ اللہ واحد ولاشریک ہے۔ وہ بے مثل وبے مثال ہے ذات میں بھی اور صفات میں بھی لہٰذا اس سفرِ معراج کی روئیداد سن کر عیسائیوں کی طرح، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے الوہیت کی نسبت نہ کی جائے۔

منازلِ سلوک:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے وجودِ اطہر کو وہ لطافت نصیب تھی جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ البتہ اگر کسی مسلمان کو برکاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نصیب ہوجائیں تو اس کی روح بالائے آسمان جاسکتی ہے اور اس سے آگے عرشِ عظیم تک بھی جاتی ہے اور نو عرش بھی طے کرتی ہے اور عالمِ امر میں بھی جاتی ہے۔ اسی سفر کو سیرِ سلوک یا تصوف کہتے ہیں اور انہی کو منازلِ سلوک کہتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے معجزات بطورِ کرامت آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اُمت کے اولیاء اللہ میں منتقل ہوتے ہیں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم جن منازل پر اپنے وجودِ اطہر سمیت تشریف لے گئے، اولیائے اُمت روحانی طور پر وہاں حاضری دے سکتے ہیں۔ یہ اللہ کریم کی مرضی کہ وہ اپنے بندوں کو کِن کِن روحانی بلندیوں سے نوازتا ہے اور کیسی کیسی منازل عطا فرماتا ہے۔ جس کو جہاں تک بھی رسائی نصیب ہوتی ہے وہ نسبتِ محمد رسول اللہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ہے۔ یہ ایک لمبا سلسلہ ہے کہ وہ برکات کس کے توسل سے پہنچیں، کسی شیخ سے تعلق نصیب ہو اور کتنی نصیب ہوں، یہ اللہ کی عطا ہے لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ عقیدہ درست ہو اور مجاہدہ بھی درست ہو تو بات بنتی ہے۔

طیُّ الأرض:

سفرِ معراج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تشریف لے جانے کا واقعہ ہے اور یہ بھی بطورِ کرامت اولیائے امت میں پایا جاتا ہے۔ اصطلاح میں اسے 'طیُّ الأرض' کہتے ہیں کہ زمین کو طے کرلینا، لپیٹ لینا۔ اولیائے امت میں بہت سی ایسی ہستیاں پائی گئی ہیں جنہوں نے ہزاروں میل کا فاصلہ ایک لمحے میں طے کرلیا۔ ایک لمحے میں یہاں تھے تو دوسرے لمحے کہیں اور پائے گئے۔ اسے طیُّ الأرض کہتے ہیں اور یہ اولیاء اللہ کی کرامات

میں سے ہے جو اُنہیں باتباعِ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نصیب ہوتی ہے۔

معراج میں مشاہدات:

فرمایا، صرف بیت المقدس تک لے جانا ہی مقصد نہیں تھا بلکہ یہ اس لیے تھا لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا۔۔۔کہ ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں۔ بیت المقدس سے بالائے آسمان تک اور وہاں سے عرشِ عظیم تک اور وہاں سے آگے برزخ کے احوال آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ملاحظہ فرمائے ان احوال کا بیان حدیث شریف میں موجود ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جنت کا ملاحظہ فرمایا، دوزخ کو دیکھا، آخرت کے حقائق کو دیکھا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ ستودہ صفات ہے کہ بنفسِ نفیس تشریف لے جا کر برزخ کا مشاہدہ فرمایا اور اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں حاضری دی۔ فرمایا: لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا۔۔۔ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے اور اللہ کریم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم پر برزخ اور آخرت کے حالات اور بالائے عرش کی باتیں وا کر دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے وجودِ عنصری کی نگاہ سے، اِسی جسمِ اطہر کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں اور اللہ کریم سے شرف ہمکلامی نصیب ہوا۔

شرفِ ہمکلامی:

جہاں تک کلامِ باری کا تعلق ہے تو اس میں کسی کو شبہ نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو اللہ سے شرفِ ہمکلامی نصیب ہوا۔ اور اُمت کے لیے دن بھر میں پچاس نمازیں ادا کرنے کا تحفہ عطا ہوا۔ یہ تحفہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سفرِ معراج کی خوشی میں اُمت کو عطا ہوا کہ اُمت دن میں پچاس مرتبہ اللہ کی بارگاہ میں حاضری سے نوازی جائے گی۔ یہ ایک طویل حدیثِ مبارکہ ہے کہ جس میں تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ نمازوں کی تعداد میں کمی کی بار بار درخواست کی گئی اور کم ہوتے ہوتے یہ پانچ رہ گئیں۔ لیکن اجر کے بارے ارشاد ہوا کہ یہ اُمت پانچ نمازیں ادا کرے گی لیکن ثواب پچاس نمازوں کا ہی پائے گی۔

صلوٰۃ کتنا عظیم انعام ہے:

یہ صلوٰۃ جسے آج ہم بوجھ سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کی اکثریت جسے بھولے ہوئے ہے، یہ وہ انعام ہے، وہ تحفہ ہے جو معراج پر تشریف لے جانے کی برکت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو اللہ کی طرف سے عطا ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اُمت روزانہ پانچ مرتبہ بارگاہِ الٰہی میں حاضری کی اجازت سے نوازی گئی جہاں وہ ربِّ کریم سے اپنی گزارشات پیش کر سکتی ہے اور اس کریم کی نوازشات وصول کر سکتی ہے۔ لیکن انسان چونکہ مادیت میں الجھ جاتا

ہے اس لیے اس نعمت کا احساس نہیں رکھتا حالانکہ اگر کوئی اعلیٰ افسر اسے دن میں پانچ مرتبہ ملاقات کی اجازت دے دے اور طلب کرلے تو یہ بھاگا بھاگا جائے گا۔لیکن چونکہ اسے اس بات کا احساس وادراک نہیں ہے کہ بارگاہِ الوہیت میں حاضری کا مقام ومرتبہ کیا ہے اس لیے صلوٰۃ اسے بوجھ لگنے لگتی ہے۔

دیدارِ باری:

معراج میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیدارِ باری نصیب ہوا، اس میں علماء کی دو رائے ہیں۔ایک طبقہء علماء اس بات کا قائل ہے کہ دنیوی زندگی میں اللہ کریم کی زیارت ممکن نہیں ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا تھا رَبِّ اَرِنِيۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَيۡكَ۔۔۔اے اللہ مجھے اپنا جمال دکھایئے میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ ارشاد ہوا لَنۡ تَرٰىنِيۡ۔۔۔(الاعراف 143) کہ آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ دنیا کی مادّی آنکھوں میں وہ طاقت نہیں ہے کہ جمالِ باری کو دیکھ سکیں البتہ آخرت میں، میدانِ حشر میں، حساب کتاب کے وقت بھی اللہ کے مقرب بندوں کو اللہ کا دیدار نصیب ہوگا۔ایک حدیث شریف میں یہ روایت ملتی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم کیا ہم اللہ کو سامنے دیکھیں گے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کا مفہوم ہے، فرمایا، جس طرح چاند کو دیکھتے ہو اسی طرح جنت میں ہر جنتی کو اپنی حیثیت اور درجے کے مطابق دیدارِ باری نصیب ہوگا تو علماء کا یہ طبقہ اس رائے کا قائل ہے کہ اس دنیا میں دیدارِ باری ناممکن ہے۔

دوسرا طبقہء علماء جو دیدارِ باری ہونے کا قائل ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اُس وقت اِس دارِ دنیا میں، اس زمین پر نہیں تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلّم بالائے آسمان اور قربِ الٰہی کی اُن منازل میں تشریف لے گئے جو عرشِ عظیم سے بھی بالاتر ہیں لہٰذا وہاں دنیا کے احکام لاگو نہیں ہوتے۔وہ عالمِ بالا ہے اور وہاں دیدارِ باری ہونا محال نہیں ہے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ معراج کے بارے بات کا آغاز سُبۡحٰنَ الَّذِيۡۤ سے کیا گیا کہ اللہ کریم پاک ہے جو چاہے کرسکتا ہے، اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔اس نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کو سفر کرایا یہ اس کی قدرت ہے، انہیں بالائے عرش لے گیا وہ قادر ہے اس نے آخرت کا مشاہدہ کرایا، یہ اس کی قدرت ہے، وہ جو چاہے کرسکتا ہے فرمایا، اور یہ بھی یاد رکھو! اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ ① کہ تمہاری ہر حرکت، ہر سکون، ہر نظریے، ہر عقیدے، ہر خیال ہر ارادے کو اللہ کریم دیکھ رہے ہیں اور ہر بات کو اللہ کریم سن رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا انفرادی شرف:

اللہ کریم نے انبیاءؑ کو بے شمار معجزات عطا فرمائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ ہمکلامی نصیب ہوا لیکن زمین پر ہی بات ہوتی رہی۔ انبیاءؑ کی ارواح کے سفر کی بات کوئی نہیں کر سکتا اس لیے کہ غیر نبیؑ، نبیؑ کی منزل کو جان ہی نہیں سکتا۔ حق یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے علاوہ اور کوئی ہستی ان بلندیوں پر تشریف نہیں لے گئی جن بلندیوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اپنے وجودِ اطہر سمیت تشریف فرما ہوئے، اور آخرت کے جتنے احوال بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ملاحظہ فرمائے وہ سب بالائے عرش ملاحظہ فرمائے اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی خصوصیت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے انبیائے کرام نے جو احوال دیکھے وہ سب زمین پر ہی دیکھے جیسے حضرت ابراہیمؑ نے عرض کیا: وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۔۔۔ اے اللہ، آپ مُردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ پوچھا گیا: قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ۔۔۔ کہا، یقین ہے، میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں یہ کیسے ہوگا۔ فرمایا: قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (البقرہ:260)

فرمایا، چار پرندے لیں انہیں اپنے ساتھ مانوس کرلیں۔ جب مانوس ہو جائیں تو انہیں ذبح کر کے گوشت اور ہڈیاں اکٹھی کچل کر چار پہاڑوں پر پھینک دیں اور پھر ایک ایک پرندے کو پکاریں تو وہ پھر سے زندہ ہو کر آپؑ کے پاس آجائیں گے۔ کوئی ذرّہ کہیں سے آ رہا ہوگا، کوئی کہیں سے اس طرح جسم بن رہے ہوں گے اور وہ زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے آپؑ کے پاس آجائیں گے۔ یہ مشاہدہ حضرت ابراہیمؑ کو کرایا گیا مگر اسی دارِ دنیا میں ہوا۔

حضرت عزیرؑ نے شہر کو برباد دیکھا تو سوال کیا: قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۔۔۔ (البقرہ:259)
نہ جانے اللہ کریم مُردوں کو زندہ کیسے کریں گے! یعنی زندہ تو کریں گے لیکن کیسے کریں گے؟ یہ سمجھ نہیں آتی۔ اللہ کریم نے اُن کو سو سال کے لیے سُلا دیا اور جب اٹھے تو فرمایا، اب دیکھیں آپؑ کا جو کھانا اور مشروب تھا وہ ویسے کا ویسا تازہ رکھا ہے۔ آپؑ کی سواری کا گدھا مر کر خاک ہو گیا ہے اب ملاحظہ فرمائیں یہ کیسے زندہ ہوتا ہے ایک، ایک ذرّہ جُڑ کر وجود بنتا گیا اور وہ پھر سے زندہ ہو گیا۔ لیکن یہ سارے مشاہدات و واقعات زمین پر ہی وقوع پذیر ہوئے۔ یہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ عالی ہے کہ بنفسِ نفیس تشریف لے گئے اور بالائے آسمان برزخ، جنت و دوزخ کا مشاہدہ فرمایا اور بارگاہِ الٰہی میں حاضری سے مشرف ہوئے۔

کتاب اللہ وصول کرنا صرف انبیاءؑ کا منصب ہے:

یہ عظمت انبیاءؑ کو عطا ہوتی ہے کہ انہیں براہِ راست اللہ کریم سے احکام عطا ہوتے ہیں۔ یہ صرف انبیاءؑ کا منصب ومقام ہے کہ وہ وحی ءالٰہی سنتے بھی ہیں، سمجھتے بھی ہیں اور دوسروں کو بتاتے بھی ہیں۔ غیر نبیؑ وحی سن سکتا ہے نہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ فرمایا: وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ۔۔۔۔۔ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت اور راہنمائی کا سبب بنا دیا۔ یاد رہے! ہر کتاب اپنے دور میں تمام امور کے لیے بہترین راہنمائی کرتی رہی۔ قرآن کریم سب سے آخر میں نازل ہوا اور نزول سے لے کر قیامِ قیامت تک سارا زمانہ، سارا دور قرآنِ کریم کا ہے۔ اب کوئی نئی کتاب نہیں آئے گی اس لیے زندگی کے ہر شعبے میں، ہر کام، قرآنِ کریم کے مطابق کیا جائے گا۔ اور یہ قرآنِ کریم کا اعجاز ہے کہ یہ ہر عمل میں، ہر انسان کے لیے، ہر زمانے میں راہنمائی فرماتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا ہوئی جو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت و راہنمائی کا سبب تھی جس کی بنیاد توحیدِ الٰہی تھی۔ فرمایا: اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝ کہ میرے سوا کسی دوسرے کو اپنا کارساز نہ سمجھو۔ گویا ساری کتاب کا خلاصہ اور ہدایت پانے کی بنیادی شرط ارشاد فرما دی کہ ہدایت پر صرف وہ شخص رہے گا جو اپنی امیدوں کا مرکز صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کو بنائے گا۔ ایسا شخص ہی پھر اللہ کی کتاب کو بھی سمجھ پائے گا۔

انسانی نفسیات پر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ بندہ اس کی بات سنتا ہے جس سے اسے نفع کی اُمید ہو یا جس کے ناراض ہونے سے نقصان کا خوف ہو اگر انسان نفع ونقصان کی امیدیں غیر اللہ سے وابستہ کرے تو پھر اطاعت بھی غیر اللہ کی ہی کرے گا، اللہ کی نہیں کرے گا لہٰذا فرمایا، کتاب کا بنیادی فلسفہ یہ ہے: اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝ میرے علاوہ کسی کو کارساز مت سمجھو۔

اللہ کی اطاعت ہی اللہ کا شکر ادا کرنا ہے:

فرمایا: ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝ یہ ان لوگوں کی اولاد ہیں جنہیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ طوفان سے محفوظ رکھا۔ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ نسلِ انسانی جو طوفانِ نوحؑ کے بعد آگے چلی وہ سب حضرت نوحؑ کے بیٹوں کی اولاد سے چلی لہٰذا سارے لوگ نوحؑ کی اولاد ہیں اُن کے بیٹوں کی وساطت سے۔ کشتی میں کم وبیش اسی (80) مرد وزن سوار تھے جنہیں طوفان سے بچا لیا گیا تھا تو آگے جو اولاد بھی چلی وہ نوحؑ کے بیٹوں اور بہوؤں سے چلی۔ فرمایا، ان لوگوں کو یعنی بنی اسرائیل کو سوچنا چاہیے کہ تاریخ انہوں نے سن رکھی ہے اور زیادہ پرانی بات بھی نہیں ہے کہ یہ ان لوگوں کی اولاد ہیں جن کو ہم نے عمومی عذاب سے بچایا جس سے ساری دنیا غرق

ہوگئی تھی اور کفار کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا تھا۔

اس میں بھی بہت سی آراء ہیں کہ کیا طوفان نوحؑ روئے زمین پر آیا تھا یا کچھ علاقے میں آیا تھا لیکن اس بات میں کوئی ابہام نہیں ہے کہ جہاں تک انسانی آبادیاں تھیں وہ ساری غرق ہوگئیں۔ اُس وقت انسانی آبادیاں کہاں کہاں تک تھیں یہ تو اللہ کریم ہی جانتے ہیں کیونکہ انسانی آبادی اتنی نہیں تھی کہ پورے کرۂ ارض پر پھیل جائے لیکن جہاں تک انسانی آبادیاں تھیں وہاں کوئی انسان بچ نہیں پایا تھا سوائے ان کے جو کشتی میں سوار ہوگئے تھے تو بنی اسرائیل کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ کس طرح ان کے آباء کو کشتی میں سوار کرا کے بچا لیا جن کی یہ اولاد ہیں۔ نوحؑ تو اللہ کے بہت ہی شکر گزار بندے تھے۔ یہاں بھی لفظ 'عبد' استعمال ہوا ہے انبیاءؑ اور اولوالعزم رُسل کے لیے بھی سب سے اعلیٰ لفظ جو استعمال ہوا ہے وہ 'عبد' ہے۔ حق ہے کہ اللہ، اللہ ہے اور بندے، بندے ہیں۔

مخلوق تو ساری ہی اللہ کی ہے لیکن جسے اللہ کریم اپنا بندہ فرماتے ہیں اس کا مقام ومنصب کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ بندے تو سارے ہی اللہ کے ہیں، اسی نے سب کو پیدا فرمایا ہے لیکن جسے وہ اپنا بندہ کہے وہ بات الگ ہو جاتی ہے۔

عبد دیگر، عبدہٗ چیزے دگر

اللہ کا بندہ ہونا ایک اور بات ہے۔ اللہ کا جتنا قرب کسی نبیؑ کو، کسی صحابیؓ یا کسی ولی کو نصیب ہوتا ہے، سب سے اعلیٰ مقام بندگی کا ہی ہے۔ کوئی نبیؑ اللہ کی ذات یا صفات میں شریک نہیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ اگر کوئی اللہ کا بہت مقرب خاص بھی ہے تو بھی اس کا بندہ ہے۔

نافرمانی کی سزا، بدامنی اور غلامی:

اللہ کریم نے بنی اسرائیل کو کتاب عطا فرما کر بندگی اختیار کرنے کی ہدایت کر دی تھی کہ وہ اللہ کے سوا کسی کو کارساز نہ سمجھیں لیکن وہ کیا عمل کریں گے یہ اللہ کریم جانتے ہیں کہ صرف وہی عالم الغیب ہیں۔ فرماتے ہیں: وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ④ اے بنی اسرائیل! تم دو بار ایسی سرکشی کرو گے کہ حد سے گزر جاؤ گے۔ تم دو مرتبہ زمین میں بہت بڑی سرکشی کرو گے، بہت بڑی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ بہت بڑے مظالم ڈھاؤ گے: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ⑤ جب پہلی بار تم حد

سے بڑھے کہ تم نے انبیاءؑ کی نافرمانی اختیار کی، اُن کا اتباع چھوڑ دیا، اللہ کی اطاعت ترک کر دی، لوٹ مار شروع کر دی، عیاش اور بدکار ہو گئے، نشہ، جواء اور ڈاکہ ڈالنا تمہارا مشغلہ بن گیا اور تم نے روئے زمین کو فساد سے بھر دیا تو پھر بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ ۔۔۔ ہم نے تم پر اپنے وہ بندے مسلط کر دیے جو بہت جنگجو تھے۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ جب بنی اسرائیل برائی میں حد سے تجاوز کر گئے تو ایک ظالم بادشاہ بخت نصر نے ان پر حملہ کر دیا۔ بخت نصر کی فوج فنِ حرب میں بہت ماہر تھی چنانچہ اُس نے انہیں تباہ کر دیا، قتلِ عام کیا اور جو بچ گئے انہیں قیدی بنا کر لے گیا۔ بیت المقدس کو لوٹا، وہاں رکھی ہوئی یہودیوں کی جمع شدہ دولت کو لوٹ کر بیل گاڑیوں میں لاد کر لے گیا تو یہاں اس کا ذکر ہو رہا ہے کہ اللہ نے اپنی مخلوق میں سے نہایت جنگجو لوگوں کو ان پر سزا کے طور پر مسلط کر دیا۔ وہ اُن کے گھروں میں گھس گئے اور انہیں تباہ و برباد کر دیا اور جو زندہ بچ گئے انہیں قیدی بنا کر ساتھ لے گئے اور یوں وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝٥ وہ وعدہ پورا ہوا جو اللہ نے کیا تھا۔

یہاں ایک قابلِ غور بات ہے کہ جہاں انبیاءؑ کا ذکر آیا ہے وہاں اللہ کریم نے فرمایا عَبْدًا میرا بندہ اور یہاں فرمایا عِبَادًا لَّنَآ میرے مملوک بندے، میری مخلوق۔ اگرچہ وہ کافر تھے لیکن کافر بھی اللہ ہی کی مخلوق ہے۔

اور یوں اللہ کا وعدہ جو دنیا سے متعلق تھا وہ تو انبیاءؑ کی آنکھوں کے سامنے پورا ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ اللہ کی کتاب میں جو کچھ ہے وہ حق ہے اور ویسا ہی ہوتا ہے لہٰذا بنی اسرائیل بخت نصر کی غلامی میں ستر سال ذلیل و رسوا ہوئے، کئی نسلیں اسی غلامی میں گزر گئیں حتیٰ کہ ایران کے حکمران نے بخت نصر کے ملک پر چڑھائی کی اور اُسے شکست دی۔ اس بادشاہ نے رحم کھاتے ہوئے بنی اسرائیل کو آزاد کر دیا اور وہ پھر سے بیت المقدس آئے اور اپنے ملک فلسطین میں آباد ہوئے۔

توبہ، مصائب سے نجات کا ذریعہ:

فرمایا، جب تم نے توبہ کی، معافی مانگی اور گڑگڑائے تو ہم نے تمہاری نجات کے ذرائع بنا دیئے فرمایا: ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ۝٦ تمہیں ان پر غلبہ عطا کیا، مال و دولت عطا کیا اور اولاد کی کثرت عطا فرما کر تمہیں تعداد میں بہت زیادہ بنا دیا۔

اللہ کریم کی نعمتیں:

اللہ کریم اپنی نعمتوں میں سے بنیادی نعمتیں چن کر گنوا رہے ہیں کہ ہم نے مال سے تمہاری مدد کی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مال کا ہونا بری بات نہیں ہے بلکہ جائز وسائل سے حلال مال کا ہونا زندگی کی آسانی کا سبب ہے اور اللہ کی

نعمت ہے لہٰذا اگر اللہ کسی کو حلال جائز ذرائع سے مال عطا فرمائیں تو یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

دوسری نعمت ہے اولاد کہ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یہ میرا انعام ہے۔ جتنے بندے ہوں گے اتنا رزق بھی ہوگا کہ اللہ کی مخلوق ہے اور اللہ رازق ہے لہٰذا جتنے بندے ہوں گے اتنا رزق بھی عطا ہوگا۔ ایسے کتنے ہی غریب خاندانوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ میاں بیوی دو افراد تھے، روکھی سوکھی پر گزارہ تھا پھر ان کے دس دس بیٹے ہو گئے تو وہ اپنے علاقے کے متمول اور بااثر لوگ بن گئے، مال و وسائل بھی آ گئے اور طاقت بھی آ گئی۔ اولاد کا ہونا بھی اللہ کی نعمت و انعام ہے۔ لیکن افسوس، آج ہم اس بحث میں اُلجھ گئے ہیں اور سرکاری سطح پر بھی اس کا پرچار کیا جا رہا ہے کہ اولاد کم سے کم ہو اور اولاد کی کمی کو خوشحالی کی ضمانت بتایا جا رہا ہے۔ اس بات پر بہت تشویش کا اظہار کیا جاتا ہے کہ آبادی اتنی بڑھ گئی ہے حالانکہ ان آیات میں آبادی کی زیادتی کو اللہ کریم اپنی نعمت شمار کر رہے ہیں۔ اللہ کی نعمتوں کا انکار کر کے ہم قومی اعتبار سے قلاش ہو چکے ہیں۔ یہ اللہ کا عذاب ہے کہ ہر دروازے پر کاسۂ گدائی لیے پھرتے ہیں۔ یہ ہماری نافرمانیوں اور گستاخیوں کی سزا ہے۔

آج بھی توبہ ہی علاج ہے:

آج بھی ہمارا علاج توبہ ہی ہے۔ اگر ہم خلوصِ دل سے توبہ کریں اور ساری قوم یکسو ہو کر اللہ کو پکارے، اللہ کی عبادت کرے اور جائز و حلال وسائل پر اکتفا کرے تو اللہ کریم مالدار بنا دیں گے اور قوم کو کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

فرمایا: اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ ۔۔۔ اگر تم نیکی کرو گے تو اپنی بھلائی کے لیے کرو گے، اس نیکی کا اجر تمہیں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس بات سے بے نیاز ہے کہ مخلوق اس کو مانے یا انکار کر دے کہ اگر ساری مخلوق اس کو مان لے تو اس کی شان بڑھتی نہیں ہے اور ساری مخلوق انکار کر دے تو اس کی شان میں کمی نہیں ہوتی۔ وہ مخلوق کے ماننے نہ ماننے سے بے نیاز ہے۔ مخلوق نے اگر بھلائی کرنی ہے، اللہ کی اطاعت کرنی ہے، اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اتباع کرنا ہے، اللہ کی کتاب پر عمل کرنا ہے تو اس کا فائدہ خود اسے ہوگا۔ اس پہ اللہ کے انعامات ہوں گے، اسے دنیا میں عزت و وقار حاصل ہوگا، بندوں کی محتاجی نہیں رہے گی اور آخرت بھی سنور جائے گی۔ اور اگر نافرمانی کا راستہ اپنایا تو وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا ۔۔۔ اس کا وبال بھی اسی پر آئے گا، اس کی سزا بھی اسے ہی ملے گی۔

بنی اسرائیل کے پاس جب دولت آ گئی، اولاد بھی آ گئی، طاقت آ گئی، حکومتیں، بن گئیں تو یہ نافرمانی پہ اتر آئے اور ظلم وستم شروع کر دیا۔ انہوں نے پھر وہی عیاشی، بدکاری، لوٹ مار، برائی شروع کر دی۔

ظالموں کا مسلط ہونا بھی سزا ہے:

فرمایا: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا﴿۷﴾ پھر ہم نے تم پر وہ لوگ مسلط کر دیے جنہوں نے مار مار کر تمہارے چہرے بگاڑ دیے اور جس طرح پہلے بخت نصر نے مسجد میں داخل ہو کر لوٹا تھا، اسی طرح ان پر قیصر حملہ آور ہو گیا اور اس نے مار مار کر ان کا حلیہ بگاڑ دیا۔ بے شمار لوگوں کا قتل عام کیا، بخت نصر کی طرح ان کے گھروں کو، بیت المقدس کو اور ان کی عبادت گاہوں کو لوٹا اور جس جس چیز پر اس کا بس چلا اس نے تباہ کر دی۔ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، گھر جلا دیے، معابد تباہ کر دیے۔ فرمایا: لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ۔۔۔ مار مار کر تمہارے چہرے بگاڑ دیے۔

توبہ کا دروازہ کھلا ہے:

اس سب کے باوجود اگر اب بھی تم توبہ کر لو تو اللہ تم پر رحم کرے گا۔ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ۔۔۔ برائی میں حد سے گزرنے کے باوجود، عذابِ الٰہی مسلط ہونے کے باوجود اگر اب بھی توبہ کر لو تو اللہ تم پر رحم فرمائے گا۔ برائی کی کوئی حد ایسی نہیں ہے جس پر توبہ سے منع کر دیا گیا ہو۔ جتنے بھی گناہ ہو گئے ہوں پھر بھی اس کا علاج توبہ ہی ہے۔ اگر توبہ کرنے کے بعد پھر گناہ ہو جائے، توبہ ٹوٹ جائے پھر بھی اس کا علاج توبہ ہی ہے اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ توبہ ہی وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ کریم رحم فرماتے ہیں۔

فرمایا: وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا۔۔۔ اور پھر اگر تم پلٹ کر برائی کرو گے، توبہ کرنے کے بعد پھر برائی کرو گے تو ہم بھی تمہیں سزا دیں گے۔ جو تم کرو گے، وہی پاؤ گے کیونکہ نتائج ہمیشہ کردار پر مرتب ہوتے ہیں۔ اگر توبہ کرو گے، نیکی اختیار کرو گے تو اللہ تم پر رحم فرمائے گا۔ لیکن اگر پھر برائی کرو گے تو اللہ کی سزا تم پر آ جائے گی۔ اور دنیا کی زندگی تو سزائیں، مشکلات میں بھی گزر ہی جاتی ہے لیکن آخرت تو ابدی ہے اور اصل بات یہ ہے وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا﴿۸﴾ کہ آخرت میں ہم نے دوزخ کو کافروں کا قید خانہ بنا دیا ہے۔ دنیا تو مصیبت میں بھی گزر جاتی ہے۔ بہت زیادہ تکلیف ہو تو موت پر زندگی ختم ہو جاتی ہے لیکن جہنم میں موت کا کوئی تصور نہیں ہوگا اور موت بھی نہیں آئے گی، جبکہ عذاب مسلسل ہوتے رہیں گے۔ برائی اور کفر تو جہنم

کی طرف سفر ہے اس سے بچنا چاہیے۔

قرآن زندگی کی کتاب ہے:

فرمایا: اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ۔۔۔یقیناً یہ قرآن ایسی کتاب ہے جو زندگی کے سارے کام کرنے کا صحیح ترین طریقہ بتاتی ہے۔ ذاتی امور ہوں، خاندانی معاملات ہوں، قومی معاملات ہوں یا بین الاقوامی امور ہوں، قرآن ہر شعبۂ زندگی میں بہترین راہنمائی کرتا ہے۔ قرآن ایک فرد سے لے کر پوری انسانیت کے حقوق کا محافظ ہے۔ اور زندگی کے تمام امور میں ایسی راہنمائی فرماتا ہے جو آخری اور حتمی ہے، اور اس میں کسی غلطی کا امکان نہیں ہے۔

آج کے نام نہاد دانشوروں کا فلسفہ:

آج ہمارے معاشرے میں بہت سے نام نہاد دانشور پیدا ہو گئے ہیں جو اعلیٰ مناصب پر فائز ہوتے ہیں لیکن اُن کا تعلق قرآن سے اتنا سا ہے کہ سورۂ اخلاص تک زبانی یاد نہیں۔ حالانکہ سورۂ اخلاص وہ سورت ہے جو ہر عام، ان پڑھ مسلمان جسے اور کوئی سورت نہ آتی ہو، وہ بھی نماز کی ہر رکعت میں ضرور پڑھتا ہے۔ اب اس پائے کے دانشور بحث کرتے ہیں کہ دین کو سیاست سے الگ رکھیں۔ یعنی ایک فرد کی ذات کے لیے تو دین ہے اور جب کروڑوں ذوات کا معاملہ ہو تو دین کو الگ کر دو، انہیں بھیڑوں کی طرح ہانکو۔ یہ کیا منطق ہے، یہ کون سا فلسفہ ہے، یہ کہاں کی دانشمندی ہے؟ قرآن افراد سے لے کر ملت کے حقوق کا محافظ ہے بلکہ پوری انسانیت کے حقوق کا محافظ ہے۔ جو لوگ قرآن کو نہیں مانتے، کافر ہیں، اُن کے حقوق کو بھی تحفظ دیتا ہے لہٰذا قرآن سے الگ ہو کر سیاست محض چنگیزی ہو گی، ظلم ہو گا، تباہی ہو گی۔

مومنین کے لیے خوشخبری:

فرمایا: وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔۔۔یہ قرآن اپنے ماننے والوں کو آج بشارت دیتا ہے۔ مخلوق کے انجام کا فیصلہ تو میدانِ حشر میں ہو گا، لیکن جو لوگ قرآن سے وابستہ ہو جاتے ہیں اُن کو یہ دنیا میں خوشخبری سناتا ہے۔ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ۔۔۔اُن لوگوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں یعنی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتے ہیں انہیں نیک انجام کی خوشخبری دیتا ہے۔

عملِ صالح یا نیک عمل کا معیار بندوں کی رائے پر نہیں ہے بلکہ نیکی یہ ہے کہ ہر کام اس طریقہ سے

کیا جائے جس طریقے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں سونا جاگنا، کھانا پینا، کمانا اور خرچ کرنا ہر عمل ہی عبادت بن جاتا ہے۔ قرآن ایسا عمل کرنے والوں کو اس دنیا میں جنت کی خوشخبری دیتا ہے، قربِ الٰہی کی اور انعاماتِ الٰہی کی خوشخبری سناتا ہے اور انہیں بتاتا ہے اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝ کہ اللہ کی بارگاہ میں تمہارے لیے بہت بڑے انعامات ہیں جن کو تم دنیا میں سمجھ نہیں سکتے، جان بھی نہیں سکتے۔

کافروں کے لیے عذاب کی وعید:

فرمایا: وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ قرآن بہت واضح انداز میں یہ بتاتا ہے کہ جن لوگوں کو آخرت پر یقین نہیں ہے، جو آخرت کو نہیں مان رہے اور محض دنیا کی ہوس میں دیوانے ہو رہے ہیں۔ جائز، ناجائز ہر طریقے سے دولت و اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں اُن کے لیے بہت دردناک عذاب ہیں۔ جس طرح قرآن ایمان لانے والوں کو خوشخبری دے رہا ہے، اسی طرح نہ ماننے والوں کو عذابِ الٰہی کی خبر بھی دے رہا ہے کہ انکار کر کے تم گھاٹے کا سودا کر رہے ہو۔ تم بہت خسارے میں رہو گے۔ دنیوی زندگی تو عارضی ہے، اس میں جو دولت جمع کرو گے، ایک دن چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ عہدے و اقتدار یہیں رہ جائیں گے، تم عدم کو سدھار جاؤ گے جبکہ آخرت کی زندگی دائمی ہے، کبھی نہ ختم ہونے والی ہے اور اس میں نافرمانوں کے لیے بڑے دردناک عذاب ہوں گے۔ قرآنِ کریم زندگی کے تمام امور انجام دینے کا بہترین طریقہ اور سلیقہ بتاتا ہے اور جو اس کو مانتا ہے اس کو جنت کی بشارت دیتا ہے، جبکہ انکار کرنے والوں کو دوزخ کی وعید بھی سنا دیتا ہے۔

سورۃ بنی اسرآءیل رکوع 2 آیات 11 تا 22

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَاۤ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿۱۲﴾ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ وَاِذَاۤ اَرَدْنَاۤ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾

اور (بعض دفعہ) انسان برائی کی اسی طرح درخواست کرتا ہے جس طرح بھلائی کی درخواست کرتا ہے اور انسان (طبعی طور پر ہی) جلد باز ہے ﴿۱۱﴾ اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا پس رات کی نشانی کو ہم نے دھندلا بنایا اور دن کی نشانی کو ہم نے روشن بنایا تاکہ تم اپنے پروردگار کا فضل (روزی) تلاش کرو اور تاکہ برسوں کا شمار اور حساب معلوم کر لو اور ہم نے ہر چیز کو خوب تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے ﴿۱۲﴾ اور ہم نے ہر انسان کا عمل اس کے گلے کا ہار بنا کے رکھا ہے اور ہم اسے قیامت کے دن کتاب (اس کا اعمالنامہ) نکال کر دکھا دیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا ﴿۱۳﴾ اپنی کتاب پڑھ لے آج کے دن تُو خود ہی اپنے لیے حساب لینے والا کافی ہے ﴿۱۴﴾ جو شخص ہدایت اختیار کرتا ہے تو یقیناً اپنے ہی لیے کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو یقیناً گمراہی کا نقصان بھی اسی کو ہوگا اور کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج دیں عذاب نہیں دیا کرتے ﴿۱۵﴾ اور جب ہم کسی بستی کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے آسودہ لوگوں کو حکم دیتے ہیں (انکے اعمال بد کی وجہ سے) تو وہ وہاں نافرمانیاں کرتے ہیں تو اس پر (عذاب کا) حکم ثابت (اتمام حجت) ہو جاتا ہے پھر ہم اس کو تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں ﴿۱۶﴾ اور ہم نے بہت سی امتوں کو نوح (علیہ السلام) کے بعد ہلاک کیا اور آپ کا پروردگار (اللہ) اپنے بندوں کے گناہوں کو جاننے (اور) دیکھنے والا کافی ہے ﴿۱۷﴾ جو شخص دنیا (کے مال و زر) کا خواہش مند ہو تو ہم اسے یہیں جتنا چاہتے ہیں جسے چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں پھر ہم نے اس کے لیے جہنم بنائی ہے وہ اس میں برے حال میں راندہ (درگاہ) ہو کر داخل ہوگا ﴿۱۸﴾ اور جو شخص آخرت کا طلبگار ہوگا اور اس کے لیے اتنی کوشش کرے گا جتنی وہ کر سکے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو، سو ایسے لوگوں کی کوشش مقبول ہوگی ﴿۱۹﴾ ہم آپ کے پروردگار کی بخشش سے سب کو مدد دیتے ہیں ان کو بھی اور ان کو بھی اور آپ کے پروردگار کی بخشش (دارِ دنیا میں کسی پر) بند نہیں ﴿۲۰﴾ دیکھ لیجیے! ہم نے کس طرح بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔ اور

آخرت درجوں کے حساب سے بہت بڑی ہے ﴿۲۱﴾ اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے۔ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود (ہرگز) نہ بنانا پھر بدحال (اور) بے کس ہوکر بیٹھ رہے گا ﴿۲۲﴾

تفسیر و معارف

انسان فطرتاً جلد باز ہے:

فرمایا: وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾ انسان کا مزاج بھی عجیب ہے، یہ جب اپنے لیے خیر کا طالب ہوتا ہے، اپنی بھلائی چاہتا ہے تو بڑے شدّومد سے اپنی بہتری کے لیے دعائیں مانگتا ہے۔ اور جب کبھی بھڑک اٹھتا ہے تو اتنی ہی شدت سے اپنی بربادی کے لیے دعائیں کرنے لگ جاتا ہے۔ اپنے نقصان کے لیے دعائیں کرنے لگتا ہے۔ اپنے آپ کو بددعائیں دیتا ہے، اپنی اولاد کو بددعائیں دیتا ہے یا اپنے مال مویشیوں کو بددعائیں دیتا ہے۔ ذرا سا کسی سے خفا ہوتا ہے تو بددعائیں دیتا ہے اور جب واقعی ویسا ہو جائے تو کفِ افسوس ملتا ہے اور دکھی ہو جاتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ انسان طبعی طور پر جلد باز ہے۔

فرمایا، جلد بازی میں فیصلے نہیں کرنے چاہیں بلکہ ہر کام کرنے سے پہلے اُسے پرکھنا چاہیے۔ سب سے پہلے اس کام کی شرعی حیثیت کو دیکھا جائے کہ وہ جائز اور حلال ہو۔ حلال و حرام کی تمیز کے بعد اس میں ذاتی نفع و نقصان کو ملحوظ رکھا جائے کہ اس کام میں فرد کا اپنا نفع و نقصان کیا ہے، اس کے بعد اللہ کی بارگاہ میں دعا کی جائے۔ یاد رہے دعا بارگاہِ الٰہی میں اپنی گزارش پیش کرنے کا نام ہے اس لیے جب بھی کوئی اللہ کی بارگاہ میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس کو بقائم ہوش و حواس بات کرنی چاہیے کہ وہ ایسی عظیم بارگاہ ہے وہاں کوتاہی اور سستی کی گنجائش نہیں ہے۔ دعا میں کوئی بات منہ سے ایسی نہ نکالے کہ بعد میں اسے پچھتانا پڑے۔ لیکن وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾ انسان جلد باز ہے۔ حقائق کو بھول جاتا ہے۔ آداب اور قواعد کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے اور جوشِ جذبات میں جو منہ میں آئے کہہ دیتا ہے۔ یہ تو اللہ کی شانِ کریمی ہے کہ وہ معاف فرماتے رہتے ہیں، درگزر فرماتے رہتے ہیں اور انسان کو اس کی بے پناہ خطاؤں اور گناہوں کے وبال سے بچاتے رہتے ہیں ورنہ انسان تو جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا بھلا برا بھی نہیں سوچتا۔

اللہ کی عظمت کی نشانی:

فرمایا: وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ ۔۔۔کیا انسان دیکھتا نہیں کہ اس کی جو زندگی بسر ہو رہی ہے اس میں شب و روز کس نے بنائے ہیں، اور یہ عظمتِ الٰہی کی کتنی بڑی نشانیاں ہیں! اگر رات نہ ہوتی، صرف دن ہی ہوتا تو انسانی زندگی کی کوئی ترتیب نہ رہتی، اس کی کوئی صورت نہ بنتی۔ کوئی سو رہا ہوتا، کوئی جاگ رہا ہوتا، کوئی کام میں مشغول ہوتا اور کوئی فارغ بیٹھا ہوتا۔ اُس کریم نے رات بنادی۔ جہاں رات آتی ہے وہاں سکون و آرام کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ لوگ کام کاج سے چھٹی کر لیتے ہیں۔ دن بھر کام کاج میں جتنی طاقت، جتنی قوت خرچ کرتے ہیں، اعضاء و جوارح جتنا کام کرتے ہیں، رات کی نیند اور آرام سے وہ ساری طاقت بحال ہو جاتی ہے۔ صبح سب تازہ دم ہوتے ہیں۔ فرمایا: فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۔۔۔اللہ نے رات کو تاریک کر دیا تا کہ لوگ آرام کریں۔ اور دن کو روشن کر دیا تا کہ کام کریں۔ صبح طلوع ہوتی ہے تو روشنیاں لے آتی ہے اور سب نئے سرے سے تازہ دم ہو کر بیدار ہوتے ہیں، اپنے اپنے کام کاج میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ سب اپنے ربّ کی طرف سے عطا کردہ رزق کی تلاش میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ فرمایا: وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۔۔۔اللہ کریم کے بنائے ہوئے اس شب و روز کے نظام میں ہی دنوں، مہینوں اور سالوں کا شمار بھی ہوتا ہے۔ اگر مسلسل دن ہی رہتا یا مسلسل رات رہتی تو دن اور مہینے کس طرح شمار ہوتے؟ انسانوں کے بہت سے حساب شب و روز کے فرق پر قائم ہیں۔

قمری و شمسی مہینے:

دنوں، مہینوں اور سالوں کا حساب دو طرح سے ہے، ایک قمری اور دوسرا شمسی۔ قمری مہینوں کا تعلق چاند کے طلوع و غروب سے ہے، جبکہ شمسی مہینوں کا تعلق سورج کے حساب سے ہے۔ قمری مہینے ہر موسم میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ کبھی بہار میں، کبھی خزاں، کبھی گرمیوں اور کبھی سردیوں میں آتے ہیں۔ اس حساب سے سارے مہینے سارے موسموں میں آتے ہیں جبکہ سورج کے حساب سے جو مہینے گرمیوں میں آتے ہیں وہ ہر سال گرمیوں میں ہی آتے ہیں۔ اور جو مہینے سردیوں میں آتے ہیں وہ ہر سال سردیوں میں ہی آتے ہیں۔ اللہ کریم نے عبادات کو قمری مہینوں سے وابستہ کر دیا ہے مثلاً حج، رمضان، عیدین اور اس میں اللہ کریم کی بہت سی مصلحتیں ہوں گی لیکن ایک بھلائی جو ہر عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ رمضان شریف قمری مہینوں سے وابستہ ہے لہٰذا وہ سارے سال میں گردش کرتا ہے۔ رمضان، بہار میں بھی آتا ہے، موسم گرما میں، خزاں میں اور موسم سرما میں بھی آتا ہے اور یوں روزہ دار ہر موسم میں،

سال کے ہر مہینے میں رمضان شریف کی برکات کا مزہ چکھتا ہے۔ اگر اسے شمسی حساب سے کسی ایک مہینے کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا مثلاً مئی یا جون سے، تو ہر سال رمضان شریف صرف ایک ہی موسم میں آتا تو یہ اللہ کریم کا احسان ہے۔ اسی طرح حج کے بابرکت ایام بھی سارا سال گردش کرتے ہیں۔ ہر موسم میں حج کرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے تو عبادات کو قمری مہینوں سے وابستہ کرنے کی یہ بہت بڑی مصلحت سمجھ میں آتی ہے۔

البتہ باقی تمام دنیوی امور، لین دین، حساب کتاب، کاروبار شمسی مہینوں کے حساب سے کرنا درست ہے جبکہ عبادات میں جہاں اللہ کریم نے حکم دے دیا ہے وہاں صرف قمری مہینوں کا اعتبار ہوگا۔

فرمایا: وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿۱۲﴾ صرف رات، دن، ماہ و سال ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں، ہر موضوع پر اللہ کریم نے بڑی مفصل بات ارشاد فرما دی ہے۔ قرآن کریم نے زندگی کے ہر موضوع پر مکمل ہدایات دی ہیں اور کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا احاطہ قرآن کریم نے نہ کیا ہو۔ بلاشبہ قرآن کریم انسانوں کے لیے ایک مفصل ہدایت نامہ ہے۔

انسان کا کردار، اس کے گلے کا ہار:

انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ جو لفظ اس کے لبوں سے ادا ہوتا ہے، جو کام وہ کرتا ہے اُسے فرشتے لکھ لیتے ہیں وہ تحریر فرشتوں کے پاس ہوتی ہے جسے وہ لوحِ محفوظ میں جمع کراتے ہیں لیکن اسی تحریر کی ایک نقل یا Copy اس شخص کے گلے میں بھی ڈال دی جاتی ہے۔ فرمایا: وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ۔۔۔ ہر شخص کا کردار اس کے گلے میں ڈالا ہوا ہے جس کے اثرات اس پر ہوتے ہیں، اور ہر کردار کی محسوسات (FEELINGS) ہوتی ہیں جو غور کرنے پر محسوس کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً کسی مجلس میں کوئی بندہ آجائے تو بشاشت ہوتی ہے، اور کبھی کسی بندے کے آنے پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کسی کے آنے پر بیزاری محسوس ہوتی ہے کسی کے آنے پر خوشی ہوتی ہے۔ اور یہ صرف تعلقات کی وجہ سے محسوس نہیں ہوتا بلکہ ہر بندے کا کردار بھی اس کے گلے کا ہار ہے، جو وہ ساتھ لیے پھرتا ہے، یہ اس کا اثر ہے۔

انسان کے فیصلے:

انسان، زندگی کے ہر لمحے میں فیصلے کرتا رہتا ہے مثلاً کس بندے سے کیسا برتاؤ کرنا ہے، اس بندے کو دعا دینی ہے، اس بندے سے سخت کلامی کرنی ہے، اس سے نرمی سے بات کرنی ہے، یہ سب کیا ہے؟ یہ سب انسان کے فیصلے ہیں۔ اسی طرح لین دین کے معاملات میں انسان فیصلہ کرتا ہے کہ اُسے محنت کر کے حلال رزق کمانا ہے یا چوری کرنی ہے، رشوت لینی ہے، جواء کھیلنا ہے؟ یہ سب انسانی فیصلے ہیں۔ ہر آن ہم کوئی نہ کوئی فیصلہ کرتے ہیں اس کے

مطابق ہم عمل کرتے ہیں۔ فرمایا: وَنُخۡرِجُ لَهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلۡقٰهُ مَنۡشُوۡرًا ﴿۱۳﴾ انسان کے فیصلے اس کے اعمال نامے میں لکھے جاتے رہے اور اس کے گلے میں لٹکا دیے گئے، قیامت کے دن اس کا اعمال نامہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا جائے گا، اور حکم ہوگا: اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ ۔۔۔ اپنے اعمال کا دفتر پڑھ لو، اپنے اعمال کی کتاب پڑھ لو: كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا ﴿۱۴﴾ آج تم خود اپنے لیے بہترین منصف ہو، جج ہو۔ تم نے زندگی بھر جو فیصلے کیے اگر وہ اطاعت الٰہی اور نیکی کے زمرے میں آتے ہیں تو آج ان کے طفیل انعام پاؤ گے اور اگر وہ اللہ کی نافرمانی کے زمرے میں آتے ہیں، برائی کے زمرے میں آتے ہیں تو اسی کی وجہ سے سزا پاؤ گے یعنی یہ انعام یا سزا تمہارے اپنے کیے ہوئے فیصلوں پر تمہیں دی جا رہی ہے تم خود اپنے لیے فیصلے کر رہے ہو۔ انہی فیصلوں کی فہرست قیامت کے دن تمہارے گلے سے اتار کر تمہارے ہاتھ میں دے دی جائے گی کہ تم خود اپنے لیے بہترین قاضی ہو، منصف ہو جو تم نے فیصلے کیے آج وہی نافذ ہوں گے۔

سبحان اللہ! اتنی خوبصورت بات ارشاد کرنا اللہ کی شان ہی کو سزاوار ہے۔ انسان اگر غور کرے کہ جو کچھ وہ دن رات کرتا ہے یا زندگی بھر جو کچھ کرتا رہا ہے یہ سب فیصلے ہی تو تھے اور اگر غلط تھے، اللہ کی نافرمانی کے تھے تو اللہ نے فرصت دی ہے توبہ کر لے، رجوع الی اللہ کر لے اور زندگی میں اللہ سے معافی مانگ لے۔ اپنی غلطیوں کا اقرار کرے اللہ سے معافی مانگے تو اللہ کی رحمت ہمارے گناہوں سے بہت وسیع ہے وہ پھر معاف فرما دیتا ہے۔ لیکن اگر ساری زندگی بے پروا بن کر اپنی ہی مرضی سے ہر معاملہ طے کرتا رہے تو قیامت کے دن ان فیصلوں کا خمیازہ خود ہی بھگتنا پڑے گا اور یاد رکھو اگر کوئی صحیح فیصلے کرتا ہے: مَنِ اهۡتَدٰى ۔۔۔ کوئی سیدھی راہ پر چلتا ہے، نیکی کا کام کرتا ہے تو کسی پر احسان نہیں کرتا بلکہ: فَاِنَّمَا يَهۡتَدِىۡ لِنَفۡسِهٖ ۔۔۔ اپنے ہی حق میں اچھا کرتا ہے۔ نیکی کر کے کسی کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ لوگ اس کے ہاتھ پاؤں چومیں۔ اگر کوئی بھلائی کرتا ہے تو اسے لوگوں پر مسلط نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی عبادات کرتا ہے، رزق حلال کھاتا ہے نیکی کرتا ہے تو الحمد للہ، اللہ کی یاد کی توفیق نصیب ہے الحمد اللہ! لیکن یہ کسی پر احسان نہیں ہے۔ اللہ کا ذکر نصیب ہو، شب بیداری نصیب ہو، تلاوت قرآن نصیب ہو تو یہ لوگوں پر احسان نہیں ہے کہ اب لوگوں سے یہ توقع رکھے کہ وہ اسے بزرگ مانیں بلکہ اسے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ جو نیکی بھی کر رہا ہے اپنے لیے کر رہا ہے: وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيۡهَا ۔۔۔ جو گمراہی اختیار کرتا ہے، برائی اور گناہ کرتا ہے، اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ رہا بلکہ اپنے ساتھ زیادتی کر رہا ہے اور اس کی سزا اُسے خود بھگتنی پڑے گی۔

اپنے کردار کا بوجھ خود ہی اٹھانا ہوگا:

یاد رکھو: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۔۔۔ کوئی دوسرا کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ہر ایک اپنے حال میں پھنسا ہوگا، اس کے لیے اپنی آزمائش ہی اتنی کافی ہوگی کہ کسی دوسرے کو نہیں پوچھے گا۔ آج ہم نے رواج بنائے ہوئے ہیں کہ سارا سال اللہ کی اطاعت نہیں کرتے، نماز تک ادا نہیں کرتے، لین دین میں حلال حرام کی پروا نہیں کرتے اور سال میں ایک مرتبہ کسی خانقاہ پر جا کر چڑھاوا چڑھا آتے ہیں، کسی پیر صاحب کو نذرانہ دے آتے ہیں، کسی جماعت کے ساتھ سہ روزہ لگا آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ سب کا کفارہ ہوگیا۔ فرمایا، اس طرح نہیں ہوگا کہ فلاں کو نذرانہ دے دیا ہے اب وہ ہمارے گناہ بخشوا دے گا۔ جن سے تم امیدیں لگائے بیٹھے ہو انہوں نے اپنا حساب دینا ہے، تم نے اپنا دینا ہے ہر کسی نے اپنی حیثیت کے مطابق حساب دینا ہے۔ جتنا کوئی صاحب علم ہوگا اتنا ہی اس کا حساب مشکل ہو جائے گا۔ شاید ان پڑھ سے زیادہ اس کی پُرسش ہو کہ تو نے جاننے کے باوجود برائی کیوں کی؟ وہاں کوئی دوسرے کی وکالت نہیں کر سکے گا۔ ہر ایک نے اپنا بوجھ خود اٹھانا ہے لہٰذا کوئی Shortcut نہ ڈھونڈو بلکہ اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ کھرا اور سیدھا رکھو۔

فرمایا: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ اور ہم تب تک عذاب نہیں کرتے جب تک اپنا پیغام اس بندے تک پہنچا نہیں دیتے۔ نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۔۔۔ سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہاں اللہ کا رسولؐ ہی مبعوث ہو بلکہ اس سے مراد ہے کہ اللہ کا پیغام پہنچ جاتا ہے۔ اللہ کا نبیؐ مبعوث ہو جائے تو الحمدللہ، ورنہ نبیؐ کے پیروکاروں سے، علمائے حق سے پہنچ جاتا ہے اور جہاں کوئی عالم بھی نہ پہنچے تو قدرت کا نظام اللہ کا اپنا پیغام وہاں پہنچا دیتا ہے۔ اگر کوئی رات دن کی گردش کو دیکھے، چیزوں کی تعمیر و تخریب کے عمل پر غور کرے، کائنات کے رواں دواں نظام پر نظر ڈالے تو لامحالہ اسے یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ کوئی ایک ہستی ہے جو خالق ہے، مالک ہے، قادرِ مطلق ہے اور اکیلی وہی ذات ہے جو اس سارے نظام کو چلا رہی ہے۔ جو اس بات کو مان لے اس کی نجات کے لیے یہی کافی ہے البتہ جہاں کسی نبیؐ کی تعلیمات پہنچ جائیں وہاں کے لوگوں کے لیے ان تعلیمات کو قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ فرمایا، ہم نے کسی قوم کو یونہی ہلاک نہیں کیا بلکہ ان تک اپنا پیغام پہنچایا اور ان تک بات پہنچی جب قوم نے وہ بات قبول کرنے سے انکار کر دیا، اللہ کی بات کو ٹھکرا دیا اور اس کی مخالفت کی تو ان پر عذاب نازل ہوگیا۔

امراء کو گناہ پر ڈھیل ملنا عذاب کا پیش خیمہ:

فرمایا: وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ

فَدَمَّرۡنٰهَا تَدۡمِيۡرًا⑯ جب کسی ملک، کسی شہر میں برائی حد سے بڑھتی ہے تو اللہ کریم کی ناراضگی کا سبب بنتی ہے اور اللہ کریم اس کی تباہی کا ارادہ فرما لیتے ہیں۔ وہاں کے رؤسا اور امراء کو مہلت دے دی جاتی ہے اور وہ خوب برائی کرتے ہیں۔ چونکہ عوام کا مزاج ہے کہ وہ رؤسا اور امراء کے نقش قدم پر چلتے ہیں، ارشاد پاک ہے: اَلنَّاسُ عَلٰی دِيۡنِ مُلُوۡکِهِمۡ (الاسرار المرفوعہ) لوگ اپنے بادشاہوں کی پیروی کرتے ہیں۔ ان جیسا کردار اپنانا چاہتے ہیں، ان کا حلیہ اپنانا چاہتے ہیں، جب بستیوں اور شہروں کے امراء برائی کو شیوہ بنا لیتے ہیں تو عام آدمی بھی ان کی پیروی میں برائی کرنے لگ جاتا ہے۔

اللہ کریم کی طرف سے امور میں تھوڑی بہت گرفت ہوتی رہے تو یہ توبہ کا سبب بن جاتی ہے۔ کبھی بیماری سے، کبھی مالی نقصان سے انسان کے دل میں خوفِ الٰہی پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، توبہ کرتا ہے لیکن اگر اللہ کی طرف سے ڈھیل دے دی جائے، صحت بھی ٹھیک رہے، مال و دولت بھی بے تحاشہ ہو، اقتدار بھی آ جائے کبھی کوئی تکلیف نہ آئے تو پھر یہ مہلت اور ڈھیل تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ فرمایا: فَفَسَقُوۡا فِيۡهَا۔۔۔ وہ دل کھول کر برائیاں کرتے ہیں فَحَقَّ عَلَيۡهَا الۡقَوۡلُ۔۔۔ تو اُن پر جرم ثابت ہو جاتا ہے فَدَمَّرۡنٰهَا تَدۡمِيۡرًا⑯ اور ہم اُن کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں اور ایسی تباہی آتی ہے کہ ہر چیز تہ و بالا ہو جاتی ہے اور کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں ہوتا۔

فرمایا: وَكَمۡ اَهۡلَـكۡنَا مِنَ الۡقُرُوۡنِ مِنۡۢ بَعۡدِ نُوۡحٍ۔۔۔ اور یہ کسی ایک قوم یا کسی ایک شہر یا بستی کی بات نہیں ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جب معمورۂ عالم دوبارہ آباد ہوا تو تاریخ عالم میں ایسی بہت سی اقوام ملیں گی جو تباہ ہو گئیں، کتنے شہنشاہوں کے نام ملیں گے، کتنے محل ملیں گے جو اب کھنڈر ہو گئے، کتنی عظیم الشان سلطنتیں تھیں جن کے محض آثار باقی ہیں لیکن کوئی فرد باقی نہیں، سب تباہ و برباد ہو گئے دنیا سے مٹا دیے گئے۔

فرمایا: وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوۡبِ عِبَادِهٖ خَبِيۡرًاۢ بَصِيۡرًا⑰ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار کافی ہے، وہ خود دیکھ بھی رہا ہے اور اس کے علم میں بھی ہے کہ اس کے بندے کیا کر رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ لوگ بالکل بے مہار ہیں، آزاد ہیں کہ جو چاہیں کریں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کی ہر سوچ بھی اللہ کے علم میں ہے، اور سب کا کردار بھی اللہ کے علم میں ہے۔ اللہ کریم ان سب باتوں کو دیکھ بھی رہے ہیں اور جانتے بھی ہیں۔ اللہ کریم کے اپنے فیصلے ہیں جو چاہیں گے فیصلہ فرما دیں گے، انہیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔

دنیا کا طالب کبھی سیر نہیں ہوتا:

فرمایا: مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعَاجِلَةَ عَجَّلۡنَا لَهٗ فِيۡهَا مَا نَشَآءُ۔۔۔ اگر کوئی آخرت کو بھول کر،

عظمتِ الٰہی کو فراموش کر کے صرف ہوسِ دنیا میں مبتلا ہو جائے اور حرام اور ناجائز طریقوں سے دولت جمع کرنا شروع کر دے، اقتدار کی لالچ میں مبتلا ہو جائے، دنیوی وسائل اور مفادات کے پیچھے لگ جائے تو پھر اللہ کریم بھی اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتے ہیں کہ اگر تمہاری طلب دنیا ہی ہے تو ٹھیک ہے دنیا لے لو لیکن جتنی تم مانگتے ہو اتنی نہیں ملے گی بلکہ جتنی ہم چاہتے ہیں اتنی دیتے ہیں۔ گویا جو بھی آخرت کو، عظمتِ الٰہی کو بھول کر اپنی ساری کاوش حصولِ دنیا پر لگا دیتا ہے اسے اللہ کریم دنیا عطا کر دیتے ہیں لیکن اس کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ اپنی مرضی کے مطابق اسی لیے آپ نے کسی دنیادار کو سیر چشم نہیں دیکھا ہوگا، یہی کہتے سنا ہوگا کہ مزید چاہیے، اور چاہیے۔ عجیب بات ہے کہ لوگوں کے پاس دولت کے اتنے انبار ہوتے ہیں کہ انہیں خود شمار کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن پھر بھی مزید اکٹھی کرنے کے لیے بھٹک رہے ہوتے ہیں، مزید بڑھانے کے لیے حیلے کر رہے ہوتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے، انسانی ہوس کے مطابق اسے دنیا نہیں ملتی۔ جس کے پاس آپ کے گمان میں بہت زیادہ دولت ہے، وہ اور زیادہ کی تڑپ میں مرا جا رہا ہے۔ دنیا کے طالب کو اللہ کریم دنیا دیتے تو ہیں لیکن اپنی مرضی سے اور آخرت کو تو وہ بھلا چکا تھا، قربان کر چکا تھا لہٰذا اس کا ٹھکانہ جہنم بن جاتا ہے۔ فرمایا: لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ جو دنیا کے طالب ہیں ان کے لیے ہم نے دوزخ بنائی ہے، جنہوں نے زندگی میں آخرت سے روگردانی کرتے ہوئے جائز ناجائز کی پروا نہ کی، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی، اللہ کی کتاب اور دین کی پروا نہ کی اور محض دنیا کی طلب میں مگن رہے تو ایسے ہی لوگوں کے لیے ہم نے جہنم بنائی ہے۔ یہ لوگ بہت ذلیل ہو کر، راندۂ درگاہ ہو کر جہنم واصل ہوں گے۔ فرمایا: جہنم کا داخلہ ذلت و رسوائی کا داخلہ ہے۔ سزا اور عذاب کے ساتھ ذلت و رسوائی بھی ان کا مقدر ہے۔ اللہ تعالیٰ پناہ دیں جہنم کے عذاب تو اپنی جگہ بہت شدید ہیں۔ انسان دنیا میں جنت کی راحت ہی سمجھ سکتا ہے نہ جہنم کا عذاب سمجھ سکتا ہے یہ انسانی شعور سے بالا ہے، جس کو بھگتنا پڑے گا صرف وہی سمجھ سکے گا۔

اعمال کی قبولیت کی بنیاد، صحتِ عقیدہ:

فرمایا: وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ اور جو آخرت کا طالب رہا اور اس کے حصول کے لیے محنت کرتا رہا، بشرطیکہ: وَهُوَ مُؤْمِنٌ۔۔۔ وہ مومن ہو تو فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ ہم اس کی محنت ضائع نہیں جانے دیتے اس کا بہترین اجر دیں گے۔ یہاں بتایا گیا ہے کہ بنیادی بات ایمان ہے کہ بندہ آخرت کا طالب ہو اور اس کا عقیدہ صحیح ہو۔ اگر عقیدہ ہی درست نہیں ہوگا، قرآن کے مطابق نہیں ہوگا، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق نہیں ہوگا تو وہ مجاہدہ بھی کرتا رہے، تسبیحات بھی پڑھتا

رہے، اپنی طرف سے نیکیاں بھی کرتا رہے تو ان نیکیوں کی کوئی بنیاد نہیں۔ نیکی کی بنیاد عقیدے پر ہے، ایمان پر ہے۔ سب سے پہلے اپنا عقیدہ درست کرلے اور اللہ کریم کو ویسا مانے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منواتے ہیں۔ اللہ کی ذات اور صفات کو ویسا مانے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے۔ اگر ایسا مانے گا تو پھر آخرت کے لیے جو محنت مجاہدہ بھی کرے گا اسے اس کا بہترین اجر ملے گا۔

دنیا اور آخرت کے طلب گاروں میں فرق یہ ہے کہ دنیا کا طالب ہمیشہ بھوکا رہتا ہے ترستا رہتا ہے کیونکہ اسے اللہ کریم دنیا دے تو دیتے ہیں لیکن اتنی نہیں جتنی وہ مانگتا ہے بلکہ اپنی مرضی سے دیتے ہیں۔ چونکہ آخرت کو تو چھوڑ چکا تھا لہٰذا اس کی ساری زندگی جہنم کی وادیوں میں برباد ہوکر گزر جائے گی جبکہ آخرت کا طالب، اپنا عقیدہ درست رکھے اور اس پر زندگی گزارے تو اللہ کریم اسے اتنی آخرت عطا فرماتے ہیں جتنی اس کے گمان میں بھی نہیں۔ جو وہ مانگ رہا ہوتا ہے وہ بہت تھوڑی ہے جبکہ اللہ کریم اپنی شان کے مطابق بہت زیادہ عطا کرتے ہیں۔ اس کی محنت کا بہت زیادہ اعزاز کیا جاتا ہے، عزت کی جاتی ہے، بے حد اور عظیم انعامات عطا کیے جاتے ہیں۔

اللہ کی ربوبیت سب کے لیے:

فرمایا: وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحۡظُوۡرًا ۝۲۰ یوں تو ہم ہر بندے پر اپنی نوازشات عام رکھتے ہیں۔ فاسق و فاجر ہو، مومن و کافر ہو، سب کو پیدا کرنا، اُن کو پالنا، ان پر زندگی کی راہیں کھولنا، رزق کے اسباب پیدا کرنا، مخلوق تک رزق پہنچانا، زندگی دینا، موت تک کی مہلت دینا، اُن تک پیغامِ حق پہنچانا، یہ سب تقاضائے ربوبیت ہے۔ اور اللہ کی یہ عطا سب کے لیے ہے، خواہ کوئی اسے مانے یا نہ مانے اس کا شکر ادا کرے یا نہ کرے۔ کافروں کے پاس حیات بھی ہے، اولاد ہے، مال و منال ہے، اقتدار ہے، عہدے بھی ہیں یہ سب کچھ عام ہے اور اللہ کی عطا کے دروازے کسی پر بند نہیں کیے جاتے۔ کوئی کسی کا رزق، اولاد یا نعمتیں روک نہیں سکتا۔ اللہ کریم جو عطا کرتے ہیں اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جو عطا نہیں کرتے اسے کوئی دلوا نہیں سکتا۔

یہ لمحۂ فکریہ ہے ان لوگوں کے لیے جو یہ مسائل لیے پھرتے ہیں کہ کسی نے ان کی روزی بند کردی ہے، کسی نے اولاد کی بندش کردی ہے حالانکہ اللہ کریم تو نافرمانوں کو گستاخوں کو بھی حتیٰ کہ کافروں کو بھی جو اُسے مانتے ہی نہیں رزق دے رہے ہیں، اولاد دے رہے ہیں، مال و منال دے رہے ہیں، یہ تو اس کی عمومی عطا ہے۔ البتہ جب رحمتِ خاصہ کی بات آئے گی، آخرت کے انعامات کی بات آئے گی تو وہ صرف اُن کو ملے گی جن کا عقیدہ اور عمل درست ہوگا۔

فرمایا: اُنۡظُرۡ كَيۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ۔۔۔ دنیا میں دیکھ لو ہم نے انسانوں کے درجات

مقرر کر دیے ہیں۔ مفلس وغریب بھی ہیں، تونگر وامیر بھی ہیں۔ بادشاہ وحاکم ہیں، رعیت ومحکوم ہیں۔ یہ سب انسان ہی ہیں۔ اللہ کریم نے معمورۂ عالم کی آبادی کے لیے انسانوں کی درجہ بندی کر دی ہے تا کہ دنیا کا نظام چلتا رہے۔ کوئی عالم ہے، تو کوئی اَن پڑھ ہے اور عالم کا محتاج ہے۔ کوئی بادشاہ ہے، کوئی فقیر ہے، ہر ایک کو اس کا اپنا حصہ مل رہا ہے کسی کے بس میں نہیں ہے کہ کسی دوسرے سے کچھ چھین لے۔

آخرت کے درجات:

اور آخرت میں: وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾ درجوں میں بہت زیادہ، بہت بڑے فاصلے ہوں گے۔ بہت بڑے بڑے مقامات ہوں گے، بڑی بڑی منازل ہوں گی۔ جسے عزت ملے گی اسے دنیا کی نسبت کروڑوں گنا زیادہ ملے گی، انعام ملے گا تو دنیا کے اعتبار سے کروڑوں گنا زیادہ ہوگا۔ اور جو جہنم میں جائے گا وہ بہت بڑی ذلت ورسوائی میں جائے گا۔ اور اسے سزا ملے گی تو وہ دنیا کی سزا سے کروڑوں گنا زیادہ ہوگی۔

شرک کے قریب بھی مت پھٹکو:

فرمایا: یہ بنیادی بات یاد رکھو لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾ کبھی بھول کر اللہ کی ذات اور صفات میں اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرنا۔ شرک کے قریب بھی مت پھٹکنا کیونکہ شرک تمام نیکیوں کو ضائع کر دیتا ہے، بھسم کر دیتا ہے۔ اور تمام برائیوں کو جنم دیتا ہے کہ مشرک ہر برائی کر سکتا ہے۔ شرک کرنے والے کی کوئی نیکی مقبول نہیں ہوتی، وہ نیکی کر ہی نہیں سکتا لہٰذا کبھی بھول کر بھی اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنالینا، کسی دوسرے الٰہ کا تصور بھی نہ کرنا۔ جو ایسا کرے گا وہ بدحال، تہی دست و بے کس ہو کر بیٹھ رہے گا۔ اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ وہ جن کاموں کو نیکیاں سمجھ رہا تھا وہ بھی برائیاں ثابت ہوں گی کیونکہ وہ اللہ کی رضا کے لیے تو کر ہی نہیں رہا تھا اس نے تو اللہ کے شریک بنائے ہوئے تھے اور ان کی خوشنودی کا طالب تھا۔ گویا شرک اتنی بڑی بیماری ہے کہ یہ کسی چیز کو باقی نہیں رہنے دیتی۔

سورۂ بنی اسرائیل رکوع 3 آیات 23 تا 30

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾

اور آپ کے پروردگار نے حکم کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور (اپنے) ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرو اگر تمہارے پاس ان میں ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان دونوں سے ناپسندیدہ بات نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے بہت اچھے انداز سے بات کرو ﴿۲۳﴾ اور عاجزی اور انکساری سے ان کے آگے جھکے رہو اور (ان کے حق میں) دعا کرو اے میرے پروردگار! جس طرح

انہوں نے مجھے بچپن میں پالا پوسا ہے آپ ان دونوں پر رحمت فرمایئے ﴿۲۴﴾ تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے اگر تم نیک ہو گے تو بے شک وہ رجوع کرنے والوں (توبہ کرنے والوں) کو معاف فرمادیتا ہے ﴿۲۵﴾ اور رشتہ دار کو اس کا حق ادا کرو اور محتاج کو اور مسافر کو بھی اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ ﴿۲۶﴾ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے ﴿۲۷﴾ اور اگر اپنے پروردگار کی رحمت (فراخ دستی) کے انتظار میں جس کی تمہیں امید ہو ان (مستحقین) کی طرف توجہ نہ کرسکو تو ان سے نرمی سے بات کہہ دیا کرو ﴿۲۸﴾ اور تُو اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ ہی اسے بالکل کھلا چھوڑ دے پھر الزام خوردہ خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ رہے گا ﴿۲۹﴾ بے شک تمہارا پروردگار جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کردیتا ہے اور (جس کی چاہتا ہے) تنگ کردیتا ہے بے شک وہ اپنے بندوں سے خوب واقف ہے، دیکھ رہا ہے ﴿۳۰﴾

تفسیر و معارف

معبودِ برحق صرف اللہ ہے:

فرمایا: وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۔۔۔ یہ تو اللہ نے، آپ کے پروردگار نے، معبودِ برحق نے طے کردیا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے، کسی سے امیدیں ہی وابستہ کی جائیں نہ کسی کے خوف سے کچھ کیا جائے بلکہ اپنی ساری امیدیں اللہ کی ذات سے وابستہ رکھی جائیں۔ اللہ ہی نے وسائل پیدا فرمائے ہیں۔ وہ مسبب الاسباب ہے اور اسباب میں تاثیر وہ خود پیدا فرماتا ہے۔ اسباب بذاتِ خود کچھ بھی نہیں ہیں لہٰذا جائز وسائل اختیار کرو اور اللہ کے حکم کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے شرعی طریقے سے اُن اسباب و وسائل کو بروئے کار لاؤ لیکن اُن پر بھروسہ نہ کرو۔ بھروسہ صرف اللہ پر کرو جو مسبب الاسباب ہے۔ اسباب اختیار کرنا اطاعتِ الٰہی اور عبادت ہے اور غیر اللہ سے امیدیں وابستہ کرنا تباہی کا سبب ہے۔

والدین کے حقوق:

فرمایا: وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا۔۔۔اور اپنے والدین کے ساتھ بہت محبت اور عزت سے پیش آؤ۔ اُن کا احترام تم پر لازم ہے کہ وہ تمہارے دنیا میں آنے کا سبب بنے، گو وہ بھی تمہاری طرح مخلوق ہیں۔ اللہ نے انہیں بھی پیدا کیا ہے۔ اُن کی عزت کرنا تمہارا فرض ہے۔ اُن کی خدمت کرنا تم پر لازم ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ والدین نیک ہوں یا مسلمان ہوں گے تو تب ہی احترام کے مستحق ہوں گے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اگر وہ کافر ہوں یا بدکار ہوں تب بھی اولاد پر ان کی خدمت فرض ہے۔ اُن کا وہ معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ والدین اگر کافر ہوں تو بیٹا اُن کی ہدایت کے لیے دعا کر سکتا ہے، انہیں تبلیغ کر سکتا ہے، سمجھانے کی کوشش کر سکتا ہے لیکن ادب اور احترام کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے۔ وہ ان کی توہین نہیں کر سکتا، غصہ نہیں دکھا سکتا، ناراض نہیں ہو سکتا۔

البتہ ایک بات طے ہے کہ والدین کی وہ بات نہیں مانی جائے گی جس میں اللہ کی نافرمانی ہو۔ یہ اصول ہے کہ اللہ کی نافرمانی میں کسی کی بھی کوئی بات نہیں مانی جائے گی۔ علماء فرماتے ہیں کہ والدین اگر بزرگ ہو جائیں تو ان کی اجازت نہ ملنے پر فرضِ کفایہ کو ترک کیا جا سکتا ہے لیکن فرضِ عین ترک نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً اگر والدین نماز ترک کرنے کا حکم دیں تو چونکہ نماز فرضِ عین ہے، یہ نہیں چھوڑی جا سکتی البتہ گاؤں میں کسی کا جنازہ ہو رہا ہے اور لوگ اس میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں ایسے میں والد یا والدہ بیمار ہے اور اس نے کوئی کام کرنے کو کہا ہے تو وہ فرضِ کفایہ چھوڑ کر اُن کی اطاعت کرے گا حتیٰ کہ مفسرین کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ جہاد بھی اگر فرضِ کفایہ ہو تو اولاد کو والدین کی اجازت کے بغیر جانے کا حکم نہیں ہے البتہ فرضِ عین ہو تو جا سکتا ہے۔

فرضِ کفایہ سے مراد ہے کہ کچھ لوگ جو وہاں ہیں وہ کافی ہیں، سب کی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح جنازے میں دو تین افراد بھی چلے گئے تو کافی ہیں، پندرہ، بیس، پچاس، سو ہو گئے تو پھر ہر فرد کے جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسی طرح تبلیغ فرضِ کفایہ ہے کہ جب کچھ لوگ تبلیغ کر رہے ہوں تو وہ کافی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر مسلمان اٹھ کر تبلیغ پر نکل جائے۔ ایسے تمام امور میں والدین کی کفالت پہلے ہوگی اور اُن کی اجازت سے جانا ہوگا۔ اسی طرح فرائض کو چھوڑ کر بھی فرض کفایہ کے لیے نکل جانا درست نہیں جیسے بیوی بچوں کی ذمہ داریاں، اُن کی ضروریاتِ زندگی کا اہتمام کرنا۔ ان سب امور سے فرصت ہوگی، اُن سے پروگرام طے کرے گا کہ اس کی غیر حاضری میں کون ان کے امور کا ذمہ دار ہوگا، یا اُن کے اخراجات کا اہتمام کون کرے گا وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہ سب انتظام کیا جائے تو پھر فرضِ کفایہ کی ادائیگی کے لیے جانے کی اجازت ہے۔ یونہی ذمہ داریاں چھوڑ کر بھاگ جانے کی اجازت

نہیں ہے۔ عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ لوگ اپنی ذمہ داریوں کو چھوڑ کر نکل جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کے کام سے جا رہا ہوں میرا گھر اللہ ہی سنبھالے گا۔ بھئی تم نے اللہ کے نام پر نکاح کیا، اللہ نے تمہیں اولاد دی اور اس کی تربیت تم پر فرض کی اور تم اپنی ذمہ داری اللہ پر ڈال رہے ہو۔ اہل وعیال کی خبر گیری تمہاری ذمہ داری ہے، اور ذمہ داری پوری کرنا عبادت ہے۔ اس طرح تو تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ میں اللہ کا کام کر رہا ہوں میری نمازیں بھی اللہ خود پڑھے۔ ایسا نہیں عبادت تمہیں ہی کرنی ہے، ذمہ داریاں تمہیں ہی نبھانی ہیں، وہ تو معبود ہے اس کی عبادت کی جاتی ہے۔ وہ مالک ہے، ساری مخلوق کا خالق ہے۔ اس کے احسانات مسلسل جاری و ساری ہیں۔ ہر سانس اس کی عطا ہے، ہر ذرۂ رزق اس کی عطا ہے، مال و دولت، عزت، اولاد سب اس کا کرم ہے۔ تو اللہ کی عبادت و اطاعت کس درجے میں ہونی چاہیے، یہ سوچنے کا مقام ہے۔

فرمایا: اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا﴿۲۳﴾ اگر تمہارے والدین بوڑھے ہو جائیں دونوں یا دونوں میں سے کوئی ایک رہ جائے تو اُن کے سامنے کوئی دل آزاری کی بات نہ کرو فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ، عربی میں ایک محاورہ تھا جب لوگ کسی سے خفا ہو جاتے تو کہتے ''اُفٍّ لَكَ اُفٍّ لَكَ'' ''تم پر اُف ہو''۔ فرمایا، خبردار کبھی والدین کے سامنے یہ نہ کہنا کہ میں تم سے بیزار ہوں۔ اُن کا ادب پیشِ نظر رکھو اور ان سے کبھی ایسی بات نہ کہنا جس میں جھڑک ہو۔ وہ غلط کر رہے ہوں یا صحیح وہ اللہ کے سامنے خود جوابدہ ہیں تم ان کے ناظم یا ان پر حکمران نہیں ہو۔ تم والدین پر حکم نہیں چلا سکتے۔ وَلَا تَنْهَرْهُمَا۔۔۔ تو کبھی اُن سے جھڑکنے کے انداز میں بات نہ کرو۔ وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا﴿۲۳﴾ اور ان سے جب بھی بات کرو، محبت سے کرو، پیار سے کرو۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں بہت مشکل سے کما کر لاتا ہوں اور میرے والد مجھ سے پوچھے بغیر، مجھے بتائے بغیر خرچ کر دیتے ہیں، کسی کو دے دیتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَنْتَ وَ مَالُكَ لِاَبِيكَ او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم مال کی بات کر رہے ہو، تمہاری تو جان بھی اس کی ملکیت ہے۔ اگر باپ اپنے بیٹے کے مال سے خرچ لیتا ہے تو اسے بیٹے سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

اس ضمن میں ایک واقعہ عبداللہ بن اُبی ابن سلول کا ہے جو نہایت بد باطن اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں شدید تر تھا لیکن بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس منافق کا بیٹا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جانثار تھا۔ غزوہ بنی المصطلق سے واپسی پر منافق ابن اُبی نے کہا: ''خدا کی قسم! اگر ہم مدینہ واپس ہوئے تو ہم میں کا معزز ترین آدمی،

ذلیل ترین آدمی کو نکال باہر کرے گا۔"

پھر حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا ہم نے مہاجرین کو خواہ مخواہ سر پر چڑھا رکھا ہے۔ اگر ہم ان کی مدد نہ کریں تو یہ بھوکے، مفلس خود ہی شہر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ حضرت زید بن ارقمؓ نے یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچادی تو منافق ابی اُبی حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے آ کر مکر گیا اس پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوگئی کہ اس نے ایسا کہا۔

فرمایا: هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۭ وَلِلّٰهِ خَزَاۗىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ يَقُوْلُوْنَ لَىِٕنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۭ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (المنٰفقون)

ترجمہ: یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ پیغمبر کے پاس (جمع) ہیں اُن پر کچھ خرچ نہ کرو یہاں تک کہ یہ لوگ (خود بخود) بکھر جائیں۔ اور آسمانوں اور زمین کے خزانے تو اللہ کے ہیں ولیکن منافق نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹ کر مدینہ پہنچے تو عزت والے، ذلیل لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گے۔ حالانکہ عزت اللہ کے لیے ہے اور اس کے پیغمبر کے لیے ہے اور ایمان والوں کے لیے ولیکن منافقین نہیں جانتے۔

اس پر ابن اُبی کا بیٹا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا جانثار تھا، شہر کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور باپ کا راستہ روکتے ہوئے کہا، اس ہرزہ سرائی کے سبب میں تمہیں ہرگز شہر میں داخل نہ ہونے دوں گا۔ ابن اُبی نے بارگاہِ رسالت میں شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ یہ جیسا بھی ہے، تمہارا باپ ہے اور ابن اُبی کو مدینہ داخل ہونے کی اجازت دے دی ابن اُبی کے ان ہی صاحبزادے جن کا نام حضرت عبداللہؓ ہے نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم! آپ اجازت دیں تو اس کا سر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر کردوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے کافر و منافق والد کے حق کی بھی پاسداری سکھائی اور بیٹے کو باپ کا محاسبہ کرنے سے روک دیا۔

فرمایا: والدین تمہارے دنیا میں آنے کا سبب ہیں، تمہیں بچپن میں پالا ہے اُن کا یہ حق ہے کہ: وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ ہمیشہ ان کے سامنے جھک کر باادب رہو۔ محبت اور احترام سے رہو اور ان کے لیے اللہ سے دعا کیا کرو کہ اے اللہ! ان پر اس طرح رحم فرما جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں پیار سے پالا تھا۔ جب میں کسی قابل نہیں تھا یہ راتوں کو جاگ جاگ کر مجھے سلاتے رہے، خود بھوکے رہ کر مجھے کھلاتے رہے۔ میری پرورش اور تربیت کی، پال پوس کر جوان کیا تو آپ بھی ان پر رحم

فرمایئے، ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمایئے، ان کے گناہوں کو بخش دیجیے اور اپنی رحمت میں جگہ دیجیے یا اللہ، اگر یہ غلط راستے پر ہیں تو انہیں ہدایت دیجیے یہ اولاد کے فرائض میں شامل ہے کہ والدین سے شفقت سے پیار سے بات کرے، جھڑکے نہیں نہ ناراض ہو بلکہ اُن کی خدمت کرے۔ اُن کے بڑھاپے میں انہیں اس طرح سنبھالے جس طرح بچپن میں انہوں نے اُسے سنبھالا تھا۔ فرمایا، جو خود مخلوق ہیں، جنہیں اللہ نے پیدا فرمایا، جو تیرے دنیا میں آنے کا سبب ہیں اگر اُن کی اطاعت اتنی فرض ہوگئی تو جو ربّ العالمین ہے اس کی اطاعت کا درجہ کیا ہوگا؟ اس کی اطاعت کتنی شدت سے فرض ہے! تو پھر اس طرف بندہ اتنی غفلت کیوں اور کیسے کرتا ہے؟

فرمایا: رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ ۔۔۔اور یہ یاد رکھو کہ اللہ کے ہاں مکاری نہیں چلتی۔ اللہ کے سامنے اداکاری نہیں ہوسکتی کہ تمہارے دل میں کچھ ہو اور بظاہر کچھ اور کرو اس لیے کہ تمہارا پروردگار جو کچھ تمہارے نہاں خانہء دل میں ہے اس سے بھی واقف ہے: اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾ اگر تم نیکی کرو گے اور والدین کی خدمت کرو گے تو وہ بھی تمہیں دعائیں دیں گے، لوگ بھی تمہیں اچھا کہیں گے اور اللہ بھی تمہارے گناہ معاف فرمادیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ سب کام تم دل کی گہرائی اور خلوص سے کرو، دکھاوے کے لیے نہیں۔ توبہ کرنے والوں کے لیے اللہ کی شان اتنی کریمانہ ہے کہ جس لمحے کوئی بڑے سے بڑا گناہ گار بھی خلوصِ دل سے توبہ کرے، اس کی طرف رجوع کرے تو وہ اُسے معاف کردیتا ہے اور اُسے نیکی کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما دیتا ہے۔ وہ شخص کتنا بدبخت ہوگا جسے رجوع اِلی اللہ اور توبہ کا خیال نہ آئے اور اس کے بغیر ہی مرجائے۔ اس سے بڑی محرومی کیا ہوگی۔ اللہ کریم معاف فرمائیں اور نیکی کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

فرمایا: وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ﴿۲۶﴾ انسان پر سب سے مقدم حق اللہ کا ہے جو اس کا واحد مالک، خالق و رازق اور پروردگار ہے ہمیشہ اس کی تربیت فرماتا ہے۔ اس کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہے جو اللہ اور بندے کے درمیان واحد واسطہ، ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ پھر والدین کا حق ہے جس کے متعلق اللہ کریم نے بڑی تفصیل سے ارشاد فرمایا کہ والدین کا یہ حق ہے کہ اولاد اُن کی خدمت کرے کیونکہ وہ اس کے دنیا میں آنے کا سبب بنے، اس کو پال پوس کر بڑا کیا لہٰذا اولاد کا فرض ہے کہ اُن کی خدمت کرے اگرچہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اگر والدین مومن ہوں، اللہ والے ہوں، نیک ہوں اور نیکی کی تربیت بھی دیں تو پھر اُن کا حق اور زیادہ بڑھ جاتا ہے اور اولاد کو چاہیے کہ والدین کے لیے دعا بھی کرے۔ والدین کے بعد قرابت داروں کا حق ہے۔ جس قدر قریبی رشتہ ہے اس قدر اس کے حقوق ہیں۔ اگر قرابت داروں کے حقوق کسی کے ذمے ہوں جیسے وراثت

یا آمدن میں شراکت، تو اُن کو پوری طرح سے ادا کیا جائے۔ اُن کے ساتھ محبت وملنساری سے رہا جائے اور عفوودرگزر کا معاملہ روا رکھتے ہوئے انہیں اکٹھا رکھنے کی کوشش کی جائے۔

قرابت داروں کے بعد مساکین کا حق ہے۔ مساکین اُن لوگوں کو کہا جاتا ہے جو محتاج ہوتے ہیں جو کوئی کام نہیں کر سکتے، معذور ہوتے ہیں یا بیمار ہوتے ہیں اور اُن کا کوئی ذریعہء معاش نہیں ہوتا، انہیں کوئی ذریعہء آمدن میسّر نہیں ہوتا۔ مساکین کے بعد مسافر کا حق ہے کہ اس کی خدمت کی جائے، اس کی مدد و راہنمائی کی جائے۔

دنیا کا نظام حقوق اور فرائض کے توازن سے قائم ہے:

دنیا کا نظام حقوق وفرائض کے توازن سے قائم ہے۔ اگر والدین کا اولاد پر حق ہے تو اُن کا حق اولاد کا فرض بن جاتا ہے۔ ان کی خدمت اولاد پر فرض ہو جاتی ہے۔ اسی طرح قرابت داروں کا اگر کسی پر حق ہے تو اُن کے حقوق کی نگہداشت اس شخص پر فرض ہو جاتی ہے۔ مساکین کی مدد کرنا، اپنی استطاعت کے مطابق فرض ہو جاتا ہے۔ مسافر کو بھی اللہ کریم نے حق دیا ہے اور مسافر کے لیے یہ شرط بھی نہیں کہ وہ غریب ہی ہو بلکہ وہ امیر ہو یا فقیر ہو غریب الوطنی اُسے اس بات کا مستحق بنا دیتی ہے کہ اس کی مدد کی جائے، اس کی ضروریات کا خیال رکھا جائے اور اس سے خوش اخلاقی سے پیش آیا جائے۔

جب یہ سب ہمارے فرائض ہو گئے تو پھر ہم والدین کی خدمت کر کے یا رشتہ داروں کے ساتھ حُسن سلوک کر کے، کسی غریب یا مسکین کو چند سکے دے کر یا کسی مسافر کو کھانا دے کر اُن پر احسان کیوں جتاتے ہیں؟ یہ تو ہماری ذمہ داری ہے ہم پر فرض ہے اور اُن کا حق بنتا ہے بلکہ بندے کو تو اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ حقوق العباد ادا کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو رہا ہے۔ اُسے ہرگز احسان نہیں جتانا چاہیے اس لیے کہ فرض کی ادائیگی احسان نہیں ہوتا بلکہ ذمہ داری ہوتی ہے جسے پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔

مالی معاملات میں اعتدال کا حکم:

اسلام ہر معاملے میں اعتدال کا حکم دیتا ہے۔ یہاں مالی معاملات کا ذکر ہے تو اُن میں بھی اعتدال رکھا گیا ہے۔ جہاں یہ فرمایا کہ والدین کی خدمت کرو، عزیز و اقارب کی نگہداشت کرو، غرباء و مساکین کی مدد کرو، غریب الوطن مسافر کی مدد کرو، وہاں یہ بھی فرمایا: وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ﴿٢٦﴾ اور فضول خرچی سے مال نہ اُڑاؤ۔ ان سارے امور میں اعتدال کا خیال رکھو، اپنی حیثیت کا اندازہ رکھو اور جس حد تک مناسب ہے اسی قدر دو۔ یہ نہ ہو کہ سب فضول خرچی میں اُڑا دو، سب میں بانٹ کر خود محتاج ہو جاؤ اور دوسروں سے مانگنے لگ جاؤ۔ یہ درست نہیں ہے۔

تَبۡذِیۡرًا کہتے ہیں ضرورت سے زیادہ، اور بلا ضرورت خرچ کرنے کو۔ غیر ضروری جگہ پر مال ضائع کرنا محض اپنی بڑائی کے لیے یا دکھاوے کے لیے، لوگوں میں خود کو مالدار منوانے کے لیے۔ ایسے موقعوں پر پیسے اڑانا جہاں ضرورت نہ ہو اسراف ہے جسے تبذیرا کہا گیا ہے اور جہاں ضرورت ہو، وہاں پر بھی ضرورت کے مطابق خرچ کیا جائے گا۔ اگر اس سے زیادہ خرچ کیا جائے تو وہ اسراف کہلائے گا۔ اسراف فضول خرچی کو کہتے ہیں مثلاً ایک کام سو یا پانچ سو روپے میں ہوسکتا ہے لیکن اسی کام کو پانچ ہزار میں کرایا جائے تو یہ فضول خرچی ہوگی، اسراف ہوگا لہٰذا فرمایا، یہ فرائض ضرور پورے کرو لیکن اپنی حیثیت دیکھ کر۔ اللہ نے جس کو جتنی گنجائش دی ہے اتنا خرچ کرو۔ ہر آدمی اگر اپنا بجٹ اپنی آمدن کے مطابق بنائے تو کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو کہ یہ خرچ کرنے کا بہترین اصول بھی ہے۔ جو صاحبِ ثروت ہیں جن کے پاس دولت کی فراوانی ہے وہ عزیز و اقارب کا خیال رکھیں اور غرباء و مساکین کی مدد کریں۔ خلافتِ اسلامیہ نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب لوگ زکوٰۃ لے کر شہروں میں پھرا کرتے تھے اور کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا اس لیے کہ اس دور میں نظام اسی حکم کے مطابق تھا لہٰذا عزیز و اقارب کی بھی مدد کی جاتی اور غرباء و مساکین اور مسافروں کو بھی امداد مل جاتی۔

فرمایا: اِنَّ الۡمُبَذِّرِیۡنَ کَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّیٰطِیۡنِ ۔۔۔ جو لوگ اپنی شہرت اور بڑائی کے لیے غیر ضروری جگہوں پر پیسے ضائع کرتے ہیں، ضرورت سے زیادہ خرچ کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ بھلا مال خرچ کرنے والا شیطان کا بھائی کس طرح ہوگیا؟ اس نے تو صرف پیسے خرچ کیے اور شیطان نے تو اللہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر غور کریں دونوں کے پیچھے وجہ ایک ہی ہے۔ اپنی بڑائی کا زعم۔ شیطان نے سجدے سے انکار کرتے ہوئے یہی سبب پیش کیا کہ اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ (الاعراف 12) میں اس سے بہت بہتر ہوں، بہت بڑا ہوں، میں اس کو سجدہ نہیں کرتا۔ اسی طرح جو تَبۡذِیۡرًا یعنی فضول خرچی کا مرتکب ہوتا ہے، اپنی شان بنانے کے لیے غیر ضروری امور پر پیسے اڑاتا ہے تو اس کے پیچھے بھی یہی جذبہ کار فرما ہوتا ہے کہ میں دوسروں سے بہت بڑا ہوں۔ اپنی بڑائی منوانے کا جذبہ شیطان کو بھی لے ڈوبا اور غیر ضروری امور پر فضول خرچی کرنے والے کو بھی لے ڈوبتا ہے۔ فرمایا، دونوں کا جذبہ ایک ہی ہے، یہ دونوں بھائی ہیں۔ فضول خرچی کرنے والا شیطان کا بھائی ہے، اُس جیسا ہی ہے۔ وَکَانَ الشَّیۡطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوۡرًا ﴿۲۷﴾ اور شیطان تو اپنے پروردگار کا بہت ہی ناشکر گزار تھا، بہت بڑا ناشکرا تھا۔ انسان کو شیطان جیسے افعال سے احتراز کرنا چاہیے، بچنا چاہیے کہ وہ اس کا دشمن ہے اور دشمن کے پیچھے چلنا کوئی دانشمندی نہیں۔

فرمایا: وَاِمَّا تُعۡرِضَنَّ عَنۡہُمُ ابۡتِغَآءَ رَحۡمَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکَ تَرۡجُوۡہَا فَقُلۡ لَّہُمۡ قَوۡلًا مَّیۡسُوۡرًا ﴿۲۸﴾

اور اگر تم کسی کو کچھ دینے کے قابل نہیں ہو۔ اپنا گزارا کرنے کے لیے صبح شام جدوجہد کررہے ہو، کسی رشتہ دار کی مدد نہیں کرپاتے نہ ہی غرباء ومساکین کی تو پھر کم از کم اُن سے بات میٹھے انداز میں کرو۔ تم خود بھی اللہ کی طرف سے فراخی اور کرم کے منتظر ہو یعنی تم پر اگر تنگدستی ہے تو یہ منجانب اللہ ہے۔ انسانوں کے درمیان دن بدلتے رہتے ہیں۔ فراخی بھی آجاتی ہے، تنگدستی بھی آجاتی ہے۔ صحت بھی آجاتی ہے اور کبھی بیماری بھی آجاتی ہے۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۔۔۔ (آل عمران: 140) اگر تنگدست ہو، کسی کو کچھ دینے کے قابل نہیں ہو تو کم از کم پیار سے تو بات کرو، جھڑکو نہیں۔ اُن سے معذرت کرلو اور اچھے طریقے سے انہیں رخصت کردو۔

مالی معاملات میں بھی انتہا پسندی کی اجازت نہیں:

فرمایا: وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾ قانون یہ ہے کہ اتنے سخت اور بخیل نہ ہو جاؤ کہ جیسے ہاتھ گردن سے بندھے ہوئے ہیں اور تم کچھ خرچ کر ہی نہیں سکتے۔ ایسا نہ کرو کہ پیسے جمع کرتے رہو، زکوۃ بھی ادا نہ کرو، نہ ہی صدقات دو، کسی کی مدد بھی نہ کرو۔ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ ۔۔۔ ہاتھ بالکل چھوڑ دو کہ جو بھی آئے بس اڑاتے جاؤ۔ یہ دونوں طریقے بالکل غلط ہیں۔ جہاں بھی حد سے تجاوز کرو گے، وہ کام غلط ہو جائے گا۔ اگر اللہ نے دیا ہے تو اسے روکو نہیں اس کی مناسب تقسیم کرو۔ خود اپنے لیے کتنا چاہیے، بچوں کے لیے کتنا چاہیے، کتنا تم رشتہ داروں میں دے سکتے ہو، اس کا باقاعدہ بجٹ بننا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ بالکل ہی ہاتھ کھینچ لیا، بچے بھی بھوکے بیٹھے رہیں، انہیں بھی نہ دیا اور پیسے جمع کرتے رہے اور یہ بھی نہ ہو کہ فضول کاموں میں بے جا پیسے اڑانا شروع کردو۔ حد سے تجاوز کرنا، دونوں طرف زیادتی ہے، غلطی ہے لہٰذا حد سے تجاوز نہ کرو نہ مال کو اس طرح روکو جیسے کسی نے تمہارے ہاتھ گردن سے باندھ دیے ہوں نہ ہی ایسے کرو کہ بالکل لٹانے پر آجاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو نتیجہ یہ ہوگا فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾ پھر تم خالی ہاتھ ہو کر، الزام خوردہ ہو کر بیٹھو گے۔ اگر اتنے بخیل ہو جاؤ گے کہ اولاد کی بھی صحیح تربیت نہ کرو تو وہ بھی تم پر الزام دیں گے کہ ہمارا باپ بڑا بخیل تھا۔ اس نے ہماری تعلیم پر بھی خرچ نہیں کیا، ہماری تربیت بھی صحیح نہیں کی، ہمیں کھانا صحیح نہیں ملتا تھا، ہمارے لباس کا بھی اہتمام صحیح طور پر نہیں کیا تھا۔ اور اگر بے جا مال اُڑا دو گے تو پھر بھی ساری دنیا تم پر الزام دھرے گی کہ اس کو اللہ نے مال ودولت تو دیا تھا اس نے فضول خرچی میں اڑا دیا اور آج لوگوں سے مانگتا پھرتا ہے، آج خود محتاج ہو گیا ہے۔ بہر صورت الزام تم پر آئے گا اور مجبور وتہی دست ہو کر بیٹھ رہو گے لہٰذا اعتدال کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ جتنی حیثیت ہے اس کے مطابق مناسب جائز تقسیم کرو کہ جتنی رقم گھریلو اخراجات کے لیے ضروری ہے،

بچوں کے لیے ضروری اسے اس کام کے لیے مختص کر دو۔ جو اپنی ذات کے لیے چاہیے اسے علیحدہ کر دو اور اندازہ کرو کہ رشتہ داروں، غرباء و مسافروں کے لیے کتنا خرچ کر سکتا ہوں اتنی رقم ان کے لیے نکال لو۔

تنگی و فراخیٔ رزق آزمائش ہے:

فرمایا: اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۢ بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾ اے مخاطب! تیرا پروردگار اپنی مرضی سے کسی کا رزق بڑھا دیتا ہے اور کسی پر رزق کی تنگی بھیج دیتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں انسان کی آزمائش کے لیے ہیں کہ اگر اس کے پاس فراخی آ جاتی ہے، زیادہ دولت آ جاتی ہے تو کیا وہ اسے اللہ کی اطاعت میں خرچ کرتا ہے۔ اللہ کا شکرگزار بندہ بنتا ہے یا اپنے نفس کی بڑائی کے لیے خرچ کرنے لگ جاتا ہے اور اگر کہیں افلاس بھیج دیتا ہے اور بندے پر محتاجی آتی ہے تو کیا اس محتاجی میں بھی وہ اللہ کے در سے وابستہ رہتا ہے یا در در پر مانگنا اور سر جھکانا شروع کر دیتا ہے۔ یہ تو اللہ کا اپنا نظام ہے جو اس کی مرضی سے چلتا ہے۔ وہ دونوں طرح سے بندوں کو آزماتا ہے۔ کسی کو حکومت اور اختیارات دے کر آزماتا ہے کہ وہ اطاعت کرتا ہے یا نافرمانی اور پھر ایسا قادر ہے کہ اسی کو ایسا بے اختیار کر دینا کہ وہ جو کبھی خود مختار حکمران ہوتے ہیں انہیں ایک سپاہی ہتھکڑی لگا کر کسی جانور کی طرح لیے پھرتا ہے۔

رزق کی تقسیم اللہ کی مرضی سے ہے اور اس میں کسی کو دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جو دیتا ہے اس کا اپنا فیصلہ ہے اور وہ اپنے بندوں کی ہر طرح سے خبر بھی رکھتا ہے اور ملاحظہ بھی فرما رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کون کیا کر رہا ہے۔ یہ گنتی کے دن ہیں گزر جائیں گے۔ امیر کے بھی گزر جائیں گے، فقیر کے بھی گزر جائیں گے۔ حکمران کے بھی گزر جائیں گے اور محکوم کے بھی۔ یہ حکمرانی اور محکومی تو وقتی اور لمحاتی ہے۔ جب یہ زندگی ختم ہوگی تو حقیقی زندگی شروع ہو گی جو دائمی اور ابدی ہے جس کا مدار انسانی کردار پر ہے۔ جیسا اس کا کردار اس دنیا میں ہوگا ویسا وہاں بھگت لے گا۔ اللہ تعالیٰ ذاتی طور پر ہر بندے سے باخبر ہے اور اسے دیکھ بھی رہا ہے۔ کراماً کاتبین کے لکھے گئے اعمال نامے یا انسان کے اعضاء کی دی گئی گواہیاں اپنی جگہ، لیکن یہ نہ بھی ہوں تو اللہ ہر بات سے خود باخبر ہیں، اللہ ان کے محتاج نہیں۔ یہ چیزیں تو اللہ نے اس لیے بنائی ہیں تاکہ بندوں پر دلیل قائم ہو کہ تم نے یہ کیا تو یہ لکھا گیا۔ تمہاری زبان بتا رہی ہے کہ تم نے یہ کلمہ کہا، تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں تم نے یہ دیکھا، تمہارا ہاتھ بتا رہا ہے کہ تم نے یہ کیا۔ سب اعضائے بدن گواہی دیں گے لیکن یہ سب اگر نہ بھی ہو تو اللہ ذاتی طور پر سب کے حال سے باخبر بھی ہیں اور دیکھ بھی رہے ہیں۔

سورۂ بنی اسرآءیل رکوع 4 آیات 31 تا 40

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿٣١﴾ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿٣٢﴾ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّى الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿٣٣﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿٣٤﴾ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿٣٥﴾ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿٣٦﴾ وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿٣٧﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿٣٨﴾ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿٣٩﴾ اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿٤٠﴾

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی بے شک ان کا قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے ﴿۳۱﴾ اور زنا کے قریب بھی مت جانا بے شک وہ بے حیائی اور بری راہ ہے ﴿۳۲﴾ اور جس جاندار کا مارنا اللہ نے منع

فرمایا ہے اسے قتل مت کرو مگر جائز طور پر (یعنی شرعی حکم سے) اور جو شخص ظلم سے (زیادتی کرتے ہوئے) قتل کیا جائے تو بے شک ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے (بدلہ لینے کا) سو اس کو قتل کے بارے میں حد سے نہ بڑھنا چاہیے بے شک اس شخص (مقتول کے وارث) کی مدد کی گئی ہے ﴿۳۳﴾ اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکو مگر ایسے طریقے سے جو بہت اچھا ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور عہد کو پورا کرو (جو شرعی حدود کے اندر ہو) بے شک عہد کے بارے میں (قیامت کو) پوچھا جائے گا ﴿۳۴﴾ اور جب ناپ تول کرو تو پورا ماپو اور صحیح ترازو سے تول کر دو یہ بہت ہی اچھی بات ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہے ﴿۳۵﴾ اور (اے بندے!) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے ضرور باز پرس ہوگی ﴿۳۶﴾ اور زمین پر اکڑ کر مت چل کیونکہ تو زمین کو ہرگز نہ پھاڑ سکے گا اور نہ (لمبا ہو کر) پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچ سکے گا ﴿۳۷﴾ ان سب باتوں کی برائی تیرے پروردگار کے ہاں بہت ناپسند ہے ﴿۳۸﴾ یہ باتیں اس حکمت میں سے ہیں جو آپ کے پروردگار نے آپ پر وحی فرمائی ہیں اور (یہ بات بھی کہ) تو اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنانا پھر تو ملامت خوردہ اور راندہ ہو کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا ﴿۳۹﴾ (اے مشرکو!) کیا تمہارے پروردگار نے تم کو تو لڑکے چن کر دیے ہیں اور اپنے لیے فرشتوں کو بیٹیاں بنایا؟ بے شک تم بہت بڑی (سخت) بات کہتے ہو ﴿۴۰﴾

تفسیر و معارف

اللہ کریم سب کے رازق ہیں:

اللہ کریم فرماتے ہیں، میں جس کو پیدا کرتا ہوں وہ اپنے حصے کا رزق لے کر آتا ہے، تمہیں اس کے رزق کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ

وَاِيَّاكُمْ ۔۔اپنی اولادوں کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو کہ رزق دینے والے ہم ہیں۔ تمہیں رزق دے رہے ہیں تو انہیں بھی رزق دیں گے۔ جسے ہم پیدا کریں گے اُسے روزی بھی دیں گے۔ عربوں میں بیٹیوں کو قتل کرنے کا رواج تھا۔ آج ہمارے عہد میں اس کی یہ صورت ہے کہ منصوبہ بندی کی جاتی ہے تاکہ آبادی میں اضافے کو روکا جائے اور اسی نام پر بچوں کو قتل کیا جائے، ضبطِ تولید کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ورنہ غلہ پورا نہیں ہوگا، سبزیاں اور اناج کہاں سے آئے گا وغیرہ۔

ہم نے گاؤں میں ایسے لوگ بھی دیکھے جو انتہائی مفلس اور نادار تھے پھر اُن کے آٹھ آٹھ، دس دس بیٹے ہو گئے اور وہ کاروبار اور روزگار پہ لگ گئے تو آج وہ گاؤں کے رئیس اور چوہدری بنے ہوئے ہیں۔ کسی گھر کے جتنے زیادہ افراد ہوں اتنے ہی زیادہ کام کرنے والے، کمانے والے ہاتھ ہوں گے تو وہ مفلس گھرانہ بھی امیر ہو جاتا ہے۔ اللہ کریم جس کو پیدا فرماتے ہیں، اس کا رزق اس کے ساتھ بھیجتے ہیں۔ فرمایا، تمہیں بھی تو روزی ہم ہی دے رہے ہیں، جسے پیدا کریں گے اُسے بھی روزی ہم دیں گے۔

ضبطِ تولید:

ضبطِ تولید یہ ہے کہ ایسے اقدامات کیے جائیں کہ بچہ پیدا ہی نہ ہو۔ اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ خاتون کو حمل ہی نہ ہو، اس کے لیے آپریشن بھی کر دیے جاتے ہیں اور دوسرے علاج بھی ہیں۔ لیکن کسی عورت یا مرد کو آپریشن کر کے اولاد پیدا کرنے کا نااہل کر دینا شرعاً حرام ہے اور یہ قتلِ اولاد کے مترادف ہے اور اللہ کی تخلیق میں تصرف ہے۔ علمائے حق فرماتے ہیں کہ اگر عورت کی صحت کے اعتبار سے یا کسی اور شرعی امر کی وجہ سے اولاد نہ چاہیے ہو تو اس کا ایسا عارضی و وقتی تدارک کیا جانا چاہیے کہ کچھ عرصہ خاتون کو حمل نہ ہو تو یہ جائز ہے۔ اس کے پیچھے بھی شرعی اسباب ہونے چاہیے لیکن آپریشن کر کے بالکل بانجھ کر دینا قطعاً حرام ہے اور یہ قتلِ اولاد کے زمرے میں آتا ہے۔

فرمایا: اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾ اولاد کا قتل بہت بڑا گناہ ہے، بہت بھاری جرم ہے۔

اسقاطِ حمل:

اگر کسی خاتون کو حمل ٹھہر جائے تو ایک سو بیس دن کے بعد اللہ کریم اس میں روح ڈال دیتے ہیں۔ روح پیدا ہونے کے بعد اس کا اسقاط صریح قتل ہے۔ ایک سو بیس دن سے پہلے کوئی اسقاط کرتا ہے تو وہ قتل نہیں ہے لیکن گناہ ہے اور سخت جرم ہے چونکہ وہ بے جان لوتھڑا ہے اور ابھی اس میں روح نہیں آئی اس لیے اس کا اسقاط قتل تو نہیں ہے لیکن

شریعت میں اس کی سخت ممانعت ہے، یہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی معتبر ڈاکٹر یا حکیم کوئی ایسی وجہ بتائیں جس سے خاتون کی صحت یا زندگی کو خطرہ لاحق ہو تو ایک آنے والے کی امید پر، جو موجود ہے اس کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگایا جا سکتا اور نہ ہی شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔

عالمِ کفر کی تشویش:

اس وقت اگر آپ پوری دنیا کا جائزہ لیں تو پچھلے دو عشروں میں دنیا کے تمام ممالک میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہوئے اُن کی تعداد دوگنا سے زیادہ ہوگئی ہے۔ اب چونکہ مغرب میں تو خاتون کو اشتہار بنا دیا گیا ہے اور وہ خاتونِ خانہ رہی نہیں اس لیے وہاں کی اکثر خواتین اولاد پیدا کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتیں، ان کے ہاں ولادتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ مسلمان ضبطِ تولید نہیں کرتے لہٰذا اب انہیں یہ تشویش لاحق ہے کہ اگر یہی صورتِ حال رہی تو مزید بیس، پچاس سالوں میں اُن کے ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو جائے گی۔ ملک مسلمانوں کا ہو جائے گا اس لیے ضبطِ تولید کا سارا زور اِدھر ہماری طرف منتقل ہو گیا ہے کہ ان کے بچے پیدا نہیں ہونے چاہیے۔ جس طرح ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام ہوتا ہے اس کے پیچھے بھی یہی وجہ ہے۔ تقسیمِ برِ صغیر کے وقت وہاں دو یا ڈھائی کروڑ مسلمان تھے۔ آج وہاں بائیس کروڑ مسلمان ہیں اور اگر وہ اسی نسبت سے بڑھتے رہے تو خطرہ ہے کہ وہ اقلیت سے اکثریت میں چلے جائیں گے۔ یہ دنیوی بہانے اور اسباب ہیں جس سے قتل کے طریقے ایجاد کیے جاتے ہیں۔

قتلِ اولاد کا ایک اور پہلو:

فرمایا: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾ زنا کے قریب بھی نہ جاؤ کہ یہ بہت بڑی بے حیائی اور بہت ہی بُرا راستہ ہے۔ زانی بھی چونکہ اولاد کا باپ نہیں کہلا سکتا تو زنا بھی قتلِ اولاد کے ضمن میں آ جاتا ہے۔ اس لیے اس کا ذکر ساتھ ہی فرما دیا ہے۔ زانی سے اولاد ہوتی ہے تو چونکہ وہ اس کا باپ تو نہیں کہلا سکتا تو وہ اس بچے کو معاشرے میں بے آسرا چھوڑ دیتا ہے۔ ایسا بچہ ایک کٹی پتنگ کی طرح ہوتا ہے جو پھر خود آوارگی اور برائی میں مبتلا ہو کر پورے معاشرے کی تذلیل کا سبب بنتا ہے۔

زنا کے قریب بھی مت پھٹکو:

زنا اتنا شدید اور گھناؤنا جرم ہے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى ۔۔۔ زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ بات جو مُفْضِيْ اِلَى الزِّنیٰ ہو یعنی زنا کی طرف لے جانے والی ہو، وہ شرعاً حرام

ہے۔ مثلاً نامحرم عورتوں سے باتیں کرنا، نامحرم عورتوں کو دیکھنا یا ان سے تحریر کے ذریعے رابطہ رکھنا وغیرہ جیسے آج کل SOCIAL MEDIA پر عام ہوگیا ہے۔ یہ سب حرام ہے۔ اس کا کوئی شرعی جواز نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے آج گھروں کے گھر تباہ ہو رہے ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں فیس بک پر ہی دوستی کر لیتے ہیں پھر والدین کو مجبور کرتے ہیں اور شادیاں ہوجاتی ہیں۔ پھر وہ ہیجان تو دو چار مہینے میں اتر جاتا ہے اور لڑائیاں شروع ہوجاتی ہیں روز روز کا تماشہ ہوتا ہے اور انجام کار طلاقیں ہوتی ہیں۔

ایسا ہی ایک مسئلہ مجھ سے پوچھا گیا کہ انٹرنیٹ پر دوستی کر کے کسی لڑکی نے شیعہ لڑکے سے شادی کر لی اب طلاق چاہیے تو یہ کیسے ہوتی ہے؟ میں نے کہا کہ جب اس نے شیعہ سے شادی کی تو ہماری طرف سے تو بری ہوگئی۔ اب یہ شیعہ علماء سے پوچھیں کہ طلاق کیسے ہوتی ہے، کیسے نہیں ہوتی۔ جنہوں نے نکاح پڑھایا ہے انہیں طلاق کا بھی پتا ہوگا۔ ہمارے نزدیک تو شیعہ سنی کا نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا تو طلاق کہاں سے آئے گی۔ شیعہ بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ شیعہ سنی کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ دیوبندی اور بریلوی بھی اس بات پر متفق ہیں کہ شیعہ اور سنی کا نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔ اب تم لوگوں نے کر لیا تو پھر بھگتو۔ اب کہتے ہیں کہ آپ راستہ بتائیں۔ میں نے کہا اب ہم کیا بتائیں جہاں گھس گئے ہو انہی سے اب راستہ بھی پوچھو۔ اللہ کریم نے ان چیزوں کو حرام فرمایا ہے، سختی سے منع فرمایا ہے۔

قتل کی حرمت:

فرمایا: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔۔۔اور کسی جان کو جس کا قتل اللہ نے منع کر دیا ہے اُسے قتل نہ کرو ہاں! سوائے اس کے کہ اللہ کی طرف سے اس کے قتل کی اجازت ہو جیسے کسی کو قصاص میں قتل کیا جاتا ہے یا جہاد میں مقابل کو قتل کیا جاتا ہے تو جہاں اللہ کی طرف سے قتال کی اجازت ہو، حق اور انصاف کے ساتھ کیا جائے، وہ درست ہے۔ جہاد میں بھی زیادتی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ جہاد میں بھی پابندیاں ہیں کہ جو تلوار نہیں اٹھاتا اُسے قتل نہ کیا جائے، بوڑھے، بچے اور عورتیں قتل نہ کی جائیں جو عبادت خانوں میں بیٹھے ہیں اُنہیں نہ چھیڑا جائے، فصلیں نہ اجاڑی جائیں، درخت نہ کاٹے جائیں، پانی خراب نہ کیا جائے نہ ہی اس میں زہر ملایا جائے۔ ہاں! جو مقابلے میں لڑتے ہیں وہ قتل کیے جائیں اور وہ قتل ہوتے ہیں تو درست ہے لیکن ناروا کسی کی جان لینے کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ جب تم کسی کو زندگی دے نہیں سکتے تو تمہیں زندگی چھیننے کا اختیار بھی نہیں ہے۔ جو زندگی عطا کرتا ہے واپس لینا بھی اُسی کا حق ہے۔ جس کے قتل کا حکم اللہ کریم دیں اس کا قتل جائز ہے، ورنہ کسی کا قتل جائز نہیں ہے۔

قصاص اور دیت:

جس کو ظلماً قتل کیا جائے اس کے وارثوں کو اللہ کریم نے اختیار دیا ہے کہ وہ قاتل کو بطور سزا بدلے میں قتل کرنا چاہیں تو وہ قصاص لے سکتے ہیں۔ اس صورت میں عدالت یا حکومت اسے قتل کرے گی لہٰذا قتل کرنے میں حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ پوری تحقیق و تفتیش، شہادت اور شرعی قاعدے کے مطابق کام ہونا چاہیے۔ اللہ کریم نے مقتول کے ورثاء کی مدد کی ہے اور انہیں اختیار سونپا ہے کہ قصاص لیں یا اگر وہ دیت لینا چاہیں تو معاوضہ لے کر قاتل کو معاف کر دیں اور اگر چاہیں تو فی سبیل اللہ معاف کر سکتے ہیں، یہ ورثاء کا حق ہے۔

ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف فرما تھے ایک انصاری صحابیؓ بھی بیٹھے ہوئے قرآن کریم کا مطالعہ فرما رہے تھے اور یہی آیۂ مبارکہ زیرِ مطالعہ تھی۔ فرمانے لگے حضرت امیر معاویہؓ، حضرت عثمانؓ کے وارثین میں سے ہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جو احتجاج کر رہے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ آپؓ اختیار و غلبہ حاصل کر لیں گے، انہیں حکومت مل جائے گی۔ یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ کیسے سمجھا؟ فرمایا، یہ آیت بتا رہی ہے کہ جو ظلماً قتل کیا جائے اس کے ورثاء کی اللہ مدد کرتا ہے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ سالوں بعد امیر معاویہؓ کو حکومت مل گئی۔

اللہ کریم کا اپنا ایک نظام ہے۔ اگر کوئی ظلماً قتل ہو جاتا ہے تو اللہ اس کے وارثوں کی مدد فرماتے ہیں۔ کسی کے قتل پر خوش نہیں ہونا چاہیے مجرم کے قتل پر بھی نہیں بلکہ عبرت حاصل کرنی چاہیے دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ کریم ایسے امور سے اپنی پناہ میں رکھیں جن کا یہ انجام ہو۔ اور دوستی اور دشمنی کو ایک حد کے اندر رکھنا چاہیے۔

یتیم کے مال سے بچنا:

فرمایا: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ۔۔۔ دوسروں کے مال پر نگاہ نہ رکھو خصوصاً یتیم کے مال سے دور رہو۔ لفظ یتیم کا اطلاق اس نابالغ بچے پر ہوتا ہے جس کے والد کا انتقال ہو جائے۔ بالغ اولاد کے والد کا انتقال ہو جائے تو وہ یتیم نہیں کہلائے گا بلکہ وہ معاشرے میں برابر کا شریک ہوتا ہے نابالغ بچہ بلوغت سے پہلے یتیم ہوتا ہے۔ ہمارے وطنِ عزیز میں سفید ریش بھی خود کو یتیم بتاتے ہیں۔ اسی طرح لفظ 'مہاجر' کا اطلاق اس پر ہوگا جو ہجرت کر کے دوسری جگہ گیا۔ وطنِ عزیز میں تقسیم ہند کے وقت آنے والوں کی چوتھی نسل بھی کہے کہ وہ مہاجر ہے تو وہ مہاجر کیسے ہوا جبکہ یہیں پیدا ہوا، یہیں کا رہنے والا ہے۔

یتیم چونکہ اپنے مال کو سنبھال نہیں سکتا اور اس کا مال اس کے اختیار میں نہیں بلکہ ورثاء کے اختیار میں ہوتا ہے

لہٰذا اُن کے لیے اس کا مال ہڑپ کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا اس لیے فرمایا، اگر وہ خود آج اس قابل نہیں کہ اپنے مال کی حفاظت کر سکے، دیکھ بھال کر سکے تو اس کا مال ناجائز طریقے سے کوئی نہ لے۔ اس میں ایک عمومی درس بھی ہے۔

اربابِ اختیار کے لیے درس:

اس حکم میں کہ کوئی کسی کا مال ناجائز طریقے سے نہ حاصل کرے یہ عمومی درس ہے کہ کوئی صاحب اختیار و اقتدار غریبوں کو نہ لوٹے۔ ملک کا نظام ایسا نہ ہو جہاں حکمران تو شاہ خرچیاں کریں، عیاشیاں کریں اور ملکی خزانے کو لوٹنے والوں سے تعرض نہ کریں اور غریب عوام پر ہر روز نئے ٹیکس لگائے جائیں۔ مہنگائی حد سے زیادہ ہو جائے تو یہ بھی غریبوں اور بے بسوں کا مال کھانے اور لوٹ مار کرنے کے مترادف ہے۔ یہ سب اسی زمرے میں آتا ہے جیسا یتیم کو لوٹنا، بے بس و بے کس کو لوٹنا ہے۔

فرمایا: اِلَّا بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ حَتّٰی یَبۡلُغَ اَشُدَّہٗ۔۔۔ ہاں! مناسب طریقے سے جو ضروری ہو اور شرعاً جائز ہو نابالغ بچوں کے نگران وہ لے سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے، خود اپنے مال کا وارث بن جائے اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور اپنی مرضی کا مالک بن جائے۔

معاہدوں کی پاسداری:

فرمایا: وَ اَوۡفُوۡا بِالۡعَہۡدِ ۚ اِنَّ الۡعَہۡدَ کَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۳۴﴾ معاہدات کی پاسداری کرنا ضروری ہے جو معاہدے شرعی حدود کے اندر کرتے ہو ان کا پاس کرو اور نبھاؤ۔ جو وعدے کرتے ہو، جو معاملات طے کرتے ہو ان پر عمل کرو۔ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ پوری دیانت سے اسے نبھائے اس لیے کہ اس کے بارے سوال ہوگا کہ تم نے کسی سے معاہدہ کر کے اسے دھوکا کیوں دیا یا معاہدہ کیوں توڑا۔ معاہدات میں ایک بنیادی شرط ہے کہ خلافِ شریعت کوئی معاہدہ نہیں کیا جائے گا البتہ اگر کوئی معاہدہ ہو گیا اور بعد میں پتا چلا کہ یہ خلافِ شریعت ہے تو دوسرے فریق کو بھی بتا دیا جائے اور معاہدے کو کالعدم قرار دے کر ختم کر دیا جائے۔ شرعی دائرے کے اندر کیے گئے معاہدوں پر پوری دیانتداری سے عمل کرو اس لیے کہ قیامت کے روز معاہدات اور وعدے وعید کے بارے سوال کیا جائے گا۔

لین دین میں دیانت داری:

فرمایا: وَ اَوۡفُوا الۡکَیۡلَ اِذَا کِلۡتُمۡ وَ زِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِیۡمِ۔۔۔ اور تم جب کسی چیز کا ناپ تول کرتے ہو تو پورا پورا کرو۔ یہ ساری معاشی اصلاحات ہیں کہ لین دین میں دیانت داری سے کام

لو۔ مال دیتے ہوئے خریدار کو جو کوالٹی (Quality) دکھائی ہے وہی دو اور تعداد بھی صحیح دو۔ قیمت لیتے ہو تو دیانت داری سے منڈی کی قیمت کے مطابق حاصل کرو، کسی کی مجبوری کا فائدہ نہ اٹھاؤ۔ اور مقدار تولتے ہوئے ترازو کو برابر رکھ کر تولو۔ تول میں کمی بیشی نہ کرو۔ جب ملازمت پیشہ افراد اپنے کام کی تنخواہ لیں لیکن کام پورا نہ کریں تو یہ بھی ناپ تول میں کمی کے زمرے میں آتا ہے جب مزدور مزدوری تو پوری وصول کرے لیکن کام میں سستی یا جان بوجھ کر غفلت اور کوتاہی کرے تو اس پر بھی ڈنڈی مارنے کا اطلاق ہوتا ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اپنا حق پورا لو اور دوسرے کا حق بھی پورا ادا کرو، انصاف کرو، پورا تولو۔ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾ یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا انجام اور نتیجہ بھی بہت اچھا ہے۔ انصاف کرو گے، اچھا کرو گے، درست کرو گے تو اس کا نتیجہ صحیح آئے گا، درست آئے گا۔ مفید اور منافع بخش آئے گا۔

سنی سنائی باتوں پر توجہ نہ دیں:

فرمایا: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔۔۔ جن باتوں کی آپ کو خبر نہیں ان کے پیچھے مت پڑیں۔ کوئی بات سنی اور اس کے پیچھے اُٹھ دوڑے۔ کوئی شخص آ کر یہ کہتا ہے کہ فلاں آدمی نے آپ کو بُرا کہا ہے تو غور کر لیں کہ کیا واقعی ایسا ہوا! کہنے والے کی شخصیت کیسی ہے، کیا قابل اعتبار ہے؟ فرمایا جا رہا ہے کہ سنی سنائی باتوں پر بغیر تحقیق کے یقین نہ کریں جن باتوں کا حقیقتاً علم نہ ہو ان کے پیچھے مت بھاگیں۔ آپ دیکھ لیجیے جب ہم سنی سنائی باتوں پر فیصلے کرتے ہیں تو گھروں کے گھر اجڑ جاتے ہیں۔ خاندانوں کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے کتنی خوبصورتی سے خاندانوں اور معاشرے کی تباہی کی وجوہات کی نشاندہی کر دی ہے۔

معاشرے میں خرابی پھیلنے کا سبب:

اگر ہم دیکھیں کہ معاشرے میں کہاں اور کیسے خرابی پیدا ہوتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ ایسا تب ہوتا ہے جب ہم دوسروں کے حقوق روکتے ہیں۔ والدین، رشتہ داروں، عزیزوں، غرباء و مساکین، مسافروں کے حقوق جب ادا نہیں کیے جاتے تو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جہاں ہم اعمال و کردار میں بے اعتدالی پیدا کرتے ہیں، اولاد کو قتل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، زنا کی طرف راغب ہوتے ہیں تو پورے معاشرے میں بے حیائی اور خرابی کا طوفان آ جاتا ہے۔ جب ہم ناپ تول میں کمی بیشی کرتے ہیں، لین دین میں، معاملات میں کھرے نہیں رہتے تو پورے معاشرے میں زلزلہ آ جاتا ہے جو اس کی بنیادیں ہلا دیتا ہے۔

اسی لیے قرآن کریم نے ان کاموں سے بہت سختی سے روکا ہے کہ یہ گھروں، خاندانوں اور آخر کار

معاشرے کی تباہی کا سبب بنتے ہیں۔

ناجائز حیلے کرنا حرام ہے:

کتنی عجیب بات ہے کہ ہم اللہ کی کتاب اور اس کے احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو ماننے کی بجائے تاویلیں تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ حیلے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ نہ کرنے کا کوئی جواز ملے۔ تعمیلِ ارشاد کی بجائے اس سے نکلنے کے راستے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اب سود کو ہی لے لیجیے کہ اللہ نے اسے حرام کیا ہے۔ ہمارے ہاں اس کا نام بدل کر لیا اور دیا جاتا ہے۔ میں تو سود کے حق میں نہیں ہوں اور یہ اللہ کا احسان ہے کہ نصف صدی سے زائد عرصہ بیت گیا، بینکوں سے بھی واسطہ پڑتا رہا، لیکن نہ کبھی سود لیا نہ قرضہ لیا کہ سود دینا پڑے۔ کسی نے خط لکھ کر سوال پوچھا کہ ایک اسلامی بینک کی مضاربہ اسکیم ہے جس میں پانچ چھ قسم کے مضاربہ ہیں اور بہت سے مفتیانِ کرام نے فتوے دیے ہیں کہ اس کی آمدن حلال ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا کہ تمہارا بینک کیا کرتا ہے۔ اب بات صرف اتنی ہے کہ تم پیسے لینا چاہتے ہو اور یہ بھی چاہتے ہو کہ کوئی کہہ دے کہ سود حلال ہے۔ بھئی ایسا کون کہہ سکتا ہے۔ کم از کم میں تو نہیں کہہ سکتا۔ کسی ایسے مولوی کو لکھو جو فتویٰ فروش ہو، وہاں سے فتویٰ لے لو لیکن کیا تم سود کھائے بغیر رہ نہیں سکتے؟ کیسی عجیب بات ہے ماننے کی بجائے تاویلیں گھڑنے کو تیار ہو کہ اس طرح جائز ہے، اُس طرح جائز ہے۔ خط میں لکھا تھا کہ جن مفتیانِ کرام نے اس کے حق میں فتوے دیے ہیں وہ بین الاقوامی شہرت یافتہ علماء ہیں۔ میں نے لکھا کہ تمہاری مرضی کہ تم مان لو اور قیامت کے روز ان بین الاقوامی علماء کو جوابدہی کے وقت ساتھ لے جانا اس وقت تو وہ بھاگیں گے۔ اور چونکہ وہ تو مولوی ہیں وہ اور تاویلیں گھڑیں گے کہ ہم نے ایسے نہیں، ایسے کہا تھا پھر تم کیا کرو گے؟ پتا نہیں لوگ کیوں جواز ڈھونڈتے ہیں، اور سود کھانا کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟

پاکستان کا بینکنگ نظام:

پاکستان میں بینکنگ سسٹم کا کوئی بھی نام رکھ لیں، اس میں اکیاون فیصد (51%) حصہ قومی بینک کا ہوتا ہے اور 49% اس بینک کا۔ سادہ سا اصول ہے کہ ہمارے قومی بینک کی ساری بنیاد سود پر استوار ہے اور اس کی نصف سے زیادہ شراکت ہر بینک میں ہے۔ آدھا تالاب ناپاک، آدھا پاک کیسے ہو سکتا ہے؟ آج بھی جتنے بینک ہیں سب کا یہی حال ہے۔ اس کا نام آپ کچھ بھی رکھ دیں سب کو قومی بینک ہدایات دیتا ہے کہ انہوں نے کب کتنے فیصد منافع دینا ہے۔ پھر اس میں حلال کا کیا جواز ہے؟ ہم نے اپنا بینک بنانے کی کوشش کی لیکن اس لیے ارادہ ترک کر دیا کہ شرط یہ تھی کہ اس میں قومی بینک کو 51% حصہ کا شریک کرنا پڑے گا۔ تو جب 51% سود ہوگا تو پھر 49% حلال کہاں سے

رہے گا۔ سادہ سی بات ہے کہتے ہیں کتا کھالو اس کا نام بکرا رکھ دو۔

حصولِ علم کے ذرائع:

فرمایا: اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا ۝ یاد رکھو تم جو علم بھی حاصل کرتے ہو اس کے ذرائع تین ہیں۔ علم کے ذرائع تین ہیں۔ سمع، بصر اور فواد۔ سمع، قوتِ سماعت کو کہتے ہیں۔ بچہ پٹھانوں کے گھر پیدا ہوتا ہے تو پشتو میں بات کرنے لگتا ہے، پنجابی کے گھر پیدا ہوتا ہے تو سُن کر پنجابی بولتا ہے، اردو بولنے والوں کے گھر پیدا ہوتا ہے تو اردو میں بات کرتا ہے، انگریز کے گھر پیدا ہوتا ہے تو انگریزی میں بات کرتا ہے۔ بچہ جہاں بھی پیدا ہو وہ پہلے سے تو سیکھ کر نہیں آتا بلکہ والدین سے سن کر سیکھتا ہے جو والدین کی زبان ہے وہی بچے کی زبان ہوتی ہے۔

علم کے حصول کا دوسرا ذریعہ، بصر یعنی آنکھ ہے۔ تمام علومِ ظاہری کو حاصل کرنے کے لیے صرف دو ذریعے ہیں۔ آدمی سن کر سیکھتا ہے یا دیکھ کر سیکھتا ہے۔ ایک بات قابلِ غور ہے وہ یہ کہ کتابیں لکھنا، پڑھنا یعنی یہ لکھنا پڑھنا علم نہیں ہے بلکہ علم کو محفوظ کرنے کا فن ہے، ذریعہ ہے۔ لکھنا خود علم نہیں بلکہ وہ معلومات جو آپ کے پاس ہیں، انہیں آگے منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔ آپ انہیں ایک زبان میں لکھ دیتے ہیں۔ آپ کے بعد میں آنے والا اس کو پڑھ کر ان معلومات سے باخبر ہو جاتا ہے لیکن سیکھنے کے لیے دو ہی ذرائع ہیں سننا اور دیکھنا۔ تمام صحابہ کرامؓ تو لکھنا نہیں جانتے تھے، انہوں نے جو سیکھا حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر سیکھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر سیکھا۔ صحابہ کرامؓ کے علم کا وہ مرتبہ ہے کہ ساری دنیا کے علماء بھی جمع ہو جائیں اور کوئی رائے دیں اور اس کے مقابل کسی صحابیؓ کا قول آجائے تو سب سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں کہ صحابہؓ کی بات اصح ہے۔ کیا صحابہؓ ان علماء سے زیادہ پڑھے لکھے تھے؟ نہیں البتہ وہ عالم تھے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سن کر اور دیکھ کر سیکھا تھا۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ میں قیامت کے روز پوچھوں گا کہ تم نے اپنی قوتِ سماعت کو کہاں استعمال کیا، قوتِ بصارت کو کہاں استعمال کیا، ان سے حق سیکھا یا ناحق، عدل سیکھا یا ظلم، عدالت سیکھی یا ناانصافی؟ حصولِ علم کا تیسرا ذریعہ ہے وَالۡفُؤَادَ۔ فواد لطیفہء قلب کو کہتے ہیں۔ جس طرح دل کو انگریزی میں (HEART) کہتے ہیں، فواد کو انگریزی میں (SUBTLE HEART) کہتے ہیں۔ مادّی وجود کا حصہ دل ایک پمپنگ مشین (PUMPING MACHINE) ہے، یہ تو سامنے ہے۔ اس کے اندر ایک نقطہ جسے فواد کہتے ہیں یہ لطیفہء ربانی ہے جو عالمِ اَمر سے ہے۔ یہ صرف انسان کو ودیعت کیا گیا ہے، کسی دوسرے ذی حیات میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

صرف انسان کو نبوت عطا ہوئی ہے کسی دوسری مخلوق کو نہیں۔ یہ سمع و بصر تو سمجھ آتی ہے کہ ہم زندگی گزارنے کے گُر سیکھتے ہیں، مادّی علوم سیکھتے ہیں، چیزیں بنانا سیکھتے ہیں انہیں استعمال کرنا سیکھتے ہیں۔ فوأد کس کام آتا ہے؟ اس کا تذکرہ سمع و بصر کے ساتھ کیا گیا ہے، آخر یہ کس کام آتا ہے؟ فوأد معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کے کام آتا ہے۔ فوأد میں قوت ہے کہ وہ برکاتِ نبوت اخذ کرتا ہے، اگلی زندگی کے اسباب مہیا کرتا ہے اور اس زندگی کو بھی سیدھا کر دیتا ہے۔ انسان کے برے عمل پر اسے احساس دلاتا ہے کہ یہ عمل اگلی زندگی کو بھی متاثر کرے گا، خراب کرے گا اور انسان کے نیک عمل پر بشاشت دیتا ہے کہ اس کا یہ عمل اگلی زندگی میں بہتری پیدا کرے گا۔ مقامِ افسوس ہے کہ آج اکثریت ان لوگوں کی ہے جنھوں نے زندگی بھر لطیفہء قلب کا نام ہی نہیں سنا اور اسے جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جانوروں کی طرح پیٹ بھرا، بچے پیدا کیے اور مر گئے۔ اکبر الٰہ آبادی نے کیا خواب کہا تھا:

کیا کہیں احباب کیا کار ہائے نمایاں کر گئے
بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے

اکثریت کی ساری زندگی سمع و بصر میں گزر جاتی ہے۔ مخلوق میں سے کتنے لوگ ہیں جنھوں نے کبھی فوأد کی طرف توجہ بھی کی ہو! اصل ذریعہء علم فوأد ہے جو حقیقتِ حال کا علم دیتا ہے۔ فوأد الٰہیات کا علم حاصل کرتا ہے، آخرت کے علوم حاصل کرتا ہے، عالمِ امر کے علوم حاصل کرتا ہے۔ فوأد ہی وہ ذریعہ ہے جو برکاتِ نبوت حاصل کرتا ہے اور جو انوارات الٰہی کو جذب کرتا ہے۔ فرمایا، یہ پوچھا جائے گا کہ سماعت کہاں استعمال ہوئی، بصارت سے کیا فائدہ حاصل کیا اور فوأد جو لطیفہء قلب تمھیں عطا کیا تھا، اس کو کہاں استعمال کیا، اس سے کتنا استفادہ کیا اور اس سے کیا حاصل کیا؟ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴿٣٦﴾ ان سب چیزوں کے بارے پوچھا جائے گا، پرسش ہوگی، حساب ہوگا۔ چونکہ دنیا کی زندگی، مادّی زندگی ہے، وجود بھی مادّی ہے، دماغ بھی مادّی ہے۔ سمع و بصارت کا تعلق بھی مادّی حواس سے ہے اس لیے ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق مادّی علوم کو حاصل کر لیتا ہے۔ کوئی فاضل بھی بن جاتا ہے ورنہ زندگی گزارنے کے علوم تو سارے حاصل کر لیتے ہیں۔ کھانا، پہننا، سونا جاگنا، بچے پالنا، زندگی گزارنا، یہ سب لوگ ہی سیکھ جاتے ہیں ذرا یہ غور فرمائیں کہ کتنے لوگ ہیں جنھوں نے فوأد کو بھی استعمال کیا ہو جو حقیقی علم کے حصول کا ذریعہ ہے بلکہ سمع بصر تو اس سے کم تر ہیں کہ یہ مادّی علوم حاصل کرتے ہیں اور فوأد اعلیٰ ہے کہ علوم الٰہیات حاصل کرتا ہے فرمایا، قیامت کے روز سماعت، بصارت اور لطیفہء قلب یعنی فوأد کا محاسبہ ہوگا کہ آپ نے ان ذرائع علوم سے کیا سیکھا اور اس پر کیا عمل کیا؟

اللہ کریم کا بہت بڑا احسان ہے اس بندے پر، جسے آج کے مادّی دور کی ظلمتوں میں فوأد کا احساس عطا کر

دے اور وہ اس ذریعہء علم سے استفادہ کرے۔ سمع و بصر تو کھانے پینے سونے جاگنے کے ڈھنگ ہی بتاتے ہیں اس سے آگے نہیں جاتے جبکہ الٰہیات کے علوم فواٗد سے حاصل ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک نگاہ میں صحابیؓ بن گئے اس لیے کہ انہوں نے قلب یعنی فواد کے ذریعے برکات حاصل کیں۔ تابعین، تبع تابعین اس لیے خیر القرون کہلائے کہ فواٗد نے برکات حاصل کیں۔ آج تک اللہ کا بندہ وہی بن سکا جس کا لطیفہء قلب روشن ہوا، جس کے فواٗد نے برکات حاصل کیں۔ جس کو زندگی میں اللہ کریم یہ توفیق دے دیں کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہو جائے تو یہ اللہ کریم کا بہت بڑا احسان ہے کہ فواٗد باطنی علوم کے حصول کا ذریعہ ہے، لطیفہء ربانی ہے جو عالم امر سے ہے اور یہ شرف صرف انسان کو حاصل ہے کہ اس کے دل میں علومِ الٰہیات حاصل کرنے کا یہ آلہ رکھا گیا ہے۔ فرمایا، جب یہ ذرائع علوم عطا ہوئے اور انہیں استعمال کرنے کی توفیق اور مہلت بھی بخشی گئی تو پھر ان کا حساب بھی ہوگا۔

تکبّر فساد کی بنیاد ہے:

فرمایا: وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ﴿٣٧﴾ زمین پر اترا اترا کر اور اکڑ کر مت چلو، تمہارے اکڑ کے چلنے سے زمین پھٹ نہیں جائے گی یعنی متکبرانہ چال نہ چلو بلکہ مناسب اور شریفانہ انداز اختیار کرو اور نہ ہی اکڑنے سے تم پہاڑوں سے بلند ہو جاؤ گے۔ تم سے تو پہاڑ بھی اونچے کھڑے ہیں اور اونچا کھڑا ہونا یا اکڑنا کوئی بڑی بات نہیں ہے اور تمہارے اکڑنے اور اترا اترا کر چلنے سے زمین پھٹ نہیں جائے گی۔ صرف انسان کا اپنا مزاج متاثر ہوگا اور تکبر کے اظہار کا کوئی بھی انداز اللہ کریم کو پسند نہیں۔ متکبرانہ انداز سے معاشرے میں بھی بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور فساد کی بنیاد پڑتی ہے۔ اکڑ کر چلنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ایک بندے نے جانا ہے اور پچاس گاڑیاں اس کے آگے اور پچاس پیچھے ہیں اور باقی مخلوق کا راستہ بند ہے۔ یہ ساری صورتیں زمین پر اکڑ کر چلنے میں شامل ہیں۔ انسان کو اپنی عاجزی اور کمزوری کا احساس رہنا چاہیے۔ دولت، طاقت اور اختیار و اقتدار کامل جانا وقتی باتیں ہیں۔ بڑے بڑے طاقتور کمزور ہو جاتے ہیں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ بے حد دولت مند، بھوکے ہو جاتے ہیں، صاحب اقتدار معزول ہو جاتے ہیں اور حکمران قیدی بھی بن جاتے ہیں۔ یہ چیزیں آنے جانے والی ہیں لہٰذا ان پر تکبر نہیں کرنا چاہیے اور نہ اکڑنا چاہیے۔

فرمایا: كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِندَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا ﴿٣٨﴾ ان سب باتوں کی برائی اللہ کے ہاں سخت ناپسندیدہ ہے۔

قرآن خوبصورت معاشرہ تشکیل فرماتا ہے:

یہ اخلاقیات جو قرآن نے ارشاد فرمائے ہیں، اگر معاشرہ ان پر استوار ہو تو کیسا خوبصورت معاشرہ ہو۔ اُن تمام رویّوں کی نشاندہی کی گئی جو معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں چنانچہ فضول خرچی اور کنجوسی دونوں سے منع کر دیا گیا۔ حلال اور جائز ذرائع سے دولت حاصل کرنے کا حکم دیا گیا اور جائز مقامات پر مناسب طریقے سے خرچ کرنے کا حکم دیا گیا۔ افلاس کے ڈر سے قتلِ اولاد، سے روکا گیا۔ بدکاری کے قریب بھی نہ جانے کا حکم دیا گیا۔ محبت اور دشمنی میں اعتدال قائم رکھنے کا حکم دیا گیا۔ قتل ناحق سے روک دیا گیا اور یتیم و کمزور کا مال ناجائز طریقے سے کھانے سے منع کر دیا گیا۔ آپس میں شریعت کے مطابق کیے گئے معاہدے، وعدے پورے کرنے کا حکم دیا گیا اور ناپ تول میں کسی قسم کی کمی کرنے سے منع کر دیا گیا۔ سنی سنائی باتوں کی پیروی کرنے سے، جن باتوں کی حقیقت معلوم نہ ہو اُن کے پیچھے چلنے سے، محض سنی سنائی باتوں پر طوفان کھڑا کر دینے سے منع فرما دیا گیا۔ اور علم حاصل کرنے کے ذرائع یعنی سمع، بصر اور فوأد کے محاسبہ کی خبر دے دی گئی۔ ان ہدایات پر عمل کرنے سے کتنا خوبصورت معاشرہ تشکیل پائے گا۔ اس لیے فرمایا: ذٰلِكَ مِمَّآ اَوۡحٰۤى اِلَيۡكَ رَبُّكَ مِنَ الۡحِكۡمَةِ ۔۔۔ یہ دانائی کی باتیں ہیں جو تمہارے ربّ نے تمہیں تعلیم فرمائی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے صرف یہ احکام پہنچائے ہی نہیں بلکہ ان پر ایک معاشرہ، ایک ریاست تعمیر فرمائی، اور چشم عالم کو دکھا دیا کہ یہ مثالی معاشرہ ہے۔

شرک جہنم لے جائے گا:

فرمایا: وَلَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلۡقٰى فِىۡ جَهَنَّمَ مَلُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ﴿۳۹﴾ کبھی بھی، کسی بھی حال میں اللہ کا شریک نہ بناؤ۔ کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ذات یا صفات میں اللہ کے ساتھ شراکت کی استعداد رکھتا ہو۔ وہ اپنی ذات میں بھی اور صفات میں بھی واحد و لاشریک ہے، بے مِثل ہے، بے مثال ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (سورۃ الاخلاص 1) اللہ احد ہے۔ احد اس اکائی کو کہتے ہیں جو غیر منقسم ہوتی ہے، جسے آگے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ واحد، ایک انگلی کو بھی واحد کہہ سکتے ہیں لیکن اس میں بہت سے اجزاء ہیں۔ اس میں کھال ہے، گوشت ہے، مختلف ہڈیاں ہیں، رگیں ہیں، چھوٹی بڑی نسیں ہیں، خون ہے بہت سے اجزاء سے بنی ہے۔ انگلی واحد ہے اور واحد کو پھر ٹکڑے کیا جا سکتا ہے لیکن احد ایسی اکائی ہے جو آگے تقسیم نہیں ہو سکتی قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اللہ ایک ایسی ذات ہے جس کا کوئی شریک، کوئی حصہ دار نہیں، کوئی اس جیسا نہیں ہے، ذات میں نہ صفات میں۔ انسان کے مزاج میں کمزوری ہے، جب یہ بحرِ حیات میں، زندگی کے اس تلاطم خیز سمندر میں وقت گزارتا ہے تو ذرا سی مشکل آ جانے پر بے پناہ سہارے تلاش کرتا ہے، کبھی ایک در پر کبھی دوسرے

پر۔ جیسے اردو زبان کا محاورہ ہے کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کہ اگر کوئی ڈوب رہا ہو اور اسے تنکا بھی نظر آ جائے تو اُسے بھی پکڑنے کی کوشش کرتا ہے کہ شاید اس کے سہارے بچ جاؤں حالانکہ وہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ تنکا اس کی کیا مدد کرے گا۔ فرمایا، ہر مشکل کا حل اللہ کریم کے پاس ہے، ہر حال میں اس واحد و لاشریک پر بھروسہ کرو، اسی کو پکارو اور خلوصِ دل سے اللہ کی اطاعت کرو۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، ذات میں یا صفات میں ایک ایسا جرم ہے کہ یہ اکیلا ہی بندے کو ذلیل و رسوا کر کے جہنم میں پھینکنے کے لیے کافی ہے۔ یوں تو ہر برائی جہنم کی طرف لے جاتی ہے، ہر برائی گمراہی ہے، ہر بدعت گمراہی ہے اور گمراہی جہنم میں جائے گی لیکن اللہ کی ذات یا صفات میں شرک کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کا مرتکب نیکی کر ہی نہیں سکتا۔ کوئی اچھا کام کرے بھی تو وہ مقبول نہیں ہوتا کیونکہ اس نے خالصتاً اللہ کے لیے تو کیا نہیں ہوتا۔ اللہ کے ساتھ تو اس نے شریک بنائے ہوتے ہیں لہٰذا یہ جرم ہی بندے کو دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ میں ذِلت و رسوائی کے ساتھ پھینکنے کا سبب بن جاتا ہے۔ لہٰذا تاکیداً کہا گیا کہ اس کی طرف مت جاؤ۔

باطل عقائد عقل کو بھی اندھا کر دیتے ہیں:

کافرانہ عقائد شرعی اعتبار سے تو باطل ہوتے ہی ہیں، عقلی اعتبار سے بھی باطل ہوتے ہیں۔ مشرکین مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔ فرمایا: اَفَاَصۡفٰکُمۡ رَبُّکُمۡ بِالۡبَنِیۡنَ وَ اتَّخَذَ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنَاثًا۔۔۔ کیا تمہارے پروردگار نے تم کو تو لڑکے چن کر دیے ہیں اور اپنے لیے فرشتوں کو بیٹیاں بنایا ہے؟ تمہارا یہ عقیدہ تو عقلاً بھی باطل ہے کہ ایک طرف یہ مانتے ہو کہ اولاد اللہ دیتا ہے پھر تم اپنے لیے بیٹے پسند کرتے ہو اور یہ مانتے ہو کہ تمہیں بیٹے اللہ ہی دیتا ہے۔ اور اگر تمہیں بیٹی دے دے تو تم منہ لٹکا کر بیٹھ جاتے ہو، بیٹی کو پسند نہیں کرتے بلکہ اس سے جان چھڑانے پر تُل جاتے اور قتل کرنے کے درپے ہو جاتے ہو اور اللہ کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہو۔ تم کیسی عجیب بات کرتے ہو۔

حق یہ ہے کہ اللہ جو کچھ بھی بناتا ہے وہ اس کی مخلوق ہے اور اولاد ذات سے الگ نہیں ہوتی بلکہ ذات کا حصّہ ہوتی ہے جیسے انسان کا بچہ انسان ہوتا ہے، ہر جانور کا بچہ ویسا ہی جانور ہوتا ہے، تمام خصوصیات و صفات کا حامل ہوتا ہے۔ اگر (معاذ اللہ) اللہ کی اولاد ہوتی تو وہ بھی اللہ ہوتی، اس میں بھی الوہیت کی صفات ہوتیں۔ حق تو یہ ہے کہ اِلٰہ تو ایک ہی ہے، وحدہٗ لاشریک ہے نہ اس کے والدین ہیں نہ کوئی اولاد ہے نہ ہی اس جیسا کوئی دوسرا ہے۔ وہ ایک اکائی ہے جو غیر منقسم ہے اور تم ایسے بے وقوف ہو کہ اپنے لیے بیٹے پسند کرتے ہو اور اللہ کے لیے بیٹیاں پسند کرتے ہو۔ اِنَّکُمۡ لَتَقُوۡلُوۡنَ قَوۡلًا عَظِیۡمًا ۝ تم ایسی باتیں کہہ کر بہت ہی بڑی جرأت کر رہے ہو۔ کل جب اللہ کی بارگاہ میں پیش ہو گے تو سمجھ آئے گی۔

سورۂ بنی اسرآءیل رکوع 5 آیات 41 تا 52

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا یَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِی الْعَرْشِ سَبِیْلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِیْرًا ﴿۴۳﴾ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَكَ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَفِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ یَسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾ اُنْظُرْ كَیْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا ﴿۴۸﴾ وَقَالُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِیْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا یَكْبُرُ فِیْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَیَقُوْلُوْنَ مَنْ یُّعِیْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِیْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَیُنْغِضُوْنَ اِلَیْكَ رُءُوْسَهُمْ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ؕ قُلْ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ قَرِیْبًا ﴿۵۱﴾ یَوْمَ یَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۵۲﴾

اور بے شک ہم نے اس قرآن میں کئی طرح سے بیان فرمایا تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں مگر ان کی (اس بات سے) اور نفرت ہی بڑھتی جاتی ہے ﴿۴۱﴾ فرما دیجیے اگر اس (اللہ) کے ساتھ اور معبود ہوتے جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو وہ ضرور عرش کے مالک کی طرف (لڑائی کے لیے) راستہ نکالتے ﴿۴۲﴾ وہ (اللہ) پاک ہے اور جو کچھ یہ کہتے ہیں وہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے ﴿۴۳﴾ ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہیں (سب) اُس کی پاکی بیان کررہے ہیں اور کوئی ایسی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے ولیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ۔ بے شک وہ (اللہ) بڑے بردبار (اور) بخشنے والے ہیں ﴿۴۴﴾ اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے درمیان ایک پردہ چھپا ہوا حائل کر دیتے ہیں ﴿۴۵﴾ اور ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ وہ اس کو (اس کے مفہوم کو) سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں ثِقل (بوجھ) ڈال دیتے ہیں اور جب آپ قرآن میں اپنے پروردگار یکتا کا ذکر فرماتے ہیں تو یہ لوگ نفرت سے پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں ﴿۴۶﴾ جس وقت یہ لوگ آپ کی طرف کان لگاتے ہیں تو ہم خوب جانتے ہیں جس غرض سے یہ سنتے ہیں اور جب یہ لوگ سرگوشیاں کرتے ہیں (یعنی) جب یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم ایک ایسے شخص کی پیروی کر رہے ہو جس پر جادو کا اثر ہو گیا ہے ﴿۴۷﴾ دیکھیے انہوں نے آپ کے بارے میں کیسی کیسی باتیں بنائی ہیں سو یہ گمراہ ہو رہے ہیں پس راستہ نہیں پا سکتے ﴿۴۸﴾ اور کہتے ہیں جب ہم (بوسیدہ) ہڈیاں اور چُور چُور ہو جائیں گے تو کیا نئے سرے سے پیدا ہو کر اٹھیں گے ﴿۴۹﴾ فرما دیجیے کہ تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا ﴿۵۰﴾ یا کوئی ایسی چیز جو تمہارے نزدیک اس سے بھی سخت ہو پھر اس پر کہیں گے وہ کون ہے جو ہم کو لوٹائے گا (دوبارہ زندہ کرے گا) آپ فرما دیجیے کہ وہ وہی (اللہ) ہے جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا پھر آپ کے آگے اپنے سر ہلائیں گے اور

کہیں گے کہ ایسا کب ہوگا فرما دیجیے امید ہے کہ جلد ہوگا ﴿۵۱﴾ جس روز وہ (اللہ)
تم کو پکارے گا پس تم اُس کی حمد کرتے ہوئے (اضطراراً اُس کے) حکم کی تعمیل کرو
گے اور تم خیال کرو گے کہ تم (دنیا میں) بہت تھوڑا عرصہ رہے ﴿۵۲﴾

تفسیر و معارف

قرآن نصیحت ہے:

فرمایا: وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِیَذَّکَّرُوۡا۔۔۔قرآن کریم نے زندگی کے ہر موضوع پر روشنی ڈالی ہے اور ہر معاملے میں سیدھے راستے اور صحیح رویوں کی طرف راہنمائی فرمائی ہے۔قرآن کریم کے نزول کا مقصد ہی یہ ہے کہ لِیَذَّکَّرُوۡا۔۔۔لوگ نصیحت حاصل کریں اور اس پر عمل کریں۔فرمایا، نزولِ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ اس میں ہم نے ہر امر کی راہنمائی فرما دی تا کہ تم نصیحت حاصل کرو تا کہ تم اس پر عمل کرو۔قرآن کریم کو روز پڑھو، تھوڑا یا زیادہ مگر روز پڑھو، اس کے معنی سمجھو، اس کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اس کے مطابق اپنی راہِ عمل مرتب کرو اور اسے اپنی زندگی کا نصاب بنالو۔یہ نصابِ حیات ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ہم مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوئے۔الحمدللہ، کلمہ طیبہ نصیب ہوا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے ہیں، اللہ قبول فرمائیں لیکن ہمارا رویہ یہ ہے کہ ہم روز مرّہ کے امور میں عمل کرنے کے لیے کم ہی قرآن پڑھتے ہیں۔اوّل تو کوئی پڑھتا ہی نہیں اور جو پڑھتا ہے وہ صرف رٹا لگائے جاتا ہے اور اسی فکر میں رہتا ہے کہ قرآن کے کتنے ختم ہو گئے۔یا کوئی بیمار ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ اتنے قرآن ختم کرلو یا کوئی مر جائے تو قرآن کریم کا ختم کروالیا جاتا ہے جبکہ قرآن کریم تو زندوں کے لیے نصابِ حیات ہے۔

بدنصیبی:

فرمایا: وَمَا یَزِیۡدُهُمۡ اِلَّا نُفُوۡرًا ﴿۴۱﴾ لیکن کفر ایسی مصیبت ہے کہ جو ایمان سے محروم ہیں وہ جب قرآن سنتے یا پڑھتے ہیں تو اُن کی نفرت مزید بڑھ جاتی ہے، یعنی اسبابِ ہدایت اُن کے لیے الٹ جاتے ہیں۔کفر، گناہ اور بدکاری کی زندگی ایک ایسی مصیبت ہے جس میں حصولِ علم کے ذرائع بھی الٹ جاتے ہیں اور لوگ برائی کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں اور بھلائی انہیں کڑوی لگتی ہے یہ ایسے بدنصیب ہیں کہ قرآن جیسی کتاب ہدایت پڑھ کر بھی قرآن کے لیے ان

کی نفرت میں زیادتی ہوتی ہے۔ وہ اس سے فائدہ حاصل کرنے کے بجائے اس سے دور بھاگتے ہیں۔ فرمایا، ان کافروں سے ذرا فرما دیجیے : قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ کہ اگر اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی شریک ہوتا، ذات میں یا صفات میں، کوئی اور اللہ بھی ہوتا تو وہ بھی نظامِ کائنات میں دخل اندازی کرتا بلکہ وہ تو عرشِ عظیم پر چڑھ دوڑتا اور سلطنت چھیننے کی کوشش کرتا۔ کہیں سورج کے طلوع وغروب میں اختلاف کرتا، کہیں سورج یا چاند کے گھٹانے بڑھانے میں اختلاف کرتا۔ کہیں گرمی سردی کے آنے جانے میں، کہیں بارش برسنے میں، ہواؤں کے چلنے میں، مخلوق کے پیدا کرنے میں، کہیں کوئی اختلاف کرتا۔ کوئی ایسا ہوتا جو روک دیتا کہ نہیں یہ اس طرح نہیں اس طرح ہوگا۔ اگر دو صاحبِ اقتدار ہوں تو کوئی صاحبِ اقتدار دوسرے کی غلامی نہیں کرتا بلکہ دونوں اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔ اگر اللہ کے ساتھ بھی کوئی شریک ہوتا تو وہ اپنی من مانی کرتا جبکہ حق یہ ہے کہ اپنی تخلیق سے لے کر اب تک یہ کائنات ایک ہی ہستی کے حکم کے مطابق چل رہی ہے۔ اس کے نظام میں خلل ڈالنے والا، اسے روکنے والا آج بھی کوئی نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا شریک، اس جیسا معبود کوئی اور ہے ہی نہیں۔

عظمتِ الٰہی :

فرمایا: سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾ اللہ پاک ہے، بہت بلند ہے، اُن باتوں اور کاموں سے جو تم کرتے ہو یعنی اس کی ذات اور صفات میں اس کے ساتھ جو شرک کرتے ہو، جو باتیں تم بناتے ہو وہ تو محض تمہارے کہنے کی باتیں ہیں جبکہ عظمتِ الٰہی ان سے بہت بلند ہے۔ اللہ واحد ہے، احد ہے، لاشریک ہے۔ بے مثل و بے مثال ہے اور ساری مخلوق کا پروردگار ہے، پالنہار ہے۔ ہر دُکھ سُکھ اس کی طرف سے ہے، ہر مصیبت وہی رفع کرتا ہے، ہر نعمت وہی عطا کرتا ہے انسان مادّی وسائل کی طرف لپکتا ہے، لیکن یہ مادّی دنیا بھی تو اس کی مخلوق ہے لہٰذا اسی کی بارگاہ سے مانگنا چاہیے۔

کائنات کی ہر شئے اللہ کا ذکر کرتی ہے :

فرمایا: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۔۔۔ اللہ کی پاکی اور تسبیح تو خود ساتوں آسمان کرتے ہیں، اس کی عظمت بیان کرتے ہیں جبکہ زمین بھی اللہ کا ذکر کرتی ہے اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور وَمَنْ فِيْهِنَّ ۔۔۔ جتنی مخلوق آسمانوں اور زمینوں میں ہے سب اللہ کا ذکر کرتی ہے۔

کچھ علماء کا خیال ہے کہ ہر چیز زبانِ حال سے اللہ کی عظمت بیان کر رہی ہے اور یہی اس کا ذکر ہے۔ لیکن

یہاں یہ مراد نہیں ہے۔ یہاں ارشاد ہے تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ۔۔۔ساتوں آسمان اس کی تسبیح وتہلیل کرتے ہیں اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ قولاً اللہ کا نام لے کر ذکر کرتے ہیں۔ اور یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے بھی ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادِ پاک کا مفہوم ہے کہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو قبل از بعثت مجھ پر درود و سلام پیش کیا کرتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا بہت مشہور معجزہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم پر ابوجہل کے ہاتھ میں کنکریوں نے کلمہ پڑھا۔ اس ضمن میں امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا معجزہ صرف یہی نہیں ہے کہ کنکریوں نے کلمہ پڑھا کہ یہ تو قرآن میں موجود ہے کہ ہر ذرّہ اللہ کا ذکر کرتا ہے لیکن انسانی حواس اور کافر کے مادّی حواس یہ ذکر قطعاً نہیں سن سکتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا معجزہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کافر کو بھی ذکر سنا دیا جو وہ پتھر کر رہے تھے۔ دوسری جگہ ارشاد باری ہے يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔۔۔(الجمعہ: 1) آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ ذکر تو کنکریاں ویسے بھی کرتی ہیں لیکن کوئی سنتا نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا معجزہ یہ ہے کہ مومن تو مومن، کافروں کو بھی سنوا دیا کہ کنکریاں اللہ کا ذکر کرتی ہیں۔

ایسا ہی ایک واقعہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ستونِ حنانہ سے وابستہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اس ستون سے ٹیک لگا کر جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ جب منبر تیار ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اس منبر پر خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے جلوہ افروز ہوئے تو ستونِ حنانہ اس طرح سسک سسک کر اور چیخیں مار مار کر رویا کہ سارے حاضرین نے اس کا رونا سنا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم منبر سے نیچے تشریف لے آئے اور اُسے گلے سے لگا لیا۔ پھر بھی وہ ایک دم خاموش نہیں ہوا بلکہ جس طرح بچہ سسکتا سسکتا چپ کرتا ہے اسی طرح آہستہ آہستہ خاموش ہوا۔ تو ہر شئے قولاً اللہ کا ذکر کرتی ہے یہ الگ بات ہے کہ ہمارے مادّی حواس اسے سن نہ سکیں۔

جس شئے سے ذکر چھوٹے وہ معدوم ہو جاتی ہے:

حق یہ ہے کہ حیات کا انحصار ہی ذکرِ الٰہی پر ہے۔ جو شئے ذکر چھوڑ دیتی ہے، وہ درخت ہو تو سوکھ جاتا ہے، ایندھن بن جاتا ہے، دریا ہو تو خشک ہو جاتا ہے، پہاڑ ہو تو گِر جاتا ہے۔ جاندار ہو تو مر جاتا ہے۔ یہ مجبوری ہے ہر چیز کی کہ جب تک اس نے مادّی دنیا میں زندہ رہنا ہے اس کا ذرّہ ذرّہ ذکر کرے گا اور یہ غیر اختیاری عمل ہے۔ پہاڑ، درخت، جنگل یا دریا کا ذکر کرنا اُن کا کمال نہیں بلکہ مجبوری ہے، وہ فطری طور پر کرتے ہیں۔ انسان جب ذکر کرتا ہے تو بالارادہ کرتا ہے، عقیدے کی بنیاد پر کرتا ہے۔ قربِ الٰہی چونکہ اختیاری ذکر پر مرتب ہوتا ہے لہٰذا انسان جب ذکر کرتا

ہے تو وہ ترقی ء درجات پاتا ہے۔ فرمایا: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ۔۔۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ کی پاکی اور اس کی عظمت بیان نہ کرتی ہو۔ اسی آیہء کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ جو چیز اللہ کی پاکی، تسبیح و تہلیل نہیں کرتی وہ باقی ہی نہیں رہتی۔ کائنات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو تسبیح و تحمید نہ کرے اور باقی بھی رہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جو شئے تسبیح و تحمید چھوڑ دیتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔

فرمایا: وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ۔۔۔ ہاں تم ان مادّی ذرائع سے، ان کانوں سے ان کی تسبیح سن نہیں سکتے۔ یہ مادّی حواس ہیں اور یہ مادّے کو استعمال کرنے اور مادّی چیزیں سننے اور حاصل کرنے کے لیے عطا ہوئے ہیں۔ البتہ کسی کو قلب کی بینائی اور شنوائی عطا ہو جائے تو قلب سے سن بھی سکتا ہے قلب سے دیکھ بھی سکتا ہے۔

فرمایا: اِنَّهٗ کَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ۝ بے شک اللہ بڑا بردبار اور حلیم ہے کہ انسان اس کی عاجز مخلوق ہونے کے باوجود اس کے روبرو اس کی نافرمانی کرتی ہے اور وہ برداشت کیے رکھتا ہے۔ مہلت اور فرصتِ عمل دیے رکھتا ہے۔ رزق دیتا ہے، صحت دیتا ہے، قوتِ کار دیتا ہے اور بندے کو فوراً نہیں پکڑتا۔ اِنَّهٗ کَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ۝ اور اگر کوئی توبہ کرے تو جتنے گناہ کر چکا ہو معاف کر دیتا ہے، اس لیے کہ وہ بہت بردبار بھی ہے اور معاف کرنے والا بھی ہے۔ کوئی خواہ کتنے بھی گناہ کر چکا ہو اگر وہ خلوصِ دل سے رجوع الی اللہ کر لے تو اللہ کریم اُسے معاف فرما دیتے ہیں۔

عظمتِ الٰہی سے انکار کی سزائیں:

لیکن جو اللہ کی یاد سے ہی منہ موڑ لیں اور اس کی عظمت کا انکار کر دیں تو یہ جرم اتنا شدید ہے کہ پھر اس کی سزا کے طور پر انہیں کہیں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، ہدایت کا کوئی ذریعہ فائدہ نہیں دیتا حتیٰ کہ: وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ ۔۔۔ قرآن کریم کا سننا بھی! قرآن کریم اللہ کا ذاتی کلام ہے اور کلام میں متکلم کی ذاتی کیفیات منعکس ہوتی ہیں۔ اللہ کا کلام ہو تو وہ عظمتِ الٰہی کا حامل ہوتا ہے، اس میں وہ کیفیات ہوتی ہیں اور پھر پڑھنے والے جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں! اللہ کا کلام ہو، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارکہ سے ادا ہو رہا ہو تو ان کافروں پر اثر کیوں نہیں ہوتا؟ اس لیے کہ یہ شرک کرتے ہیں، اللہ کی عظمت کو نہیں مانتے فرمایا: جَعَلْنَا بَیْنَكَ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ اس جرم کی پاداش میں ان کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیا جاتا ہے یعنی اللہ سے شرک، اس کی عظمت سے انکار یا اللہ کی ذات سے کفر کرنا اتنا بڑا اور سنگین جرم ہے کہ قلب پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ اللہ کا کلام ہو اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حق ترجمان سے ادا

ہو رہا ہوتا ہے تو کافروں پر اثر انداز ہی نہیں ہوتا۔ یہ اُن کے جرائم کی سزا ہے کہ اللہ نے اُن کے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیا ہے۔ آواز تو سنتے ہیں لیکن اس میں جو کیفیات ہیں وہ ان تک نہیں پہنچ پاتیں، اُن کیفیات کو پردے سے روک دیا جاتا ہے اس لیے کہ انہوں نے اپنے دل اس قابل نہیں چھوڑے، ان کے دل سیاہ ہو چکے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم جب قرآن پڑھتے تھے تو کفار بھی بظاہر سنتے تھے اور اس پر ردِ عمل بھی دیتے تھے، شرارتیں بھی کرتے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو ایذا بھی پہنچاتے تھے اور انکار بھی کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ کریم نے اُن کے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے درمیان ایک چھپا ہوا، نظر نہ آنے والا ایسا سیاہ پردہ حائل کر دیا کہ اُنہیں صرف آواز آتی لیکن اس میں جو کیفیات ولذات ہیں وہ روک دی جاتیں۔

قرآن پڑھنے والے کو اگر یہ احساس ہو کہ میں انہی الفاظ کی تلاوت کر رہا ہوں جو اللہ کی ذات نے ارشاد فرمائے ہیں اور جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ حق ترجمان سے ادا ہوئے اور اللہ نے مجھے نورِ ایمان کے ساتھ یہ سعادت بخشی کہ میں ان کی تلاوت کر رہا ہوں تو اُسے قرآن کی تلاوت میں لذت آتی ہے اور پتا چلتا ہے کہ کیا پڑھ رہا ہے لیکن بدکاروں اور کفار پر اللہ کا کلام اثر نہیں کرتا اس لیے کہ جو آخرت کے اور اخروی زندگی کے، قیامت کے منکر ہیں، اُن کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے درمیان اللہ کریم ایک خفیہ پردہ حائل کر دیتے ہیں۔ یہ پردہ نہایت خفیف ہوتا ہے اور اُن لذّات کو جو قرآن میں ہیں چھان لیتا ہے اور یوں اُن تک صرف آواز جاتی ہے کیفیات نہیں جاتیں۔

فرمایا: وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ۔۔۔ اور ان کے دلوں پر بھی ایک خاص قسم کا پردہ ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ لذّات و کیفیات وصول نہ کر سکیں۔ اور یہ سب اُن کے غلط عقائد اور نظریات کی بدولت ہوتا ہے۔ اُن کی کرتوتوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

فرمایا: وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا۔۔۔ اور اُن کے کانوں میں بھی ایسا بوجھ، ایسا ثقل ڈال دیتے ہیں کہ انہیں حق سنائی ہی نہ دے۔ اللہ کریم کو ناراض کرنے سے انسان کو سب سے بڑا نقصان یہ پہنچتا ہے کہ وہ حق کو سمجھنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ اس کے ذرائع علم کو الٹا دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں برائی بھلی لگنے لگ جاتی ہے اور بھلائی کڑوی محسوس ہوتی ہے اور یوں وہ انتہائی غضبِ الٰہی کا شکار ہو جاتا ہے۔

باطل عقائد کی نحوست:

شرک و کفر کے باعث ان کا یہ حال ہو گیا کہ: وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰى

اَدۡبَارِهِمۡ نُفُوۡرًا۝ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کی توحید، عظمت وشان بیان فرماتے ہیں، یعنی قرآن پڑھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اس کی تشریح اور تفسیر بیان فرماتے ہیں تو یہ لوگ نفرت سے پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ انہیں وہ باتیں پسند ہی نہیں آتیں۔ جس طرح بخار میں انسان کو شیریں چیز بھی کڑوی محسوس ہوتی ہے ایسے ہی جب کسی کا دل تباہ ہوجائے تو اُسے اچھی باتیں کڑوی لگتی ہیں۔ وہ برائی کی باتیں سُن کر خوش ہوتا ہے۔ ان کفار کا حال تو یہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف کان لگا کر سنتے ہیں لیکن اللہ کریم فرماتے ہیں: نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَسۡتَمِعُوۡنَ بِهٖۤ ۔۔۔ ہم ان کے دل کی کیفیت جانتے ہیں یہ بڑے دھیان سے اور بظاہر بڑے غور سے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی آوازِ مبارکہ سن رہے ہوتے ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم قرآن پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ فرمایا: اِذۡ یَسۡتَمِعُوۡنَ اِلَیۡكَ وَاِذۡ هُمۡ نَجۡوٰۤی ۔۔۔ جب وہاں سے الگ ہوتے ہیں تو آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔

فرمایا: اِذۡ یَقُوۡلُ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا۝ یہ ظالم آپس میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ لگتا ہے کسی نے ان (حضور صلی اللہ علیہ وسلّم) پر جادو کر دیا ہے جو یہ ہمارے بتوں کو باطل قرار دے رہے ہیں، ایسی باتیں کر رہے ہیں حالانکہ یہ بُت ہمارے اتنے کام کرتے ہیں، ہم ان کی پوجا کرتے ہیں اس لیے کہ یہ اللہ سے ہمیں چیزیں لے کر دیتے ہیں۔ ہم ان کی پوجا کرتے ہیں تو یہی ہمارے لیے اولاد حاصل کر کے دیتے ہیں، رزق حاصل کر کے دیتے ہیں اور یہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلّم) ہیں کہ ان بتوں کی تردید کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کسی نے ان پر جادو کر دیا ہے اور یہ سحر زدہ ہوکر ایسی باتیں کر رہے ہیں۔

عظمتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم سے نا آشنائی کا نتیجہ، گمراہی:

ایک ایسی عظیم الشان ہستی صلی اللہ علیہ وسلّم جس کی بعثت سے نبوت کی تکمیل ہوئی۔ آدم علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نبوت کا آغاز ہوا، اللہ کے بے حد مقرب انبیاء ورسل اور اولوالعزم رسولؑ دنیا میں تشریف لاتے رہے لیکن مخصوص قوموں کے لیے اور مخصوص اوقات کے لیے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم جلوہ افروز ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت ساری کائنات کے لیے، سارے زمانوں کے لیے، قیامت تک کے لیے ہوئی، گویا نبوت مکمل ہوگئی اب کسی نئے نبیؑ کی ضرورت باقی نہیں رہی، گنجائش ہی نہ رہی۔ نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی۔ ایسی ہستی صلی اللہ علیہ وسلّم کی باتیں سن کر یہ کہتے ہیں کہ لگتا ہے کسی نے ان پر جادو کر دیا ہے۔ اور ان کے مقابلے میں اپنے جاہل آباء واجداد کی رسومات کو صحیح مانتے ہیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں: اُنۡظُرۡ كَیۡفَ ضَرَبُوۡا

لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا ۔۔۔ میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلّم) یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے لیے کیسی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ کیسی گھٹیا مثالیں بیان کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی عظمت سے نا آشنا ہیں لہٰذا گمراہ ہو گئے۔ فرمایا: فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝ یہ ایسے گمراہ ہوئے کہ انہیں کبھی صحیح راستہ نہ ملے گا۔ جو عظمتِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم سے بے نیاز ہو گیا، عظمتِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم سے آگاہ نہ ہو سکا وہ ایمان کی حلاوت پا نہیں سکتا۔ وہ راہِ ہدایت نہیں پا سکتا، اس سے محروم رہے گا۔

عظمتِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم سے نا آشنا یہ لوگ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ فرماتے سنتے ہیں کہ اللہ کریم سب کو دوبارہ پیدا فرمائیں گے تو انہیں بہت عجیب لگتا ہے کہتے ہیں: وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ راہِ ہدایت سے محروم یہ لوگ قدرتِ باری پر یقین سے ہی محروم ہیں۔ کہتے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ جب ہم مر جائیں گے، وجود گل سڑ جائیں گے، ہڈیاں بھی پرانی ہو کر چورا چورا ہو کر خاک میں مل جائیں گی تو کیا ہم اسی طرح سے نئی مخلوق بن کر کھڑے ہو جائیں گے یہ کس طرح سے ممکن ہے؟ فرمایا، انہیں فرما دیجیے: قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۝ تم خواہ مر کر پتھر بن جاؤ، سخت چٹان بن جاؤ یا اس سے بھی سخت تر لوہا بن جاؤ یا اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۔۔۔ کوئی ایسی شکل اختیار کر لو جو تمہارے خیال میں لوہے سے بھی زیادہ سخت ہو۔ تو پھر کہتے ہیں: فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۔۔۔ اگر ایسا ہو گا تو ہمیں واپس کون لوٹائے گا، دوبارہ انسان کون بنائے گا اور ہم دوبارہ کیسے زندہ ہو جائیں گے؟ فرمایا: قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۔۔۔ وہ ہستی جس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا فرمایا وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔

قرآن کریم نے تخلیقِ وجودِ انسانی کا جو کلیہ بتایا ہے وہ یہی ہے کہ گلی سڑی مٹی کے اجزاء، آگ ہوا اور پانی لے کر اللہ کریم نے چھوٹے چھوٹے ذرّے (ATOM) بنا دیے۔ قدرتِ باری کا کمال ہے کہ یہی ذرّات (ATOM) مل کر CELL یعنی خلیے بنتے ہیں اور مختلف چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ درخت بنتے ہیں، پتھر بنتے ہیں، پہاڑ بنتے ہیں۔ پانی میں بھی مختلف اجزاء میں گیسیں (GASES) ہیں۔ ان اجزاء کو تقسیم کرو تو تقسیم ہو جاتے ہیں تو انسانی خلیہ (CELL) بھی انہی زمینی اجزاء کا خلاصہ ہے اور پھر ان خلیوں سے انسان کا وجود تخلیق فرمایا۔ زندگی بھر یہ وجود مادّی غذا کے سہارے ہی زندہ رہتا ہے۔ مر کر کتنا بھی بدل جائے لیکن مادّے ہی کی کوئی صورت ہو گا تو جس نے پہلے ان ذرّات (ATOMS) کو یکجا کیا وہ دوبارہ بھی پیدا کرنے پر قادر ہے۔

اس کی قدرتِ کاملہ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ وہ ہی بنائے گا جس نے تمہیں پہلی بار بنایا ہے۔

کج بحثی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد سُن کر جب لاجواب ہو جاتے ہیں تو فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ۔۔۔ پھر کج بحثی پر اتر آتے ہیں کہتے ہیں پھر ایسا کب ہوگا؟ آج تک تو ہم نے نہیں دیکھا کہ کوئی مرنے والا اٹھ کر واپس آیا ہو۔ کب سے دنیا کا نظام چل رہا ہے، کتنے لوگ مر گئے فنا ہو گئے، خاک میں مِل گئے، اُن میں سے کوئی بھی دوبارہ زندہ نہیں ہوا اگر ایسا ہونا ہی ہے تو کب ہوگا؟ یہ بھی بتایا جائے۔

قیامت کچھ دور نہیں:

فرمایا: قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾ ان سے کہہ دیجیے، ہوسکتا ہے یہ بہت قریب ہو۔ دنیا کے شب وروز کی بات نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں ایک دن، زمین پر گزرنے والے پچاس ہزار سال اور کبھی ہزار سال کے برابر ہے۔ اس کے اپنے دن ہیں۔ پچاس ہزار سال میں زمین پر کتنا کچھ بیت جاتا ہے جبکہ وہاں صرف ایک دن گزرتا ہے۔ اُس دن کا ایک لمحہ بھی تمہاری دنیوی زندگی سے طویل ہے۔ اور اس حساب سے تو قیامت دروازے پر کھڑی ہے، کوئی دور نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ عالی ہے: مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ (حدیثِ مرفوع) اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جو مرتا ہے اس کی قیامت تو قائم ہو جاتی ہے اور کتنے لوگ روزانہ موت کی وادی میں اترتے ہیں، ہر لمحہ، ہر پل مر رہے ہیں تو عین ممکن ہے کہ کسی شخص کی قیامت قریب ہو۔

آج تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بحث کر رہے ہیں لیکن اُس دن جب: يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ۔۔۔ وہ تمہیں پکارے گا اور حکم دے گا کہ کھڑے ہو جاؤ، زندہ ہو جاؤ تو تم اس کے حکم کو قبول کرو گے۔ تم مجبوراً اس کے حکم کی تعمیل کرو گے۔ تمہارے پاس تعمیلِ ارشاد کے سِوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ جب اللہ کریم حکم دیں گے کہ کھڑے ہو جاؤ تو ایک ایک ذرّہ اپنی اپنی جگہ جا کر اپنا وجود مکمل کر لے گا۔ انسان پھر سے کھڑے ہو جائیں گے اور تم اس وقت سوچ رہے ہو گے کہ: اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ مرے تھے، کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا بلکہ لمحوں کی بات ہے کہ مرے تھے

اور قیامت بھی قائم ہو گئی۔ اس وقت تمہیں اندازہ ہو گا کہ زندگی کتنی مختصر اور وقت کتنا تھوڑا تھا جسے تم نے ضائع کر دیا!

آخرت ابدی اور نہ ختم ہونے والی ہے جبکہ دنیوی زندگی بہت ہی مختصر ہے۔ قیامت کو دوبارہ زندہ ہونے پر انسان کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ بہت ہی قلیل مدت گزار کر آیا ہے۔ اس وقت افسوس ہو گا کہ اس مختصر سے وقت کو ضائع کیوں کیا، اس کو یادِ الٰہی اور معرفتِ الٰہی میں صرف نہیں کیا بغاوت، جرم اور گناہ میں ضائع کر دیا۔ تب یہ انکار کرنے والے اندازہ کریں گے کہ کتنا لمبا عرصہ ابدی زندگی کا درپیش ہے جسے اُنہیں بسر کرنا ہے اور کتنا تھوڑا سا وہ وقت زندگی کا تھا جسے وہ ضائع کر آئے ہیں۔ اس وقت کہیں گے کہ زندگی تو پلک جھپکتے میں ہی گزر گئی۔

دنیا میں آج بھی ہم یہ تجربہ کرتے ہیں کہ اگر کوئی آئندہ پچاس سال کی بات کرے تو بہت دور کی بات لگتی ہے۔ مثلاً کوئی یہ کہے کہ تم مجھے آج اتنی رقم دو میں تمہیں پچاس سال بعد واپس کر دوں گا تو سننے والے کو ہنسی آتی ہے کہ مذاق کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پچاس سال کون دیکھتا رہے کہ تم پیسے واپس کرو گے۔ کون جیے گا، کون مرے گا، یہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب کوئی پچاس، ساٹھ ستر سال کا ہو جاتا ہے تو اُن سے پوچھو تو کہتے ہیں یہ سال تو چٹکی بجاتے گزر گئے۔ ساٹھ سال گزر گئے، کدھر گئے؟ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ پل بھر میں گزر گئے، کل کی باتیں تھیں بیت گئیں۔ یہ تو قیامت کو صحیح پتا چلے گا کہ دنیوی زندگی تو بڑی مختصر تھی اور دارالجزا کی زندگی ابدی ہے، کبھی نہ ختم ہونے والی ہے۔

سورۂ بنی اسرآءیل رکوع 6 آیات 53 تا 60

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۝ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝ وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ وَمَا مَنَعَنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝

اور میرے بندوں سے کہیے کہ ایسی باتیں کہا کریں جو پسندیدہ ہوں بے شک

شیطان (بدکلامی کرواکر) ان میں فساد ڈال دیتا ہے واقعی شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے ﴿۵۳﴾ آپ کا پروردگار تم سب کا حال جانتا ہے اگر وہ چاہے توتم پر رحمت فرمادے یا اگر چاہے توتم کو عذاب دے اور ہم نے آپ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا ﴿۵۴﴾ اور آپ کا پروردگار ان سب کو خوب جانتا ہے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اور یقیناً ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو زبور عطا فرمائی ﴿۵۵﴾ فرما دیجیے کہ تم اُس (اللہ) کے سوا جن کو معبود قرار دے رہے ہو ذرا ان کو پکارو تو سہی پس وہ تم سے تکلیف دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ (اس کو) بدل دینے کا ﴿۵۶﴾ یہ (مشرک) جن کو پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے پروردگار کی طرف ذریعہ (تقرب) تلاش کر رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ (اللہ کا) مقرب بنتا ہے اور وہ اُس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اُس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک آپ کے پروردگار کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے ﴿۵۷﴾ اور (کفار کی) کوئی بستی نہیں مگر قیامت کے دن سے پہلے ہم اس کو ہلاک کر دیں گے یا اس کو عذاب دیں گے سخت عذاب۔ یہ کتاب میں لکھا جا چکا ہے ﴿۵۸﴾ اور ہم نے نشانیاں (فرمائشی معجزات) بھیجنا اس لیے بند کر دیں کہ اگلے لوگوں نے ان کی تکذیب کی اور ہم نے ثمود کو اونٹنی دی جو کھلی نشانی (معجزہ) تھی تو انہوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا اور ہم ایسے معجزات کو صرف (انجام بد سے) ڈرانے کے لیے بھیجا کرتے ہیں ﴿۵۹﴾ اور جب ہم نے آپ سے فرمایا کہ بے شک آپ کا پروردگار (اللہ، تمام) لوگوں کو گھیرے (احاطہ کیے) ہوئے ہے اور جو واقعہ (واقعۂ معراج) ہم نے آپ کو (بیداری میں) دکھایا اس کو لوگوں کے لیے آزمائش کا سبب بنا دیا اور اسی طرح (تھوہر کے) درخت کو جس پر قرآن میں لعنت کی گئی۔ اور ہم ان کو ڈراتے ہیں تو ان کو بڑی سرکشی پیدا ہوتی ہے ﴿۶۰﴾

تفسیر و معارف

اندازِ گفتگو شائستہ:

فرمایا: وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔۔۔میرے اُن بندوں سے کہہ دیجیے لِّعِبَادِیْ۔۔۔جنہیں نورِ ایمان نصیب ہے، جن کو اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم نصیب ہے، جن کا شعار اطاعتِ الٰہی و بندگی ہے۔ اُن سے کہہ دیجیے کہ جب بھی بات کریں، خوبصورت بات کریں۔ کسی سے ملاقات ہو، لین دین ہو، کسی کو تبلیغ کرتے ہیں، وعظ کرتے ہیں یا مناظرہ کرتے ہیں اس بات کا خیال رکھیں کہ بات کرنے کا انداز خوبصورت ہونا چاہیے۔ ایسے انداز میں ہرگز بات نہ کی جائے جس سے کسی کی توہین یا رسوائی ہو۔ بات ہمیشہ احترام سے کی جائے اور دوسرے کا لحاظ کرتے ہوئے کی جائے۔ جھگڑا بھی ہو تو جھگڑے میں بھی یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ صرف جائز باتیں کی جائیں۔ ناروا گفتگو نہ کی جائے، گالی گلوچ نہ کیا جائے نہ ہی طعن و تشنیع کی جائے۔ تبلیغ کرتے ہوئے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ مخاطب بھی اللہ کی مخلوق ہے۔ اگر کافر سے بھی بات کر رہے ہیں تو احسن طریقے سے کریں۔ اگر اُسے کافر کہہ کر پکاریں گے تو کیا وہ آپ کی بات مانے گا؟ بلکہ وہ آپ کو کافر کہے گا۔ اگر وہ کافر بھی ہے تو وہ خود کو حق پر سمجھتا ہے اور آپ کو غلط سمجھتا ہے لہٰذا بات کا انداز بہت پسندیدہ ہونا چاہیے کہ بات احسن طریقے سے سمجھائی جائے تو اللہ کافر کو بھی ایمان نصیب کر سکتا ہے۔

بدکلامی کا محرک شیطان:

یہ یاد رکھیں کہ جب بھی بدکلامی کی جاتی ہے تو اس کے پیچھے شیطان ہوتا ہے۔ فرمایا: اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَھُمْ۔۔۔جب لوگ ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہیں، گالی گلوچ کرتے ہیں تو یہ مغلظات شیطان اُن کے منہ سے نکلواتا ہے اس لیے کہ شیطان ان باتوں سے اُن میں جھگڑا کروا کر خوش ہوتا ہے۔ بدکلامی سے شیطان کو فساد پھیلانے کی راہ اور بہانہ مل جاتا ہے۔ اس لیے کہ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا۝ یقیناً شیطان تو انسان کا کھلا دشمن ہے۔ صرف مسلمان کا نہیں، کافر کا بھی دشمن ہے اس لیے کہ وہ انسان کا ازلی دشمن ہے اور ہر موقع، ہر مقام پر وہ اپنی دشمنی نبھاتا ہے۔ کوئی جتنی بھی برائی کرے، کفر کرے، شیطان اسے مزید کفر و شرک میں دھکیلنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس سے دوستی نہیں کرتا۔ ہر حال میں انسانوں سے دشمنی کرتا ہے۔

فرمایا: رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِکُمْ۔۔۔تمہارا پروردگار تمہارے ہر حال سے بخوبی آگاہ ہے۔ وہ ذاتی طور پر

جانتا ہے کہ کون سچا ہے کون جھوٹا ہے، کون بھلا ہے کون بُرا ہے۔ تمہیں کسی پر فتویٰ لگانے کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا بات مناسب انداز سے ایک حد کے اندر رہتے ہوئے کرنی چاہیے۔

اللہ کے اپنے فیصلے ہیں:

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾ اللہ کریم اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمارہے ہیں کہ توفیقِ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا برگزیدہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث کرنے کے باوجود ان پر داروغہ نہیں بنایا۔

اس آیہء مبارکہ میں امت کے لیے دعوتِ فکر ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی پر داروغہ نہیں بنایا گیا تو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے بارے یہ رائے دینے کے کیسے مجاز ہیں کہ کس کا انجام کیا ہوگا۔ وہ خود جانتا ہے کون کیسا ہے، ساری مخلوق اس کی اپنی ہے اور وہ چاہے تو کسی پر رحم کردے اور چاہے تو کسی کو اس کے گناہوں پر سزا دے دے۔ وہ اپنی مرضی کا مالک خود ہے لہٰذا اے مسلمانو! کسی پر فتویٰ نہ لگاؤ کہ تم نہیں جانتے کس کا کیا انجام ہوگا۔ وہ چاہے تو کسی پر رحم کردے، کافر کو نورِ ایمان عطا کردے۔ کیا تم نے کافروں کو مسلمان ہوتے نہیں دیکھا؟ اور کیا مسلمانوں کو مرتد ہوتے نہیں دیکھا؟ تو یہ اللہ کے اپنے فیصلے ہیں اور وہ خود سب کے حال سے آگاہ و باخبر ہے۔ تمہیں اس نے لوگوں پر داروغہ نہیں لگایا ہوا کہ تم فیصلے کرنا شروع کردو، کسی کو اچھا کہہ دو کسی کو بُرا، یہ اس کا اپنا کام ہے۔ یہ تمہارا منصب نہیں ہے۔

فرمایا: وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔۔۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار ہر چیز، ہر فرد، ہر ذات سے بخوبی واقف ہے خواہ وہ آسمانوں میں ہے یا زمینوں میں ہے۔ انسان کا علم تو محدود ہے جبکہ اللہ کا علم تو ایسا ہے کہ وہ ہر چیز کو ہمہ وقت جانتا ہے۔ جو گزر چکی ہے، جو موجود ہے اور جو ہونے والی ہے اس سب کو جانتا ہے۔ ہر فرد کو مکمل تفصیل کے ساتھ جانتا ہے اس لیے کہ اللہ کا علم حضوری ہے، ہر شئے اس کے سامنے حاضر ہے۔

قرآن کا اندازِ تخاطب:

فرمایا: وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ ۔۔۔ اور یقیناً ہم نے بعض انبیاءؑ کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ قرآن کریم کا اندازِ بیان یہ ہے کہ بعض نبیوںؑ کو بعض نبیوںؑ پر فضیلت دی گئی ہے لیکن یہ نہیں کہا گیا کہ بعض نبیوںؑ کا مرتبہ بعض سے کم ہے۔ حالانکہ مفہوم ایک ہی ہے کہ ایک کا زیادہ ہوتا ہے تو دوسرے کا از خود کم ہوتا ہے لیکن یہ انداز انبیاءؑ کی شان میں گستاخی ہے لہٰذا قرآنِ کریم کا اندازِ بیان یہ ہے کہ بعض نبیوںؑ کو بعض نبیوںؑ پر فضیلت دی ہے،

سب اچھے ہیں، سب اللہ کے مقرب ہیں، سب اللہ کے نور کے امین ہیں، سب ہادی ہیں، سب نبیؐ ہیں۔ سب ہی اچھے ہیں، بعض ان میں سے بہت اچھے ہیں ان کی فضیلت اور بھی زیادہ ہے۔

دراصل کفار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر اعتراض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم خود کو نبی بھی کہتے ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں سب سے افضل نبیؐ ہوں تو اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے پہلے بھی تو ایسے انبیاء آئے ہیں جو دوسروں سے افضل تھے۔ یہ سب کفار جو معترض ہیں اچھی طرح سے جانتے ہیں وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا﴿۵۵﴾ کہ داؤد علیہ السلام کو زبور عطا ہوئی۔ یہ جانتے ہیں کہ پہلے انبیاء کو اللہ کی طرف سے کتابیں عطا ہوئیں اور یہ پہلے انبیاء کو نبیؐ مانتے ہیں، اب اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو قرآن عطا ہوا ہے تو اس پر انہیں حیرت کیوں ہوتی ہے، اس کا انکار کیوں کرتے ہیں؟

قرآن کریم کے مندرجہ بالا انداز تخاطب کی روشنی میں جب اہل اللہ، علمائے حق کے بارے میں بات کی جائے تو اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ کسی کی فضیلت بیان کرنے میں کسی کی تنقیص کا پہلو نہ نکلے۔ یہ کہنا درست ہے کہ بعض کو بعض پر فضیلت ہے۔ فضیلت سب کو حاصل ہے، بعض کو زیادہ حاصل ہے۔ بات کرتے ہوئے انداز مؤدبانہ ہونا چاہیے اور ادب کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

عظمتِ الٰہی:

فرمایا، ان معترضین سے، انکار کرنے والوں سے فرما دیجیے: قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا﴿۵۶﴾ کہ اللہ کے سوا یہ جن کو معبود بناتے ہیں انہیں پکاریں، اُن سے دعائیں مانگیں، انہیں سجدے کریں، لیکن وہ اِن کی ذرا سی تکلیف بھی دور نہیں کر سکتے۔ یہ خود مخلوق ہیں، مجبور و بے بس ہیں، خود تقدیر کے دھارے میں بہہ رہے ہیں تمہارا کیا کریں گے؟ نہ وہ تمہاری قسمت بدل سکتے ہیں نہ ہی اس میں لکھی ہوئی کسی مصیبت کو دور کر سکتے ہیں۔ اگر تمہاری قسمت میں بیماری یا مصیبت ہے تو جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ اسے ہرگز نہیں بدل سکتے ہاں! اللہ خود ہی بدلنا چاہے تو بدل سکتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ ۔۔۔ یہ مشرک اللہ کو چھوڑ کر مخلوق کو پکارتے ہیں اور مخلوق اپنی مدد کے لیے خود اللہ کو پکار رہی ہے۔ وہ پتھر ہو یا درخت، زمین ہو یا آسمان، زمین و آسمان کی کوئی مخلوق ہو سب اللہ کو پکار رہی ہے اور یہ جاہل اور بے وقوف لوگ ان ہستیوں کو پکارنے میں مصروف ہیں جو خود اللہ کو پکار رہی ہیں۔ یہ سب تو اللہ کے قرب کے ذرائع تلاش کر رہے ہیں، اس کا ذکر کر رہے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ

انہیں اللہ کا قرب زیادہ سے زیادہ نصیب ہوجائے، اللہ کی بخشش نصیب ہو وہ خود اس کی رحمت کے متمنی ہیں۔ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝ اور ہر ذرّہ کائنات اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہے اور اللہ کی رحمت کو پانے کے لیے حیلے تلاش کر رہا ہے۔ بھلا اللہ کو چھوڑ کر انسان کسی کو پکارے گا تو وہ اس کی پکار کیا سنے گا! وہ تو خود اللہ کی بخشش پانے کے لیے، اللہ کے عذاب سے بچنے کے لیے اللہ کو پکار رہا ہے اللہ کا ذکر کر رہا ہے۔ وہ تو خود اللہ کے عذاب سے بچنے کے اسباب تلاش کر رہا ہے اور اللہ کا عذاب ہے ہی ایسا کہ اس سے ڈرنا چاہیے لہٰذا کائنات کا ہر ذرّہ عذابِ الٰہی سے لرزاں و ترساں ہے پھر یہ کیسے جاہل لوگ ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر مخلوق کو پکارتے ہیں!

کفار کا انجام:

فرمایا: وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۔۔۔ ان کفار کی کوئی آبادی ایسی نہیں ہوگی جو قیامت سے پہلے ملیا میٹ نہ کر دی جائے۔ ان کے بڑے بڑے گنجان آباد شہر بلند و بالا عمارتیں، بڑے بڑے محلات، بڑی بڑی آبادیاں ہر چیز قیامت سے پہلے تباہ کر دی جائے گی۔ بقا صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ اگر کفار برائی کفر و شرک پر ہی قائم رہے تو تباہی ان کا مقدر ہے۔ اللہ انہیں سخت عذاب دیں گے تباہی کے ساتھ ذلت و رسوائی بھی ہوگی۔ ان کو بہت شدید عذاب دے کر تباہ کر دیا جائے گا۔ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ نیکی اور برائی کے کیا نتائج برآمد ہوں گے، یہ سب کچھ لوحِ محفوظ میں لکھا جا چکا ہے۔ کفر و شرک کے نتائج کتنے بھیانک ہوں گے اور توحیدِ باری پر قائم رہنے والوں پہ کیا انعامات ہوں گے، یہ تمام فیصلے لوحِ محفوظ میں لکھے جا چکے، یہ تمام فیصلے ہو چکے۔ جو عمل کوئی کر رہا ہے وہ اب اپنے لیے کر رہا ہے۔ اس کے اعمال کا جو طے شدہ فیصلہ ہے وہی اس پر نافذ کر دیا جائے گا۔

اللہ کے کرم کا ایک انداز:

مشرکین و کفار تقاضا کرتے تھے کہ جو معجزہ وہ طلب کرتے ہیں، بعینہٖ ظاہر کیا جائے ارشاد ہوا کہ لوگ جب انبیاء اور رسلؑ سے معجزے طلب کرتے تھے اور وہی معجزہ ظاہر کر دیا جاتا اور پھر وہ انکار کرتے تو اجتماعی طور پر تباہ کر دیے جاتے۔ قوموں کی قومیں ذلالت اور گمراہی میں غرق ہو جاتیں اور دنیا سے نابود کر دی جاتیں۔ اُن کے نام و نشان مٹا دیے جاتے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے زمین پر قدم رنجہ فرمایا تو زمین پر اجتماعی عذاب ختم ہو گئے اور اللہ کریم نے فرمایا کہ بعثتِ عالی صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد ہم نے فرمائشی معجزات بھی روک دیے ہیں۔ کیونکہ اگر کفار معجزے کی فرمائش کریں اور اس کے ظاہر ہونے کے بعد انکار پر مصر رہیں تو اجتماعی تباہی آئے گی اور اجتماعی تباہی تو

بطفیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم روک دی گئی ہے۔اسی لیے فرمائشی معجزات بھی روک دیے گئے ہیں۔

پہلی قوموں نے بھی اپنے انبیاء سے معجزات کی فرمائش کی مثلاً حضرت صالحؑ کی قوم نے عجیب وغریب فرمائش کی کہ سامنے جو بہت بڑی چٹان ہے اس سے ایک اونٹنی نکلے اور وہ حاملہ بھی ہو اور چٹان سے نکل کر بچہ بھی دے۔قوم نے کہا کہ اگر ایسا ہوگیا تو وہ حضرت صالحؑ کی نبوت کو قبول کرلیں گے۔فرمایا: وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۔۔۔اللہ کی شان اس چٹان سے اونٹنی بھی نکلی اور اس نے بچہ بھی دیا لیکن قومِ ثمود نے اس اونٹنی کے ساتھ ظلم کیا اس کی کونچیں کاٹ دیں اور اُسے مار ڈالا، اس کا بچہ بھاگ گیا۔انجامِ کار تین دن کے بعد ساری قوم تباہ ہوگئی، ہلاک کردی گئی سوائے اللہ کے نبیؑ اور اُن کے متبعین کے، سب ہلاک ہوگئے۔

بعثتِ عالی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ چونکہ عمومی عذاب ختم کردیے گئے تھے لہٰذا فرمائشی معجزات بھی روک دیے گئے۔

معجزات کا مقصد:

انبیاء کے معجزات فرمائشی پروگرام نہیں ہوتا بلکہ یہ عظمتِ الٰہی کے اظہار کے لیے اور انبیاء کی نبوتِ عالیہ کی تصدیق کے لیے صادر ہوتے ہیں۔وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾ معجزات کا ظہور اس لیے کیا جاتا ہے کہ لوگ اللہ کی قدرت کی نشانیاں دیکھ کر اس کی عظمت کا اقرار کریں اور اس کی نافرمانی کرنے سے ڈر جائیں اور یوں برائی سے باز آجائیں۔معجزات کا مقصد عجائبات دکھانا نہیں ہوتا کہ جو کسی نے طلب کی اسی طرح کی عجیب چیز ظاہر ہوجائے۔ معجزہ اللہ کا فعل ہوتا ہے، صادر اللہ کے نبیؑ کے ہاتھ پر ہوتا ہے، رضائے باری سے ہوتا ہے، نبوت اور رسالت کی تصدیق کے لیے اور کفر کی تردید کے لیے ہوتا ہے۔کسی فرد کی بڑائی کے لیے نہیں ہوتا۔معجزات کسی کو خوش کرنے کے لیے یا کسی کی بڑائی کے لیے نہیں ہوتے بلکہ عظمتِ الٰہی کے اظہار اور نبیؑ کی نبوت کی صداقت کے لیے ہوتے ہیں۔

کرامت:

ولی کی کرامت نبیؑ کے معجزے کی فرع ہوتی ہے۔کرامت کا ظہور بھی تب ہوتا ہے جب احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے دلیل درکار ہو۔کرامت معجزہ نبیؑ ہی کا ہوتا ہے لیکن صادر ولی کے ہاتھ پر ہوتا ہے اس کا مقصد بھی دین کی عظمت اور صداقت ثابت کرنا اور کفر کی تردید کرنا ہی ہوتا ہے۔اب تو ایسا دور آگیا ہے کہ شعبدوں کو کرامت گردانا جاتا ہے معجزے اور کرامات کا مقصد تو لوگوں کو حق پر لانا ہے اور اس کی دلیل مہیا کرنا ہے اور باطل سے بچانا ہے

لیکن آج کل کے دانشور شعبدہ بازی کو کرامت لکھتے ہیں۔ کرامت تو ہوتی ہے کہ لوگوں کو کفر سے نکال کر اسلام میں لایا جائے، غفلت سے نکال کر اللہ کی یاد میں لگایا جائے، برائی سے نکال کر نیکی پر لگایا جائے۔

فرمایا: وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۔۔۔ ہم نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے فرما دیا کہ کوئی فرد اللہ کے قبضہء قدرت سے باہر نہیں ہے۔ وہ خالق ہے اور ساری مخلوق ہمہ وقت اس کے زیرِ اختیار ہے۔ جیسا چاہے ویسا رکھے۔ جسے چاہے زندگی دے جسے چاہے موت دے۔ جسے چاہے سربلند کرے جسے چاہے رسوا کر دے۔ سب کچھ اس کے دستِ قدرت میں ہے۔

فرمایا: وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ۔۔۔ جو عجائبات آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو شب معراج دکھائے گئے، برزخ کے حالات، دوزخ کے حالات، جنت کے واقعات، آسمانوں کی باتیں اور بالائے آسمان کی باتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بیان فرمائے، اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ کفار ان باتوں کو قبول کرتے۔ ان سے درس عبرت لیتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لاتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی قبول کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کرتے اور اللہ کا قرب حاصل کرتے۔ لیکن انہوں نے انکار کر کے مزید گمراہی اور کفر اختیار کر لیا۔ یہ اُن کا فرمائشی معجزہ تو نہیں تھا، یہاں قرآن کریم نے ان عجائبات کو جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سفرِ معراج میں مشاہدہ فرمایا الرُّءْيَا فرمایا ہے لیکن یہ لوگ اس سے ایمان حاصل کرنے کی بجائے، الٹا مزید گمراہی میں چلے گئے۔ یہ لوگ بھلا معراج شریف سے بڑا کون سا معجزہ مانگتے ہیں! انبیاءؑ علیہم السلام کو اللہ کریم سے شرفِ ہمکلامی بھی نصیب ہوا۔ ہر نبیؑ پر وحی نازل ہوئی، اللہ کا کلام نازل ہوا۔ موسیٰؑ کو ذاتی طور پر اللہ کریم نے شرفِ ہمکلامی سے نوازا، لیکن یہ ساری باتیں زمین پر وقوع پذیر ہوئیں۔ فرمایا، یہ ہستی صلی اللہ علیہ وسلّم جو تمہیں دعوتِ دین دے رہی ہے، یہ وہ ہستی ہے جو اسی بشری وجود سمیت عرشِ عظیم تک تک تشریف لے گئی۔ جس نے اسی وجودِ عالی سمیت برزخ بھی دیکھا، جنت و دوزخ کے احوال بھی دیکھے اور واپس آ کر تم سے من وعن بیان بھی فرما رہے ہیں۔ نہ وہ کچھ بھولے ہیں نہ بھٹکے ہیں اور نہ ہی انہیں کہیں دھوکا لگا ہے۔ یہ ایک بات ہی ہدایت کے لیے کافی تھی کہ مخلوق میں کوئی ایسی بے مثل و بے مثال ہستی بھی ہے جو وجودِ عالی سمیت عالم بالا تشریف لے جا کر، برزخ، دوزخ، جنت کے احوال کا مشاہدہ کر کے، عرشِ عظیم اور آسمانوں کی سیر کر کے واپس تشریف لے آئی۔ یہ تو بہت عالی مقام تھا اور چاہیے تو یہ تھا کہ جو جو سنتا جاتا سرِ تسلیم خم کرتا جاتا لیکن یہ ہی ان کے لیے فتنہ بن گیا، آزمائش کا سبب بن گیا اور یہ اس کا انکار کر کے کفر میں مزید آگے بڑھ گئے۔

معراج پر ایمان لانا تو بہت بڑی بات تھی، ان لوگوں کے لیے تو قرآن کی یہ بات ہی آزمائش بن گئی کہ تھوہر جہنم کا پودا ہے۔ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۔۔۔ اب یہ تو ایک چھوٹی سی بات تھی کہ قرآن نے کہا کہ تھوہر دوزخ کا پودا ہے۔ اس پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ دیکھو جی یہ کہتے ہیں کہ دوزخ میں آگ بھی ہوگی اور یہ سرسبز پودا بھی ہوگا تو یہ پودا کیسے

ہوگا؟ انہیں اتنی سی بات سمجھ نہیں آئی کہ دوزخ میں دوزخ کا ہی تھوہر ہوگا، وہ آگ میں پرورش پا تا رہے گا۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ پودا ایک ہی ہوتا ہے لیکن مختلف ممالک میں اس کے قد کاٹھ اور شکل میں فرق آجاتا ہے۔ تھوہر کو ہی دیکھ لیں جو یہاں ہے وہ کسی دوسرے ملک میں کسی اور شکل میں ملے گا لیکن بنیادی طور پر تھوہر ہی ہوگا۔ جو دوزخ میں ہوگا وہ دوزخ کا اپنا ہوگا۔

انکار کا بنیادی سبب:

فرمایا: وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا ۝ ہم پیغام بھیج کر، وحی بھیج کر، معجزات دِکھا کر انہیں اللہ سے آشنا کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ کریم سے آشنائی کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی عظمت انسان کے قلب اور روح پر چھا جاتی ہے، اور وہ اللہ کی نافرمانی سے ڈرتا ہے۔ ہم انہیں یہ نشانیاں اس لیے دکھا رہے ہیں کہ یہ اللہ سے آشنا ہو جائیں اور عظمتِ الٰہی ان پر آشکارا ہو اور یہ اللہ کی نافرمانی سے باز آجائیں لیکن عجیب بات ہے کہ ان کے مزاج اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ یہ مزید گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان دلائل کو دیکھ کر انکار کر رہے ہیں، معجزاتِ نبوت کا انکار کر کے، عظمتِ انبیاءؑ کا انکار کر کے اور اتباعِ رسالت سے روگردانی کر کے یہ گمراہی میں آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ فرمایا اگر اس چھوٹی سی بات پر کہ تھوہر دوزخ کا درخت ہے یہ معترض ہو کر گمراہ ہو رہے ہیں تو اگر کوئی فرمائشی معجزہ ہوگا تو اس پر ان کا کیا حال ہوگا؟ آدمی جب بیمار ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اسے کھانا نہ دو، صرف کوئی زود ہضم چیز دو، دودھ پلا دو یا دلیہ بنا دو، اس لیے کہ کھانا کھانے سے اس کا مرض بڑھ جائے گا، زیادہ بیمار ہو جائے گا، مر جائے گا۔ کھانا تو زندگی کا سبب ہے، یہ کیوں مر جائے گا؟ یہ قصور کھانے کا نہیں ہے، یہ قصور اس کے وجود میں جو بیماری ہے اس کا ہے۔ اس کے اپنے بدن کا نظام درست نہیں ہے۔ اسی طرح روح جب بیمار ہوتی ہے تو پھر اسے نیکی کی یا بھلائی کی باتیں اچھی نہیں لگتیں اور انسان ان کی تردید یا انکار سے مزید گمراہی میں چلا جاتا ہے۔

دشمن سے دوستی کیسی؟

اللہ نے انسان کو مکلف مخلوق بنایا ہے اور اسے ایک وقتِ مقرر تک اختیار دیا ہے کہ چاہے تو فرمانبرداری کر کے انعامات سمیٹ لے اور چاہے تو نافرمانی کر کے دیکھ لے لیکن نافرمانی پر بہت سزائیں بھی ہیں۔ اس اختیار کو غلط استعمال کر کے یہ نافرمانی کر رہے ہیں اور اپنے لیے سزائیں جمع کر رہے ہیں جبکہ انہیں اطاعت کر کے انعامات کی طرف جانا چاہیے تھا۔ انہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ گمراہی کی طرف راہنمائی اور وعدے دینے والا ابلیس ہے۔ چونکہ ابلیس نے تکبر کیا اور اللہ کی اطاعت سے روگردانی کی لہٰذا ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہو گیا۔ اس نے اللہ کریم سے مہلت مانگی، قیامت تک زندگی مانگی تا کہ وہ اولادِ آدمؑ کو گمراہ کر سکے۔ یہ ساری بات یاد دلانے کا مقصد یہ ہے کہ اے انسان! تو پھر اس شیطان کا اتباع کرتا ہے۔ اُس کی بات سنتا ہے، اُسے مانتا ہے جو تیرا ازل سے دشمن ہے جس نے طے کر رکھا ہے کہ وہ انسانوں کو گمراہ کرے گا تو ایسے دشمن سے دوستی کیسی؟

سورۂ بنی اسرآءیل رکوع 7 آیات 61 تا 70

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۡ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾ رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۶۶﴾ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۙ﴿۶۸﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿۶۹﴾ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۠﴿۷۰﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے (نہ کیا اور) کہا کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں جس کو آپ نے مٹی سے پیدا فرمایا ہے؟﴿۶۱﴾ کہنے لگا بھلا دیکھیں تو یہی ہے وہ جس کو آپ نے مجھ پر فضیلت بخشی ہے اگر آپ مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے دیں تو میں ضرور تھوڑے لوگوں کے سوا ان کی اولاد کو تباہ کرتا رہوں گا﴿۶۲﴾ ارشاد ہوا یہاں سے چلا جا پس جو ان میں سے تیری بات مانے گا تو بے شک تم سب کی سزا جہنم ہے، پوری پوری سزا﴿۶۳﴾ اور ان میں سے جس کو بہکا سکے اپنی آواز سے بہکاتا رہ اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا کر لاتا رہ اور ان کے مال اور اولاد میں شریک ہوتا رہ اور ان سے وعدے کرتا رہ اور شیطان ان سے جو وعدے کرتا ہے سب دھوکا ہیں﴿۶۴﴾ بے شک میرے (مخلص) بندوں پر تیرا کوئی بس نہ چلے گا اور آپ کا پروردگار کارساز کافی ہے﴿۶۵﴾ تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لیے سمندر میں جہاز چلاتا ہے تاکہ تم اُس کے فضل میں سے (روزی) تلاش کرو بے شک وہ تم پر مہربان ہے﴿۶۶﴾ اور جب تم کو سمندر میں تکلیف پہنچتی ہے تو اس (اللہ) کے علاوہ جتنوں کی تم عبادت کرتے ہو سب گم ہو جاتے ہیں پھر جب ہم تم کو خشکی کی طرف بچا لاتے ہیں تو تم منہ پھیر لیتے ہو اور انسان بڑا ناشکرا ہے﴿۶۷﴾ سو کیا تم (اس بات سے) بے خوف ہو کہ وہ تمہیں خشکی کی طرف (لے جا کر) زمین میں دھنسا دے یا تم پر ایسی تیز ہوا بھیج دے جو کنکر پتھر برسانے لگے؟ پھر تم اپنا کوئی نگہبان نہ پاؤ﴿۶۸﴾ یا تم (اس بات سے) بے خوف ہو گئے ہو کہ تم کو اس (سمندر) میں دوبارہ لے جائے پھر تم پر ہوا کا سخت طوفان بھیج دے؟ پس تمہارے کفر کی وجہ سے تمہیں غرق کر دے پھر تم اپنے لیے کوئی ہمارا پیچھا کرنے والا نہ پاؤ﴿۶۹﴾ اور بے شک ہم نے بنی آدمؑ کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور سمندر میں سواری دی اور ان کو پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت بخشی﴿۷۰﴾

تفسیر و معارف

سجدہ:

فرمایا: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ۔۔۔ جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں تو سب نے سجدہ کیا۔ جو سجدہ عبادت کے لیے اللہ کریم کی بارگاہ میں کیا جاتا ہے وہ صرف اللہ کریم کے لیے مختص ہے۔ اس کی خاص ہیئت ہے، خاص حالت اور خاص اوقات ہیں۔ بعض ایسے اوقات بھی ہیں جن میں سجدہ ممنوع ہے۔ ایسی حالتیں بھی ہیں جن میں سجدہ ممنوع ہے، جیسے ناپاکی، بغیر وضو ہونا، لباس کا ناپاک ہونا اور قبلہ رو نہ ہونا۔ گویا سجدے کے لیے پاک ہونا، لباس کا پاک ہونا، باوضو ہونا اور قبلہ رو ہونا شرط ہے۔ وہ سجدہ جو اللہ کو کیا جاتا ہے وہ اللہ کی عبادت ہے۔ وہ سجدہ جو آدمؑ کو کرنے کا حکم دیا گیا سجدہ تعظیمی تھا آدمؑ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا تھا، اظہار اطاعت کے لیے تھا کہ فرشتے آدمؑ سے تعاون کریں گے، ان کی بات مانیں گے۔ قدرت کی طرف سے جو ذمہ داری لگے گی وہ پوری کریں گے جیسا کہ اللہ کے حکم سے ایک ایک انسان کے ساتھ لاتعداد فرشتے ہیں جو اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور اس کے اس مشینی نظام کو چلاتے ہیں لہٰذا اس سجدے سے مراد سرِ تسلیم خم کرنا تھا اور یہ اللہ بہتر جانتے ہیں کہ فرشتوں نے جھک کر سجدہ کیا، زمین پر سر رکھ کر کیا یا کیسے کیا۔ اللہ کا حکم تھا، فرشتے بجالائے اور سرِ تسلیم خم کر دیا کہ اے اللہ! ہماری جو ذمہ داری ہوگی ہم اسے پورا کریں گے۔ آدمؑ اور ان کی اولاد سے، ہم پورا تعاون کریں گے اور ان کے ساتھ رہیں گے۔

ابلیس جنات میں سے تھا اور جنات انسانوں کی تخلیق سے ہزاروں سال پہلے زمین پر آباد ہوئے۔ ابلیس محنت کرتا رہا، اللہ اللہ کرتا رہا، عبادت کرتا رہا اور بہت سے مدارج طے کر گیا حتیٰ کہ اسے آسمانوں پر فرشتوں کے ہمراہ رہنے کی اجازت مل گئی۔ جب فرشتوں کو آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو ابلیس بھی وہاں موجود تھا لیکن ابلیس نے سجدے سے انکار کر دیا اور آدمؑ کو سجدہ نہیں کیا۔ کہنے لگا بارِ الٰہا! مجھے تیری عبادت کرتے، تیرا ذکر کرتے، سجدے کرتے صدیاں بیت گئیں تیرا قرب پانے کے لیے میں نے ایک عمر لگا دی لیکن یہ مٹی کا پتلا جو کل آپ نے ہمارے سامنے بنایا ہے آج ہم اس کو سجدہ کرنے لگ جائیں اور اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں؟ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿٦١﴾ کیا میں اس مٹی سے بنائے گئے انسان کو سجدہ کروں گا؟

ابلیس کا بنی آدمؑ سے انتقام کا اعلان:

کہنے لگا: قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ۔۔۔بار الٰہا! تو مالک ہے، تو نے اس کو مجھ پر فضیلت و بزرگی دے دی اور مجھے حکم دیا کہ اسے سجدہ کر۔ میں نہیں کروں گا ہاں! البتہ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ ۫ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ اگر تو قیامت کے دن تک مجھے مہلت دے دے تو میں اس کی ساری اولاد کو گمراہ کردوں گا سوائے ایک قلیل تعداد کے جو میرا شکار ہونے سے بچ جائیں گے۔ وہ لوگ جو تیرے مخلص بندے ہوں گے، جو دل سے تیری عظمت کے قائل ہوں گے، جو خلوص سے تیری بارگاہ میں حاضر ہوں گے وہ بچ جائیں گے، ورنہ میں سب کو گمراہ کردوں گا۔

فرمانِ الٰہی:

قَالَ اذْهَبْ۔۔۔فرمایا جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ ان میں سے جو بھی تیری بات مانیں گے وہ تیرے ساتھ جہنم میں جائیں گے اور جہنم کی پوری پوری سزائیں بھگتیں گے۔ لہٰذا جا اور اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لے، اپنا پورا زور لگا کر دیکھ لے جو تیرا کہا مانیں گے وہ تیرے ساتھ جہنم میں جائیں گے اور ان پر جہنم کی تمام تر سزائیں وارد ہوں گی۔ ارشاد ہوا: وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ۔۔۔جا جس کو بہکا سکتا ہے اپنا زور لگا لے اور اپنے لاؤ لشکر سمیت ان پر حملہ آور ہو جا۔ اپنی آواز کا جادو جگا۔

شیطان کی آواز:

مفسرینِ کرام نے حضرت ابنِ عباسؓ کے حوالے سے بِصَوْتِكَ کی شرح نقل کی ہے کہ شیطان کی آواز کیا ہے اور اس کی آواز سے بندہ کیسے گمراہ ہوتا ہے؟ وہ فرماتے ہیں کہ یہ گانا بجانا اور گانے بجانے کے آلات جنہیں مزامیر کہتے ہیں، طبلے سارنگیاں باجے گاجے، بے شمار قسم کے پہلے ہی تھے، اب تو اور بھی آ گئے ہیں، تو وہ فرماتے ہیں یہ ساری شیطان کی آوازیں ہیں۔

آج کے دور میں تو موبائل فون کی گھنٹی (Bell) یہ کام کر رہی ہے۔ کسی کو فون کرو تو کوئی نہ کوئی گانا لگا ہوتا ہے۔ ہمارے اس عہد کے دانشوروں نے تو موسیقی کو روح کی غذا قرار دے دیا ہے۔ شاید یہ دانشور نفسِ انسانی کو روح

سمجھتے ہیں۔ یہ ہرگز روح کی غذا نہیں ہے بلکہ روح کے لیے زہر ہے البتہ نفس امارہ کی غذا ہے کیونکہ یہ سفلی اور غلیظ جذبات کو ابھارتی ہے۔ خواہشِ نفس کے جذبات سے مغلوب ہونا حیوانیت ہے۔ ہر حیوان جذبات سے مغلوب ہوتا ہے جیسے کتا جذبات سے مغلوب ہو کر کاٹتا ہے۔ گانا بجانا سن کر انسان جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو پھر یہ شیطان کی آواز ہے اور اب یہ عالم ہے کہ گانے بجانے کو قوالی کا نام دے کر ساتھ ''شریف'' لگا کر لوگوں نے اسے دین میں شامل کر لیا ہے۔ بھلا طبلے بجا کر اللہ راضی ہوتا ہے! کیا ان لوگوں کو گانے بجانے سے ہی اللہ کی عظمت کا احساس ہوتا ہے، قرآن پڑھ کر نہیں ہوتا، سجدہ کرنے سے نہیں ہوتا، درود شریف پڑھنے سے نہیں ہوتا؟ اللہ تعالیٰ نے شیطان سے فرمایا کہ تو اپنی آواز کا جادو جگا۔ یہ گانے بجانے، قوالیاں شریف، یہ تمام صوتِ شیطان ہے جو جذبات کو برانگیخت کرتا ہے اور حیوانی جذبات کو بندے پر غالب کرتا ہے۔

دین کا کمال:

دین انسان کو جذبات پر غالب کرتا ہے۔ جب روح کو غذا ملتی ہے تو انسان جذبات پر غالب آ جاتا ہے۔ روح کی غذا ذکرِ الٰہی ہے اور جب یہ نصیب ہوتی ہے تو انسان جذبات کے تحت فیصلے کرنے کی بجائے اُن پر غالب آ کر اللہ کی محبت میں فیصلے کرتا ہے۔ عظمتِ انسان یہ ہے کہ جذبات اس کے تابع ہوں اور یہ نعمت عطا کی ہے انبیائے کرامؑ نے۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جذبات پر حاوی کر دیا جس کی گواہی قرآن کریم نے دی ہے کہ جن خوش نصیبوں کو آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت نصیب ہوئی: وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۔۔۔ (الفتح) وہ جذبات پر غالب آ گئے وہ کفر کے مقابلے میں سخت مگر مومنوں کے لیے سراپا محبت تھے۔ یعنی وہ جذبات کے تابع نہیں تھے بلکہ جذبات ان کے تابع تھے۔ جہاں کفر مقابل ہوتا تھا۔ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ۔۔۔ کفر کے لیے بہت شدید تھے اور آپس میں رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۔۔۔ نسیمِ سحر بن جاتے تھے، محبت اور پیار بن جاتے تھے۔

اولاد و مال میں شیطان کی شراکت:

فرمایا: وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۔۔۔ اور ان کے مال اور اولاد میں شامل ہو جا۔ صاف بات ہے جب کوئی ناجائز ذرائع سے مال کماتا ہے تو شیطان کی انگیخت پر ہی کماتا ہے اس لیے اس کی شراکت تو ہو گئی۔ رشوت لیتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، بددیانتی کرتا ہے، کم تولتا ہے، زیادہ مال وصول کرتا ہے یا کوئی بھی ناجائز ذریعہ اختیار کرتا ہے تو اس میں شیطان کی شراکت ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی جب غیر شرعی طریقے سے جنسی رشتہ قائم کرتا ہے تو جو

اولاد ہوگی اس میں بھی شیطان کی شراکت ہوگی۔

شیطان کے وعدے:

فرمایا: وَعِدْهُمْ ۔۔۔اور انہیں لمبے لمبے وعدے دے کہ یہ کریں گے تو یہ ہو جائے گا، وہ کریں گے تو وہ ہو جائے گا۔ شیطان انسانوں کو دنیوی زندگی کے بارے جھوٹے وعدے دیتا ہے لیکن جب موت کا فرشتہ آتا ہے تو سوائے اعمال کے کچھ پاس نہیں رہتا، بالآخر بندہ خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔ ساری عمر دولت جمع کرتے رہتے ہیں، محلات بناتے ہیں بعد میں وہی محلات کھنڈر بن جاتے ہیں اور کوئی ان میں رہنا تک گوارا نہیں کرتا۔ اپنے زمانے میں بادشاہوں نے کیسے کیسے محلات بنائے جن پر سے کوئی پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا تھا وہ آج کھنڈر ہو گئے۔ وہاں غلاظت اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر بن گئے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ میں تمہیں بتا دوں: وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا﴿۶۴﴾ کہ شیطان کے سارے وعدے جھوٹ اور دھوکا ہیں۔ سوائے دھوکا دینے کے اس کے وعدوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اللہ کا بندہ ہونے کی صفت:

اللہ کریم نے یہ بات بھی طے فرما دی: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۔۔۔کہ جو میرے بندے ہوں گے اُن پر زور نہیں چلے گا۔ فرمایا: اِنَّ عِبَادِيْ ۔۔۔جو میرے بندے ہوں گے، جو میری رضا کے طالب ہوں گے اور ہر کام میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کریں گے۔ وہ میرے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع کریں گے تاکہ میری رضا کو پالیں، وہ خالص میرے لیے مجاہدہ کریں گے تو اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لے۔ شرط صرف یہ ہے کہ کوئی واقعی اللہ کا بندہ ہو۔ اب اگر کسی کا مقصد اللہ والوں کا حلیہ بنا کر دولت جمع کرنا ہو تو وہ دولت کا بندہ ہوا، اللہ کا تو نہ ہوا۔ اگر نیکوں کا حلیہ بنا کر شہرت حاصل کرنا مقصود ہو تو وہ شہرت کا بندہ ہوا، اللہ کا نہ ہوا لیکن اللہ کے بندوں پر شیطان کا زور نہیں چل سکتا، اس لیے کہ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا﴿۶۵﴾ اللہ ان کا کارساز، اُن کا پروردگار کافی ہے۔ فرمایا، اُن کا کارساز میں ہوں، ان کے ساتھ میں ہوں تُو وہاں کہاں دم مارے گا۔ جو میرے نہیں ہوں گے، وہ کہاں غرق ہوتے ہیں، ان کی مجھے بھی پروا نہیں۔ جو میری عظمت کو چھوڑ کر تیری بات مانیں گے، تُو جانے اور وہ جانیں، تم دونوں جب میرے پاس آؤ گے تو بھگت لو گے۔

ایک ولی اللہ کا واقعہ:

اللہ کے بندوں میں ایسے بھی ہیں جو شیطان کو تھکا دیتے ہیں۔ ایک بزرگ کے حالات میں پڑھا کہ وہ سحری

کو اٹھتے اور تہجد کے لیے مسجد جاتے تھے۔ وہ علاقہ خاصہ سرد تھا اور سردیوں میں برفباری بھی ہوتی تھی تو انہوں نے دیکھا کہ کوئی شخص لالٹین لیے ہوئے آگے چل رہا ہے اور انہیں مسجد چھوڑ آیا۔ دو، چار دن گزرے تو انہوں نے اُسے روکا اور پوچھا کہ تو کون ہے، میں جب آتا ہوں تو تُو دروازے پر کھڑا ہوتا ہے اور مجھے مسجد کے دروازے تک چھوڑ آتا ہے؟ اس نے کہا میں ابلیس ہوں۔ انہوں نے کہا، بد بخت! تُو کب سے پارسا ہو گیا، تُو کب سے نیکی کرنے لگا؟ ابلیس کہنے لگا، جی برائی کر کے بھی دیکھ لیا تھا، ایک دن آپ کے راستے میں غلاظت پھینک دی تھی اور پھسلن بنا دی تھی چنانچہ آپ کا پاؤں پھسلا اور آپ کے کپڑے ناپاک ہو گئے، آپ واپس گھر گئے آپ نے کپڑے دھوئے، غسل کیا اور آپ عبادت میں مشغول ہو گئے تو میں نے کہا کہ یہ شخص تو بہت ثواب لے گیا۔ تب سے میں یہ روشنی لے آتا ہوں تاکہ آپ گریں نہیں، اپنا معمول کریں مزید ثواب تو نہ لیں۔ یہ اللہ کے بندے ہیں جو شیطان کو بھی مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔

شیطان کا عبادت کرنا:

ابلیس سجدے کرتا رہا، عبادتیں بھی کرتا رہا اور اُن پر درجات بھی مرتب ہوتے رہے لیکن اللہ کریم کے علم میں تھا کہ اس کے اندر اپنی بڑائی کا مادّہ ہے عظمتِ الٰہی کا احساس نہیں ہے۔ یہ خود بزرگ بننا چاہتا ہے، بڑا بننا چاہتا ہے اور اپنے آپ کو بڑا بنانے کے لیے محنت کر رہا ہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ (البقرہ:34) وہ تھا ہی کافروں میں سے، اس کے دل میں کفر چھپا ہوا تھا۔ اس کی عبادت اپنی بزرگی منوانے کے لیے تھی، اللہ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں تھی۔ جب تک اس نے اظہار نہیں کیا تو کام چلتا رہا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ نہ کرنے سے اس کے اندر کی چھپی ہوئی غلاظت ظاہر ہو گئی اور اسے ردّ کر دیا گیا اس پر سزا مرتب ہوئی۔ اللہ کریم کے علم میں تھا کہ اس کے اندر کفر بھرا ہوا ہے اس نے ملمع سازی کر رکھی ہے وہ آج کافر نہیں ہوا بلکہ کفر چھپا ہوا تھا اور ملمع سازی کر رکھی تھی۔ اگر کسی کو پتا بھی ہو کہ یہ بندہ فلاں کو قتل کر دے گا تو اس بات پر وہ اسے سزا تو نہیں دے سکتا۔ سزا تو تب ہی دے گا جب وہ قتل کرے گا۔ اسی طرح نقلی پیر بن جاتے ہیں، نقلی عالم بن جاتے ہیں، نقلی پارسا بن جاتے ہیں۔ لوگوں کی دولت بٹورنے کے لیے کیا کیا حلیے لوگ بناتے ہیں لیکن اندر تو دنیاداری چھپی ہوتی ہے۔

انسان کی ذمہ داری:

انسانوں کو تو اپنی حمیّت زندہ رکھنی چاہیے اور اپنے ازلی دشمن کے سامنے بچھنا نہیں چاہیے اس کی بات نہیں ماننی چاہیے۔ سیدھی سی بات ہے کہ انسان کو مہلت دی گئی ہے اور راستے کی ہدایت کر دی گئی ہے: اِنَّا ھَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا (الدھر 3) اب اس کو دیکھنا ہے کہ وہ شکر کا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے یا ناشکری کا۔

میدانِ حشر میں شیطان کا مکالمہ:

قرآن کریم یہ قصہ بھی بیان فرماتا ہے کہ میدانِ حشر میں جب حساب کتاب ہو چکے گا تو شیطان عرض کرے گا، بارِالٰہا! یہ جو دوزخ جا رہے ہیں یہ مجھ سے بڑے ناراض ہیں، مجھے مہلت دیں تا کہ میں ان سے بات تو کروں۔ مفسرینِ کرام لکھتے ہیں کہ اس کے لیے آگ کا ایک منبر بنا دیا جائے گا اور وہ اس پر چڑھ جائے گا اور کہے گا، لوگو سنو! میں نے تم سے وعدے کیے، تمہیں گناہ، برائی، کفر و شرک کی دعوت دی، میں نے سب جھوٹ بولا۔ اللہ نے اپنے نبیؐ بھیج کر تم سے وعدے کیے، اللہ کے سارے وعدے سچ تھے۔ تم ایسے بد بخت ہو کہ تم نے میرے جھوٹے وعدوں پر یقین کیا اور اللہ کے سچے وعدوں پر یقین نہیں کیا: فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (ابراہیم 22) مجھے لعنت ملامت کیوں کرتے ہو، سب سے زیادہ ملامت اپنے آپ کو کرو کہ تم نے اللہ اور اللہ کے انبیاء کی بات چھوڑ کر میری بات مانی۔ اصل میں قابلِ ملامت تم خود ہو کہ تم نے اللہ کا وعدہ چھوڑ کر، انبیاءؑ کی تعلیمات چھوڑ کر میری بات مان لی، تم تو مجھ سے بھی گئے گزرے ہو تم اپنے آپ پر ملامت کرو مجھ پر کیوں کرتے ہو؟

ابلیس کے مکر و فریب اور اس کی دشمنی واضح کرنے کے بعد توجہ دلائی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی منعم حقیقی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ارد گرد ہمہ وقت موجود ہیں جنہیں لوگ استعمال کرتے ہیں۔

توحید کے دلائل:

فرمایا: رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿٦٦﴾ تمہارا ربّ تم پر کس قدر مہربان ہے کہ اس نے سمندروں میں جہازوں کے سفر کو تمہارے لیے ممکن بنا دیا تا کہ تم اپنی روزی تلاش کر سکو۔ تم اپنے ربّ کی مہربانیوں کے خود گواہ ہو جب تم سمندری سفر پر ہوتے ہو: وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿٦٧﴾ اور کسی طوفان میں گھر جاتے ہو تو اس وقت گھبراہٹ اور پریشانی میں اپنی جان بچانے کے لیے اُسی ذاتِ حقیقی کو پکارنے پر مجبور ہو جاتے ہو اور تمہارے فرضی معبودوں کا خیال تک تم سے محو ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ تمہیں طوفانوں سے نکال کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو اپنی پرانی ڈگر پر واپس آ جاتے ہو۔ انسان کس قدر ناشکرا ہے۔

اللہ کریم تمام انسانوں پر کس قدر مہربان ہیں کہ بندوں کی ناشکری کے باوجود انہیں توحید کی طرف لانے اور شرک سے بچانے کے لیے عمدہ سے عمدہ دلائل دیے۔ اب اللہ کریم کے قادرِ مطلق ہونے کا بیان ہے

فرمایا: اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِیْلًا ﴿۶۸﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَكُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَیُرْسِلَ عَلَیْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًا ﴿۶۹﴾

فرمایا، تم خشکی پر پہنچنے کے بعد پھر سے ناشکری کرنے لگ جاتے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ اب تم محفوظ ہو گئے ہو حالانکہ تم کبھی بھی اس کی گرفت سے باہر نہیں ہو سکتے۔ سمندر ہو یا خشکی، پہاڑ ہوں یا دریا، ہوا ہو یا بارش اس قادرِ مطلق کا حکم سب پر چلتا ہے۔ وہ جب چاہے، جہاں چاہے عذاب میں گرفتار کر لے۔ وہ چاہے تو تمہیں خشکی میں پہنچا کر زمین میں دھنسا دے یا ہوا کا عذاب بھیج دے یا سمندر میں واپس لے جا کر طوفانوں کی نذر کر دے۔ وہ تمہارے کفر کے سبب ہر طرح کا عذاب دینے پر قادر ہے اور کوئی بھی ایسا نہیں جو اس قادرِ مطلق کے عذابوں سے تمہیں بچا سکے۔

بنی آدم کی فضیلت کا سبب:

فرمایا: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ﴿۷۰﴾ بنی آدم کو اللہ کریم نے اشرف المخلوقات ٹھہرایا ہے۔ انسانوں کو جہاں جسمانی، عقلی، مادّی لحاظ سے بہترین اندازے پر تخلیق فرمایا ہے اور متناسب اعضاء و جوارح عطا فرمائے ہیں، حواس کی نعمتوں سے نوازا ہے، عقل و فہم عطا کی ہے، قوائے بدن کو حسین امتزاج دیا ہے، خشکی اور تری کی بہترین نعمتیں عطا کی ہیں۔ پاکیزہ رزق عطا فرمایا ہے اور پاکیزہ ذوق دیا ہے وہاں اللہ کریم نے بنی آدم کو اپنی بہترین نعمت عطا کی ہے جس کے سبب وہ اشرف المخلوقات ہے اور وہ ہے نورِ نبوت۔ بنی آدم کی فضیلت کا اصل سبب نورِ نبوت ہے کہ اللہ نے نبوت صرف انسانوں میں رکھی ہے۔ تمام انبیاءؑ بنی آدمؑ میں سے ہوئے ہیں۔

اللہ کریم اپنی نعمتوں کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ بنی آدمؑ کو اس کی فضیلت کا احساس دلا کر متوجہ کر رہے ہیں کہ انسان اپنے اس مقام کو پہچانے جس پر اللہ نے اسے فائز کیا ہے اور اللہ کا شکر گزار رہے۔ اور جو لوگ بنی آدم میں سے ہونے کا شرف پانے کے باوجود کفر کی تاریکیوں میں ہی گم رہنا پسند کرتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں ایسے لوگوں کو قیامت کے دن اپنے فرضی معبودوں اور ان پیشواؤں کے ساتھ جوابدہی کے لیے حاضر کیا جائے گا۔

سورۂ بنی اسرآءیل رکوع 8 آیات 71 تا 77

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿٧١﴾ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿٧٢﴾ وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿٧٣﴾ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿٧٤﴾ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٧٦﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿٧٧﴾

اور جس دن ہم تمام لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے تو جن کی کتاب ان کے داہنے ہاتھ میں دی جائے گی سو وہ (خوش ہوکر) اپنی کتاب (اعمال نامہ) کو پڑھیں گے اور ان پر ذرہ بھر زیادتی نہ کی جائے گی ﴿۷۱﴾ اور جو شخص اس (دنیا) میں اندھا ہے سو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور (نجات کے) راستے سے بہت دور ﴿۷۲﴾ اور یہ اس سے آپ کو بہکانے میں لگے تھے جو ہم نے آپ پر وحی بھیجی ہے تاکہ آپ اس کے سوا ہماری نسبت اور باتیں بنالیں اور اس وقت وہ آپ کو دوست بنالیتے ﴿۷۳﴾ اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو (ہوسکتا ہے) آپ ان کی طرف کسی قدر مائل ہونے لگتے ﴿۷۴﴾ (اگر ایسا ہوتا) تو ہم آپ کو زندگی میں بھی دُگنا اور مدت حیات پورا ہونے کے بعد بھی دُگنا (عذاب) ضرور چکھاتے

پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کسی کو بھی اپنا مددگار نہ پاتے ﴿۷۵﴾ اور یہ لوگ اس سرزمین سے آپ کے قدم ہی اکھاڑنے لگے تھے تاکہ آپ کو اس سے نکال دیں اور پھر (اگر ایسا ہوتا تو) آپ کے بعد یہ بھی بہت کم رہ پاتے ﴿۷۶﴾ جو پیغمبر ہم نے آپ سے پہلے بھیجے تھے (ان کے باب میں ہمارا) یہی قاعدہ رہا ہے اور آپ ہمارے (اس) قاعدے میں تغیر وتبدل نہ پائیں گے ﴿۷۷﴾

تفسیر ومعارف

فرمایا: یَوۡمَ نَدۡعُوۡا کُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمۡ ۔۔۔فرمایا، وہ وقت آ رہا ہے جب تمام لوگوں کو ان کے پیشواؤں سمیت جمع کیا جائے گا۔ دنیا میں جو، جس کا اتباع کرتا تھا وہی اس کا پیشوا ہوگا۔ جن لوگوں نے حق کو مانا ہوگا ان کے پیشوا نیک ہوں گے، جن لوگوں نے حق سے روگردانی کی ہوگی ان کے پیشوا بدکردار ہوں گے۔ اللہ کریم اس دن سب لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ جمع کریں گے۔ نیکوں کے گروہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی شان کے لحاظ سے بے مثل و بے مثال ہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ، اولیائے اُمت، علمائے حق یہ سارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ کے پیادے ہیں، اللہ کی عظمت کی طرف بلانے والے ہیں۔ ان کا اپنا کچھ نہیں ہے۔ یہ جو کہتے ہیں وہ اسی بارگاہ کا پیغام ہوتا ہے۔ فرمایا، ہر نبیؑ، ہر امام، ہر پیشوا وہاں موجود ہوگا۔ جنہوں نے ان کی بات مانی ہوگی وہ بھی وہاں موجود ہوں گے۔ جنہوں نے نہیں مانی ہوگی وہ بھی موجود ہوں گے۔ سب سے پوچھا جائے گا۔

فَمَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیۡنِهٖ ۔۔۔پھر جن لوگوں کو ان کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں تھما دیا جائے گا فَاُولٰٓئِکَ یَقۡرَءُوۡنَ کِتٰبَهُمۡ ۔۔۔وہ بڑے خوش ہو کر اپنا اعمال نامہ پڑھیں گے اور لوگوں کو بتائیں گے کہ دیکھو مجھے اللہ نے یہ انعام دیا۔ میرے اعمال قبول ہو گئے، الحمدللہ میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بڑے فخر سے اپنا اعمال نامہ پڑھے گا اور اللہ کا شکر بجالائے گا۔ وَلَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا ﴿۷۱﴾ کسی سے کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ اگر برائی کرے گا تو انسانی حیثیت سے کرے گا۔ اس برائی کی جو سزا مقرر ہے وہی دی جائے گی، اسے بڑھایا نہیں جائے گا لیکن اللہ پناہ دے۔ سزا بہر حال سزا ہے۔ جو دنیا میں نیکی کرے گا وہ اپنی حیثیت کے مطابق ہی کرے گا لیکن جب اللہ کریم اجر دیں گے تو اپنی شان کے مطابق دیں گے۔

آخرت کے اندھے:

فرمایا: وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۝ اور جولوگ یہاں اندھے ہیں وہ آخرت میں بھی اندھے ہوں گے۔ جو دنیا میں عظمتِ الٰہی کو نہیں دیکھ سکتے، جو صداقتِ پیغمبر کو نہیں دیکھ سکتے، جو حق کو نہیں دیکھ سکتے پھر انہوں نے آنکھوں سے کیا دیکھا؟

دنیوی، مادّی، جسمانی آنکھیں تو جانوروں کے پاس بھی ہیں۔ پرندوں، حیوانوں کے پاس بھی ہیں۔ شاہینوں اور کرگس کی بھی یہی آنکھیں ہیں۔ یہ آنکھ تو ہر ایک کے پاس ہے۔ اس سے محض دنیا دیکھی تو کیا دیکھا! مقصد تو یہ تھا کہ دنیا کو دیکھ کر اس دنیا کے بنانے اور چلانے والے کی عظمت سے آشنا ہوتے۔ مزہ تو یہ تھا کہ اس کائنات کو دیکھ کر دعوتِ حق قبول کرکے اور عظمتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم سے آشنا ہو کر آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اتباع کرتے۔ نہ صرف اعضاو جوارح سے بلکہ صمیم قلب سے، دل کی گہرائیوں سے اتباع کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی رضا کے طالب ہوتے، اللہ کے قرب کے طالب ہوتے۔

اگر کسی نے یہ آنکھیں اس کام کے لیے استعمال نہیں کیں تو باقی غذا و دوا کے لیے، دنیوی فوائد کے حصول کے لیے تو ہر کوئی انہیں استعمال کر رہا ہے۔ جانور بھی دیکھ لیتے ہیں کہ اس طرف سبز چارا ہے اور اُس طرف خشک۔ وہ بھی دیکھ کر سبز چارے پر لپکتے ہیں۔

انسان نے بھی اگر صرف دنیا ہی کے لیے استعمال کی تو گویا انہوں نے بصارت استعمال ہی نہیں کی ایسے لوگ دنیا میں بھی ہدایت کے حصول سے آنکھیں بند کیے ہوئے تھے، زندگی میں بھی اندھے تھے، قیامت کو اٹھیں گے تو بھی اندھے ہی ہوں گے۔ آخرت حقیقی جہان ہے وہاں واقعتاً وہی ملے گا جس کا کوئی مستحق ہوگا۔

وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۝ اس وقت ان کو سمجھ آئے گی کہ وہ نجات کے راستے سے بہت دور نکل گئے۔ ساری زندگی غلط سمت چلتے رہے، ساٹھ، ستر، اسی یا سو برس حق سے دور جانے میں ہی بسر کر دیے۔ راہِ نجات تو بہت پیچھے رہ گئی، یہ تو بہت دور نکل آئے۔

کفار کی فتنہ انگیزی سے آگاہی:

فرمایا: وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ۔۔۔ اس آیہء مبارکہ میں کفار کی فتنہ انگیزی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو آگاہ فرمایا جا رہا ہے۔ فرمایا، ذرا ان کی عقل تو دیکھو یہ اپنے تئیں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو بہکانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلّم جو ارشاد

فرماتا ہے وہ تو ان سے برداشت نہیں ہوتا تو یہ اپنی طرف سے مشورے دینا شروع کر دیتے ہیں گویا چاہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کی بات کو چھوڑ دیں اور ان کی بات کو مان لیں۔ فرمایا، ان بے عقلوں کی سوچ تو دیکھو! الٹی باتیں کرتے ہیں، اپنی گھڑی ہوئی رسومات کی باتیں، اپنے آباءواجداد کی رسومات کی باتوں کے مشورے دیتے ہیں۔

ان کو تو چاہیے تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاداتِ عالی کو اپنی جان پر لیتے، ایک ایک لفظ کو دل میں اتارتے، ایک ایک جملے کو نگاہوں سے چومتے، ایک ایک حکم کو دل وجان سے قبول کرتے اور اس پر جان دے دیتے لیکن یہ ایسے بیوقوف ہیں کہ جو بات آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ارشاد فرماتے ہیں وہ نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ جو مشورے یہ دیتے ہیں انہیں مانا جائے۔ یہ ایسے جاہل ہیں کہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلّم بھی اللہ کے حکم کے خلاف کوئی بات فرما دے۔ نہ یہ ممکن ہے اور نہ ایسا کبھی ہوسکتا ہے۔

اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ۔۔۔ یہ جانتے ہوئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس اللہ کا کلام ہوتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ارشاد فرماتے ہیں، یہ اپنے مشورے منوانے پر مصر ہیں، کتنے جاہل ہیں! کہاں عظمتِ ارشاد باری، کہاں ارشادِ نبوت اور کہاں ایک بیوقوف انسان جو خود گمراہ ہے۔ اس کے مشورے کی حیثیت کیا ہے! وَاِذًا لَّا تَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿٧٣﴾ اگر خدانخواستہ آپ ان کے مشوروں پر عمل کریں تو پھر یہ آپ کو دوست بنالیں۔

مقامِ غور:

قرآن حکیم کی اس آیہءمبارکہ سے واضح ہو رہا ہے کہ اہلِ حق اور اہل باطل کا مقابلہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اگر باطل وگمراہ لوگ اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اپنی باتیں ٹھونسنا چاہتے تھے تو پھر اور کون ہے جس پر یہ نہیں ٹھونسنا چاہتے۔ جب بھی ان کی بات نہ مانی جائے گی یہ مخالفت کریں گے۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں بلکہ حق پر ہونے کی دلیل ہے کہ کفر ہمیشہ حق کی مخالفت کرتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات معصوم عن الخطا:

فرمایا: وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿٧٤﴾ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو تو حفاظتِ الٰہیہ حاصل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے عمل کا محافظ تو اللہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے جو عمل صادر ہوتا ہے وہ صحیح ترین ہے اور جو بات صادر ہوتی ہے وہ بھی صحیح ترین ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قول وفعل کا ضامن اللہ ہے۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حفاظت فرماتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ ستودہ صفات تو ایسی ہے، اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ایسا مزاج وہبی طور پر عطا فرمایا ہے کہ آپ ان کی برائی کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات میں اللہ نے تخلیقاً وہ حقانیت اور سچائی رکھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ذرہ برابر حق سے دور ہونا پسند نہیں کرتے۔ تقاضائے بشریت تو یہ تھا کہ رشتہ داری کا لحاظ کرکے، کسی دوستی کی خاطر کسی کی بات سنتے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نہیں سنتے اس لیے کہ اللہ کریم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ ہیں۔

مشرکینِ مکہ کے وفد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت عالی میں آتے تھے۔ اپنی فتنہ پروری کو چھپا کر یوں کہتے کہ ہم بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ کی محفل میں شہر کے غریب غرباء، غلام و مزدور، اس طرح کے لوگ بیٹھے ہوتے ہیں اور ہم شہر کے روساء اور سردار ہیں ہم ان کے ساتھ کیسے بیٹھ جائیں لہٰذا آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) ہمارے ساتھ کچھ رعایت کریں اور ہمارا کوئی وقت مقرر کر دیجیے کہ جب ہم آئیں تو غریب اور مسکین مسلمانوں کو وہاں سے اٹھا دیا جائے۔

اللہ کریم فرماتے ہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو تو عصمتِ نبوت حاصل ہے، حفاظتِ الٰہیہ حاصل ہے آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) تو ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے کسی کا امیر و رئیس ہونا یا فقیر و مفلس ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جو جتنا متقی ہے، پرہیزگار ہے، اللہ کا قرب چاہنے والا ہے۔ آپ کے نزدیک وہ اتنا معزز ہے لیکن یہ تکبر میں مبتلا ہیں، اسی تکبر کے باعث یہ اپنے لیے خاص مقام چاہتے ہیں۔ اگر یہ ایمان لانا چاہیں تو پھر انہیں رئیس و غلام کی تفریق میں نہیں پڑنا چاہیے کہ مومن تو سب مومن ہیں خواہ امیر ہیں یا فقیر۔

فرمایا، اگر ہم آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو عصمتِ نبوت دے کر ثابت قدم نہ رکھتے تو ممکن ہے، نہایت قلیل حد تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا میلان ان کی بات کی طرف ہو جاتا۔ شانِ رسالت یہ ہے کہ ایک تو انبیاء کرامؑ کا مزاج تخلیقی طور پر معصوم عن الخطا ہوتا ہے، پاکیزہ اور پرہیزگار ہوتا ہے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم طبعاً بھی ان کی طرف متوجہ نہ ہوتے اور دوسرا آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو عصمتِ نبوت حاصل ہے، حفاظتِ الٰہیہ حاصل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ہرگز ان کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔ یعنی یہ صرف امکان تھا کہ کسی قدر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا میلان ان کی بات کی طرف ہو جاتا وہ بھی اس لیے کہ ان سرداروں کی بات مان لینے سے یہ شاید اسلام لے آئیں۔

فرمایا، اللہ کی حفاظت کے سبب، اللہ کی عطا کردہ شانِ رسالت اور معصومیت کے سبب آپ ہرگز ان کی طرف متوجہ نہ ہوں گے لیکن بفرضِ محال آپ ایسا کرتے تو: **اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا۝** آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو مخاطب کرکے ارشاد فرمانے سے مراد

یہ ہے کہ پھر دنیا میں کوئی دوسرا ایسا نہیں جو ایسا عمل کر کے اس کی سزا سے بچ سکے۔ فرمایا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایسا کرنے والے کو اللہ کریم زندگی میں دُگنا عذاب دیتے اور بعد از مرگ اس کے عذاب کو مزید دوگنا کر دیتے۔ پھر اس کو ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار بھی نصیب نہ ہوتا۔ اس آیہء مبارکہ میں اگرچہ بظاہر خطاب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو ہے لیکن تاکید اُمت کو ہے۔

ارشادِ باری کی روشنی میں جائزہ:

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ مومن اگر تھوڑا سا بھی کافر کے رویوں کو اپنائے گا، دل میں کافر کی تھوڑی سی بھی عظمت بٹھائے گا، ان جیسا حلیہ، ان کے رواجات اور طور اطوار اپنا لے گا تو ان کی ذہنی غلامی میں آجائے گا۔ یہ وہ جرم ہے جس کی سزا دنیوی زندگی کا جہنم بن جانا ہے اور آخرت میں دگنا عذاب پانا ہے۔

اس آیہء مبارکہ کی روشنی میں اپنا قومی کردار دیکھا جائے، دنیا بھر کے مسلمان ملکوں کے حکمرانوں کے رویے اور فیصلے دیکھے جائیں تو سمجھ آجاتی ہے کہ دنیا بھر میں مسلمان ہی کیوں مارے جارہے ہیں، کیوں رسوا ہو رہے ہیں؟ ذرا غور کریں تو پتا چلے گا کہ ناموں کا اختلاف ہے، شکل اور حلیہ دیکھ کر پتا نہیں چلتا کہ کون مسلمان ہے، کون عیسائی، کون یہودی، کون بت پرست۔ انہیں صلوٰۃ گراں گزرتی ہے، صلوٰۃ کے لیے ان کے پاس فرصت نہیں۔ رات دو بجے سوتے ہیں، فجر کے لیے اٹھ نہیں سکتے۔ بارہ بجے اٹھ کر ناشتہ کرتے ہیں۔ ناشتے کا اہتمام بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسا یہودیوں، عیسائیوں کا ہے۔ جب سب اطوارِ زندگی پر کفار کی عظمت کی چھاپ لگی ہوئی ہے تو اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ قرآن کا وعدہ سچا ہے کہ ایسے لوگوں کو زندگی میں بھی دگنا عذاب دیا جائے گا اور آخرت میں بھی۔

وطنِ عزیز میں بھی ہر طبقہ دوسروں کے حقوق دبانے میں لگا ہوا ہے۔ سبزی فروش، دودھ فروش، اعلیٰ عہدوں کے حامل، تعلیم یافتہ سب کردار سے عاری ہیں۔ حکمرانی اور سیاست فریب، دھوکہ دہی، لوٹ کھسوٹ کا نام ہے۔ ہر سیاستدان نے مجرموں اور پیشہ ور بدمعاشوں کی پشت پناہی کر رکھی ہے۔ وہی انہیں ووٹ لے کر دیتے ہیں اور دن رات جرائم کرتے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں پکڑتا، انہیں سیاستدانوں کا تحفظ حاصل ہے۔

وطنِ عزیز کا کوئی قانون اسلامی نہیں کافروں کا بنایا ہوا ہے۔ معیشت میں سود ہے، معاشرت ہندوانہ ہے، تعلیم طبقاتی ہے۔ رواجات یہودیوں، عیسائیوں کے ہیں، حلیہ اور طور اطوار مغرب کی نقالی ہے وطنِ عزیز پر کتنے صدر، وزیر اعظم اور جرنیل حکمران ہوئے کسی نے ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنے کی حقیقی کوشش نہیں کی۔ ہم خود بھی اپنی ذات پر اسلام نافذ نہیں کرتے تو بدنصیبی ہے کہ ملک ہے، عدالتیں ہیں، حکمران ہیں لیکن اسلامی احکام لاگو نہیں ہیں۔ پھر

اس بات کا شکوہ کیا کہ ہم پر عذاب مسلط رہتے ہیں، زندگی اجیرن رہتی ہے۔ قرآن میں اللہ نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ اگر تم کفار کی ذہنی غلامی کرو گے، ان کی مشابہت اختیار کرو گے تو یاد رکھو تمہیں مزہ چکھادیں گے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دگنا عذاب ہوگا۔ آج مسلمانوں پر زندگی تنگ ہے، کون سا عذاب ہے جو ہم پر مسلط نہیں۔ جو عذاب اللہ مسلط کرے اسے ہٹانے کے لیے اللہ کے مقابلے میں کوئی ایسا نہیں ملے گا جو اس عذاب کو ہٹادے۔ اس عذاب الٰہی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ سنت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنایا جائے، اللہ کے دین کی پناہ میں آیا جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا خلوصِ دل سے اتباع کیا جائے۔ صرف اسی صورت میں حفاظتِ الٰہیہ نصیب ہوسکتی ہے۔

قانونِ الٰہی:

اللہ کا قانون یہ ہے کہ جہاں نبی علیہ السلام موجود ہوتے ہیں، انؑ کے ہونے کی برکت سے کفار بھی عذاب سے بچے رہتے ہیں۔ فرمایا: وَاِنْ کَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَکَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْکَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَکَ اِلَّا قَلِیْلًا ۞ فرمایا، کافر و مشرک پوری کوشش کر رہے ہیں، ان کی دلی خواہش ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی سرزمین سے نکال دیں۔ یہ جانتے ہیں کہ یہ دلائل کے میدان میں ناکام ہوگئے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو تبلیغ سے نہیں روک سکتے تو چاہتے ہیں کہ کم از کم اپنے شہر سے تو نکال دیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی موجودگی کی برکت سے یہ کافر و مشرک، کفر و شرک پر رہنے کے باوجود مامون ہیں۔ اگر یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو مکہ سے نکال دیں گے تو پھر خود بھی یہاں نہ رہ سکیں گے۔ ان پر عذاب آنے شروع ہوجائیں گے۔ اور وہی ہوا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہجرت فرمائی تو اہلِ مکہ پر کبھی قحط مسلّط ہوا، کبھی بدر میں ذلیل ہوئے، اُحد میں مارے گئے، میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور آٹھ ہجری میں ان کی ساری شان وشوکت خاک میں مل گئی جب مکہ مکرمہ اسلامی ریاست میں شامل ہوگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہجرت فرمانے کے بعد سوائے تباہی بربادی کے اور نابود ہونے کے انہیں کچھ نہ ملا۔

جس طرح اہلِ مکہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اور عذاب کو پالیا تھا اسی طرح آج ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی سے نکال دیں تو ہم بھی اسی آیت کے بتائے گئے نتائج کے مستحق ہیں۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اندازِ زندگی اپنانا گوارا نہ کریں تو یہ بھی وہی بات ہے جو اس آیت میں کہی گئی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے انداز ہماری زندگیوں سے نکل جائیں گے تو پیچھے سوائے عذاب کے کچھ نہیں بچے گا۔

ضرورت ہے کہ ہم اپنی سوچ درست کریں۔ ہم الٹ سوچتے ہیں۔ ہمیں اللہ سے شکایت ہے کہ اللہ ہماری

دعا نہیں سنتا، اللہ ہم پر رحم نہیں کرتا، اللہ کافروں کو خوب دیے جا رہا ہے ہمیں سوائے ذلت کے کچھ میسّر نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ میں خود کیا کر رہا ہوں؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے بتائے ہوئے طریقوں سے انحراف کر کے میں خود کتنا بڑا ظلم کر رہا ہوں۔

اگر ایک طرف باغات ہوں دوسری طرف آگ بھڑک رہی ہو اور بندے کو اختیار ہو کہ وہ نہروں کے کنارے، حوضوں کے کنارے، پھولوں اور سبزے میں بیٹھنا چاہتا ہے یا بھڑکتی آگ میں گھستا ہے تو پھر وہ اللہ سے کیسے شکایت کر سکتا ہے کہ تو مجھے جلا رہا ہے۔

علاج آج بھی یہی ہے کہ ہم اجتماعی طور پر توبہ کریں۔ اپنے اخلاق، عادات، اطوار حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے لیں، سیرتِ طیبہ سے لیں، متقدمین سے لیں، علمائے حق سے لیں، اہل اللہ سے لیں اور اس پر کاربند ہو جائیں تو آج بھی کایا پلٹ ہو جائے۔

فرمایا، کافروں کی تو خواہش ہے، یہ بڑی شدت سے چاہتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو اس سرزمین سے نکال دیا جائے، ہجرت پر مجبور کر دیا جائے لیکن انہیں یہ بتا دیجیے کہ اگر آپ اس سرزمین کو چھوڑ دیں گے تو یہ لوگ بھی سکھی نہیں رہیں گے بلکہ یہ رہیں گے ہی نہیں سوائے تھوڑے لوگوں کے۔ اور چشمِ فلک نے دیکھا کہ بعد میں یہ لوگ کس طرح بدر واحد کے نتیجے میں جہنم واصل ہوئے اور آٹھ ہجری میں ساری ریاست ہی گنوا بیٹھے اور مکہ مکرمہ فتح ہوا اسلامی ریاست بن گئی۔

سُنّتِ الٰہی:

فرمایا: سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا۝ یہ سنّتِ الٰہیہ ہے، قانونِ قدرت ہے، اللہ کا طریقہ ہے کہ جب کہیں سے قوم انبیاءؑ کو رخصت کر دیتی ہے، نکلنے پر مجبور کر دیتی ہے تو اس کے پیچھے پھر صرف تباہی آتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے جو رسولؑ ہم نے مبعوث فرمائے ان کی تاریخ پڑھ لیجیے۔ جب قوم نے ان کو نکال دیا تو جہاں سے نکالا وہاں تباہی و بربادی آ گئی۔ جن قوموں نے اللہ کے نبیوں کو ٹھکرا دیا اللہ نے انہیں ٹھکرا دیا۔ وہ غرق ہو گئے، کہیں زمین پھٹ گئی اس میں سما گئے، کہیں آسمانوں سے آگ برسی، کہیں ہواؤں نے پٹخ پٹخ کر مار دیا اور کہیں پانی کے طوفانوں میں غرق ہو گئے۔ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا۝ اللہ کے طریقوں میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ کوئی ایسا نہیں جو اللہ کے قاعدے اور ضابطے تبدیل کر سکے۔ اللہ کے ضابطے مستقل ہیں۔ آپ انبیاءؑ کی تاریخ پڑھ لیں یہ حقائق واضح نظر آئیں گے۔ فرمایا، آپ شروع سے لے کر آج تک ہمارے طریقے میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔ اللہ کا قانون کوئی بدل نہیں سکتا۔

سورۂ بنی اسرآءیل رکوع 9 آیات 78 تا 84

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِىْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِىْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّىْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾ وَاِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾

سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) نمازیں اور صبح کو قرآن پڑھا کریں بے شک صبح کے وقت کا قرآن (نماز) پڑھنا (فرشتوں کی) حاضری کا وقت ہے ﴿۷۸﴾ اور کسی قدر رات کے حصے میں سو اس (قرآن) کے ساتھ تہجد (رات کے نوافل) پڑھا کیجیے یہ آپ کے لیے (فرض نمازوں کے علاوہ) زیادہ ہے امید ہے کہ آپ کا پروردگار آپ کو مقام محمود میں جگہ عطا فرمائے گا ﴿۷۹﴾ اور آپ دعا کیجیے کہ اے میرے پروردگار! مجھے (مدینہ منورہ میں) اچھی طرح داخل کیجیو اور (مکہ مکرمہ سے) اچھی طرح نکالیو اور مجھے اپنے پاس سے ایسا غلبہ دیجیو جس کے ساتھ آپ کی مدد ہو ﴿۸۰﴾ اور فرما دیجیے کہ حق آ گیا اور باطل گیا گزرا ہو گیا بے شک باطل نابود ہونے والا ہے ﴿۸۱﴾ اور ہم قرآن

کے ذریعے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لیے شفاء اور رحمت ہے اور ظالموں کے حق میں تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے ﴿۸۲﴾ اور جب ہم انسان کو نعمت بخشتے ہیں تو وہ منہ موڑ لیتا ہے اور اپنی کروٹ پھیر لیتا ہے اور جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ناامید ہو جاتا ہے ﴿۸۳﴾ فرما دیجیے کہ ہر شخص اپنے طریقے پر کام کر رہا ہے سو آپ کا پروردگار اس (شخص) سے خوب واقف ہے جو سب سے درست راستے پر ہے ﴿۸۴﴾

تفسیر ومعارف

گزشتہ رکوع میں کفار ومشرکین کی سازشوں کا ذکر تھا۔ اس رکوع میں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کی پناہ میں آنے سے ہی ان سازشوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں عبادات کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ فرمایا: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّیْلِ ۔۔۔ سورج ڈھلنے سے رات کی تاریکیوں تک صلوٰۃ ادا کیجیے، قائم کیجیے۔ قرآن نے ایک مختصر سا جملہ کہہ کر تمام نمازوں کا ذکر کر دیا۔ سورج ڈھلتا ہے تو ظہر ہو جاتی ہے، پھر عصر، پھر مغرب، رات کی تاریکی چھا جانے پر عشاء پھر فجر۔

اللہ کریم نے مومن کے لیے سونے جاگنے کا، آرام کرنے، عبادت کرنے کا پورا لائحہ عمل اوقات کے ساتھ طے کر دیا ہے۔ افسوس کہ اب یہود ونصاریٰ کے اتباع میں، ان کے پیچھے لگ کر اکثریت نے اوقات تبدیل کر دیے ہیں۔ رات دیر تک دکانوں پر بیٹھتے ہیں، آدھی رات کو گھر پہنچتے ہیں، پھر غسل کر کے رات کا کھانا، سونے تک رات کے اڑھائی بج جاتے ہیں۔ جو جاگنے کا وقت ہے اس وقت سو جاتے ہیں آدھا دن گزار کر اٹھتے ہیں پھر ناشتہ کر کے بازار پہنچ جاتے ہیں، کہاں کی صلوٰۃ اور کہاں اوقاتِ صلوٰۃ! اللہ کریم توبہ کی اور اصلاح کی توفیق بخشیں۔

حدیث کے بغیر قرآن کے احکام پر عمل ممکن نہیں:

اللہ کریم نے اس ایک آیہء مبارکہ میں پانچوں نمازوں کی ادائیگی کا حکم سمو دیا: لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّیْلِ ۔۔۔ کہ سورج ڈھلنے سے لے کر رات کی تاریکیوں تک صلوٰۃ قائم کریں۔ اب اس کی تفصیل اور اس کا طریقہ کون بتائے گا؟ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ ہر صلوٰۃ کی رکعات کتنی ہوں گی، رکعات میں کیا پڑھنا ہے، رکوع وسجود کیسے

کرنے ہیں، قومہ، جلسہ کیسے ہوگا یعنی صلوٰۃ کی ادائیگی کیسے کرنا ہے؟ صلوٰۃ کے لیے وضو کی ضرورت ہے، وضو کیسے کرنا ہے؟ یہ ساری تفصیل حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات میں، احادیثِ مبارکہ میں ملتی ہے۔ جو لوگ حدیث شریف کا انکار کرتے ہیں کہ ہمارے لیے قرآن کافی ہے تو وہ بتائیں کہ قرآن کے اس اجمالی حکم کی تفصیل کیسے جانیں گے اور کیسے عمل کریں گے؟

صلوٰۃ الفجر:

فرمایا: وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾ اور صبح کو قرآن پڑھا کریں۔ اگر کوئی صبح قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو بہت اچھی بات ہے ورنہ فجر کی صلوٰۃ میں قرآن پڑھا جاتا ہے۔

اس آیہء مبارکہ میں وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ۔۔۔ سے مراد فجر کی صلوٰۃ میں، قیام میں قرآن پڑھنا ہے صاحبِ تفسیرِ مظہری اور دیگر مفسرین نے یہی معنی مراد لیے ہیں۔

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾ فجر میں قرأتِ قرآن، حاضری کا وقت ہے۔ فرمایا، دن گزرا، رات کی صلوٰۃ یعنی عشاء ادا کر کے بندہ سو گیا، اس کی شب نیند میں گزر گئی۔ اب علی الصبح اٹھ کر وضو کرے، لباس پاک، جسم پاک ہو اور صلوٰۃ کے لیے کھڑا ہو جائے اور قرآن پڑھے، سب سے پہلے بارگاہِ الوہیت میں حاضری ہو، اسے اللہ کے قرب کی لذتیں نصیب ہوں، اسے زندگی کے لیے راہنمائی ملے، دن بھر کے کاموں میں اطاعتِ الٰہی اور اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا احساس اجاگر رہے، اسے خلوص عطا ہو، اطمینانِ قلب عطا ہو، اس کی زندگی میں سکون ہو کیونکہ یہ فجر کا قرآن، یہ حضوری کا وقت ہے کہ حضورِ حق میں حاضر ہو۔

اس وقت اللہ کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں جو قلوب کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ یہ وقت فرشتوں کے بھی حاضر ہونے کا وقت ہے۔

جس طرح بدنِ انسانی کو غذا کی ضرورت ہے اسی طرح انسان کی روح کو عبادات کی غذا چاہیے۔ جو عبادات اللہ کریم نے فرض قرار دی ہیں وہ ہر حال میں ادا کرنی ہیں، وہ فرائض ایمان کے لیے سانس کا درجہ رکھتے ہیں۔ جس نے فرض صلوٰۃ چھوڑ دی اس نے گویا ایمان کا سانس روک دیا۔ جیسے کسی کا سانس روک دیں تو وہ قریب المرگ ہو جاتا ہے اسی طرح جس نے جتنی دیر فرائض ترک کیے اتنی دیر وہ ایمانی طور پر قریب المرگ رہا۔ زیادہ دیر اس حالت میں رہے تو ایمان ہی چلا جاتا ہے۔ جو کام بندے کی بقا کے لیے ضروری ہے اسے اللہ نے فرض قرار دے دیا ہے لہٰذا فرائض بوجھ نہیں اللہ کا احسان ہیں۔

تہجد:

صلوٰۃ، تلاوتِ قرآن اور تمام عباداتِ الٰہیہ روح کی غذا ہیں۔ فرمایا، فرائض اپنی جگہ لازم ہیں لیکن روح کی غذا کے دستر خوان کو نوافل، تہجد سے پُرلطف بنائیں۔ جس طرح گندم بھون کر محض دانے پھانک لینے سے بھی پیٹ بھر جائے گا لیکن لطف نہیں آئے گا اسی طرح روح کے لیے بھی اہتمام کیا جائے۔ طعام کے لیے دستر خوان کو کتنی نعمتوں سے پُر کیا جاتا ہے اسی طرح روح کے لیے بھی خوانِ نعمت کو وسیع کریں۔ فرمایا: وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ ۔۔۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ راتوں کو اٹھ کر تہجد ادا کیجیے۔ تہجد جدوجہد سے ہے، اس میں مشقت ہے۔ افضل یہ ہے کہ کچھ دیر سو گئے پھر آنکھ کھلی، اٹھ کر وضو کیا، لباس درست کیا، قبلہ رو ہو کر تہجد ادا کی۔

تہجد کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا معمول:

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی عادتِ مبارکہ تھی کہ وتر تہجد کے ساتھ پڑھتے تھے۔ آٹھ رکعت تہجد کے پڑھتے اس طرح وتر ملا کر گیارہ رکعت ہو جاتیں۔ پھر وتر کا وقت ختم ہوا، فجر کا شروع ہو گیا تو دو رکعت سنت فجر کی پڑھ لیتے، یوں تیرہ رکعات ہو جاتیں۔ اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے چھ رکعت تہجد بھی ثابت ہے، چار بھی ثابت ہے لیکن چار سے کم نہیں لہٰذا تہجد کی کم از کم رکعات چار ہیں۔ سنت کے مطابق ہوں تو آٹھ ہونی چاہیں۔

اگر کوئی بیمار ہو، سفر سے آیا ہو، کسی وجہ سے تھکا ہوا ہو، اسے یہ خطرہ ہو کہ سو گیا تو تہجد کے لیے بیدار نہیں ہو سکے گا تو چھوڑ دینے کے بجائے عشاء کے بعد کسی وقت بھی پڑھ لے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سحری کو اٹھ کر تہجد ادا فرماتے۔ پھر اتنا ہی وقت ہوتا کہ فجر کی اذان ہو جاتی، سنتیں ادا فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم فجر کی جماعت تک استراحت فرما لیتے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا مقام الگ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نیند ناقضِ وضو نہیں۔ ہمیں اونگھ آ جائے تو وضو ختم ہو جاتا ہے لہٰذا بہتر ہے کہ سو کر اٹھ کر تہجد ادا کریں لیکن چھوڑ دینے سے بہتر ہے کہ سونے سے پہلے ادا کر لیں تو تہجد ہو جائے گی۔

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ یہ نصِ قرآن سے ثابت ہے، قرآن کا براہِ راست حکم ہے اور یہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے ہے لہٰذا تہجد حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے فرض تھی۔ علماء کا دوسرا طبقہ یہ کہتا ہے کہ یہ نفل ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے تو نفل تھے، اُمت کے لیے

سنتِ مؤکدہ ہیں۔ چونکہ اللہ کریم نے فرمایا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) تہجد ادا کریں نَافِلَةً لَّكَ ۔۔۔اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے نفل ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے چونکہ ساری عمر ادا فرمائے ہیں لہٰذا امت کے لیے سنتِ مؤکدہ ہیں۔

گویا جو تہجد کی پرواہی نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ تہجد کی کیا ضرورت ہے تو یہ درست نہیں۔ اگر کوئی ادا نہ کر سکے تو اسے یہ احساس رہنا چاہیے کہ ایک سنتِ مؤکدہ چھوٹ رہی ہے۔

مقامِ محمود:

فرمایا، رات کو زائد عبادت کیجیے اور انعامات حاصل کیجیے۔ اس لیے کہ: عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴿۷۹﴾ اللہ عنقریب آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو مقامِ محمود عطا فرمائے گا۔ مقامِ محمود آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا گھر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا مقام ہے۔ جنت الفردوس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی رہائش گاہ ہے جو جنت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اتنے اعلیٰ درجات پر اللہ کریم نے فائز کرنا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی عبادات انتہائی اعلیٰ، بلند اور دوسروں سے زائد ہیں اور زائد ثواب کا باعث ہیں۔

مقامِ محمود ایک ایسا مخصوص مقام و مرتبہ ہے جو صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا مقامِ عالی ہے۔

اولیاء اللہ میں سے صاحبِ کشف کو حضوری نصیب ہوتی ہے، مقامِ محمود کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بارگاہ روضہء اطہر میں بھی ہے، مسجد نبوی میں بھی ہے، آسمانوں پر بھی ہے، عرشِ عظیم پر بھی ہے، عالمِ امر ختم ہو جائے تو اس سے آگے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بارگاہِ عالیہ موجود ہے، دربارِ رسالت پناہی موجود ہے۔ بڑی عجیب بات ہے کہ روضہء اطہر میں، مسجد نبوی میں کسی کو زیارت نصیب ہو تو خلفائے اربعہ ضرور بارگاہِ عالیہ میں موجود ہوتے ہیں لیکن مقامِ محمود پر کسی کو زیارت نصیب ہو تو وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں صرف ایک ہستی ہوتی ہے، وہ ابوبکر صدیق ؓ ہیں کہ اللہ کریم نے انہیں معیتِ ذاتی عطا فرمائی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے ان اللہ معنا ۔۔۔غارِ ثور کی راتوں میں اللہ کریم نے یہ نعمت عطا فرمائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان مبارک سے مژدہ سُنا ان اللہ معنا ۔۔۔ہم دونوں کے ساتھ اللہ ہے۔ وہ معیتِ ذاتی جو بحیثیتِ اُمتی دنیا میں نصیب ہوئی۔ وہ معیت سیدنا صدیق اکبر ؓ کو وہاں بھی حاصل ہے۔

امت کے لیے سبق:

آیات میں کفار کی ایذاؤں سے بچنے کے لیے عبادات، فرائض و نوافل کا ذکر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو مقامِ محمود کی خوشخبری عطا ہوئی۔ ان لوگوں پر اللہ کی گرفت کا ذکر ہوا جو اس بات پر مصر رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو مکہ مکرمہ سے ہجرت پر مجبور کر دیا جائے۔ فرمایا گیا کہ ایسا کرنے والے خود اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ اس میں پیغامِ عام ہے کہ کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع اختیار کر لے وہ دنیوی عذابوں سے بھی بچ جائے گا اور اخروی عذابوں سے بھی۔ یہ پناہ گاہ صرف ذاتِ اقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہے۔ جو اس کے سائے میں آ گیا وہ کامیاب ہے۔ وہ ویسے کرے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم فرمائیں، حلال کمائے، حرام سے بچے، سچ بولے، جھوٹ سے بچے، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کرے تو بندہ اللہ کی پناہ میں آ گیا۔

اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے راستے کے خلاف چلا، وہ نہ صرف دنیوی نقصانات اور مصائب کا شکار ہوگا بلکہ اخروی خسارے سے بھی بچ نہ سکے گا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے شہر میں مقیم ہونے کی برکت سے، کافر و مشرک اللہ کی گرفت سے، اللہ کے عذابوں سے بچے ہوئے تھے تو آج بھی جو اللہ کے عذابوں سے بچنا چاہے وہ اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کر کے اللہ کی پناہ میں آ جائے۔

فرمایا، اگر یہ اسی پر بضد ہیں تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) یہ شہر چھوڑ دیجیے اس دعا کے ساتھ ہجرت فرمالیں۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ﴿۸۰﴾ اے اللہ! جہاں تو مجھے چاہتا ہے، وہاں میرا داخلہ بہت اچھی طرح ہو، مجھے صدق سے داخل کیجیو۔ یعنی مکہ مکرمہ کو چھوڑ رہے ہیں لیکن پہلے چھوڑنے کی بات نہیں کی پہلے اگلے ٹھکانے کی بات کی ہے۔ اور یہ دعا اللہ کریم نے خود تعلیم فرمائی ہے کہ جہاں مجھے پہنچنا ہے وہاں مجھے بہت اچھے، مبارک، سچے اور کھرے انداز سے داخل کر اور جہاں سے مجھے نکالنا چاہتا ہے (مکہ مکرمہ) وہاں سے میرا نکلنا کھرا، سیدھا، سچا اور حق پر ہو۔ کسی کی اس میں حق تلفی نہ ہو، کسی کو اس میں دکھ اور رنج بھی نہ ہو۔ کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ میرا داخلہ بھی مبارک ہو، میرا یہاں سے نکلنا بھی حق پر ہو۔

پھر ہجرت کے واقعات نے اس دعا کی قبولیت کے مظاہر دکھائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہجرت فرمائی، غارِ ثور میں پہنچے، اللہ نے وہاں کس طرح حفاظت فرمائی، مشرکینِ مکہ دروازے پر پھرتے رہے اور ناکام واپس گئے۔ مدینہ منورہ جانے والے راستوں پر مشرکین گھوڑے دوڑاتے رہے کہ کسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قافلے کو پکڑا جائے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کی رحمت کے سائے میں بخیریت مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

فرمایا: وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا ۝۸۰ اور مجھے غلبہ بھی دیجیو جس میں آپ کی مدد شامل ہو۔

اسلام اپنا نفاذ چاہتا ہے:

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم مکہ مکرمہ میں تیرہ سال محنت کرتے رہے، افراد تیار ہوتے گئے لیکن کوئی ضابطہء اسلامی پورے شہر پر نافذ نہیں کر سکتے تھے کہ اس وقت مسلمانوں کے پاس قوتِ نافذہ نہیں تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اللہ کے حکم پر دعا کی، اللہ کریم نے خود فرمایا، دعا کیجیے کہ اللہ مجھے قوتِ نافذہ بھی دے۔ اس کا مطلب ہے کہ صرف حجرہ نشینی اسلام نہیں ہے۔ نظامِ اسلامی کے نفاذ کے لیے حصولِ اقتدار کی جائز کوشش کرنا اور اقتدار حاصل کرنا علماء کا بھی فرض ہے۔

اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس کے لیے دعا تعلیم فرمائی گئی: وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا ۝۸۰ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) دعا کیجیے میرے ربّ! میری ایسی مدد فرما کر مجھے اختیار و اقتدار بھی احسن طریقے سے حاصل ہو تو نیک اور متقی لوگ اس سے پرہیز کیوں کریں؟ تاریخ گواہ ہے کہ مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو اقتدار و اختیار حاصل ہوا تو پوری ریاست پر اسلام نافذ ہو گیا اور مدینہ منورہ سے نکل کر اطرافِ زمین پر پھیل گیا۔

مکہ مکرمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اسلام پر عمل پیرا رہے، صحابہ کرامؓ عمل کرتے رہے لیکن عمومی طور پر ریاست کا قانون تو نہ بن سکا لہٰذا ریاست کا ہونا بھی نفاذِ دین اور نفاذِ حق کے لیے ضروری ہے۔ اس کے لیے جائز وسائل کو بروئے کار لانا بھی ضروری ہے۔ یہ نہیں جو آج رائج ہے جس میں ووٹ خریدے جاتے ہیں۔ یہ غیر شرعی ہے۔ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ قوم کے اہلِ دانش، دیانتدار، دیندار، سرکردہ، نیک، سمجھدار لوگ مل کر فیصلہ کریں کہ کس کو سربراہ بنایا جائے پھر عوام کو دعوت دی جائے کہ وہ بھی اس کی بیعت کریں۔ دین حق ہے، اسلامی ریاست کی بنیاد سچ پر ہے، سچائی اور کھرے پن پر ہے یہاں سنجیدہ اور مدبر لوگوں کی رائے کی اہمیت ہے کہ وہ مل کر حکمران کے بارے فیصلہ کریں۔ وَقُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا ۝۸۱ یہ آیہء کریمہ فتح مکہ کے موقعہ پر نازل ہوئی۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی لاٹھی مبارک سے بیت اللہ میں موجود بتوں کو گراتے جاتے تھے اور یہ آیہء مبارکہ تلاوت فرماتے جاتے وَقُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ۔۔۔ فرما دیجیے کہ حق آ گیا اور باطل کو بھاگنا پڑا۔ اب باطل بھولا بسرا ہو گیا۔ یقیناً باطل ہوتا ہی نابود ہونے کے لیے ہے۔ باطل کی عمر لمبی نہیں ہوتی۔ شرط یہ کہ باطل کو مٹانے والے اہلِ حق ہوں، حق کے ساتھ آئیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم حق کے ساتھ تشریف لائے تو بیت اللہ بھی بتوں سے پاک ہو گیا اور لوگوں کے دل بھی بتوں کی محبت سے پاک ہو گئے، شہر پھر اس تقدس کا حامل ہو گیا جیسا ابراہیمؑ نے بسایا تھا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل تقدس میں پہلے سے بھی کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ ایسا تب ممکن ہوا جب اہلِ حق آئے۔

آج بھی اہلِ حق کو چاہیے کہ حصولِ اقتدار کے لیے جائز وسائل اختیار کریں اور اللہ اقتدار دے تو حق کو نافذ کریں جس میں مخلوق کی بہتری اور بھلائی ہو۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

فرمایا، ہم قرآن کے ذریعے وہ چیز نازل کرتے ہیں جس کی عجیب خصوصیت ہے کہ یہ ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت کا سبب ہے اور نہ ماننے والوں کے لیے نقصان پہ نقصان بڑھانے کا سبب ہے۔ قرآن کریم اللہ کا ذاتی کلام ہے۔ اللہ کریم نے اس کی آیات کے ساتھ جو کیفیات وابستہ فرما دی ہیں ان میں عجیب خاصیت ہے کہ ایمان والوں کے لیے ان میں شفا ہے۔ شفا سے مراد ظاہری اور باطنی بیماریوں کی شفا ہے۔ علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ ظاہری بیماریوں کے لیے قرآن سے علاج جائز ہے۔ اہلِ ایمان میں سے کوئی قرآن کی آیت پڑھ کر پھونک دے یا اس کا نقش بنا کر گلے میں ڈال لے تو یہ جائز ہے اور اس سے ظاہری بیماریوں سے شفا ملتی ہے۔ جہاں تک قلبی، روحانی اور باطنی بیماریوں کا تعلق ہے تو قرآن اس کا واحد علاج ہے، دوسری کوئی ایسی چیز نہیں جو باطنی بیماریوں کو شفا بخشے۔ اس کی خاصیت ہے کہ نورِ ایمان ہو تو یہ شفا بھی ہے، گناہوں کی معافی کا سبب ہے، اللہ کی رحمت پانے کا سبب ہے اور درجات کے بڑھانے کا سبب بھی ہے۔ اور جہاں ایمان نہ ہو وہاں یہ ظالموں کے لیے باعثِ خسارا ہے۔ قرآن بیک وقت اہلِ ایمان کے لیے ظاہری و باطنی شفا کا سبب ہے، حصولِ رحمت کا سبب ہے اور ایمان نہ لانے والوں کے لیے بہت نقصان دہ ہے کیونکہ جب قرآن ان تک پہنچ گیا تو اللہ کی حجت ان پر تمام ہو گئی۔ ان کو پیغام پہنچ گیا اور انہوں نے نہیں مانا تو ان کا جرم بڑھ گیا اور وہ سزا کے مستحق ہو گئے اس طرح قرآن نہ ماننے والوں کے لیے سراسر نقصان دہ ہے۔ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۔۔۔ فرمایا، انسانی مزاج ایسا عجیب ہے کہ جب ہم اس پر انعام کرتے ہیں۔ اس کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں، اس کی خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے، اسے وافر نعمتیں ملتی ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ منعمِ حقیقی کا شکر ادا کرے جس نے اسے یہ نعمتیں دی ہیں، وہ اللہ کو ہی بھول جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ہی قابل سمجھنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں، ''یہ میری لیاقت، میری محنت، میرے علم و ہنر کا، میرا کمال ہے۔'' اور اللہ کریم کی عظمت کو بھول جاتے ہیں۔ رخ پھیر کر، پہلو بدل کر دوسری طرف چلے جاتے ہیں۔

اور اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾ تو ناامید ہو جاتے ہیں، شکوے شکایات، شوروغوغا شروع ہو جاتا ہے۔

جن کا اللہ سے تعلق ہو وہ نعمتیں ملنے پر شکر کرتے ہیں، دولت آئے، فراوانی آئے، صحت ملے، وہ مزید شکر کرتے ہیں، اللہ کی نعمتیں اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر استعمال کرتے ہیں۔ بیماری آجائے، کسی دشمن کا سامنا کرنا پڑ جائے، تنگدستی گھیر لے، ہر حالت میں اللہ سے مدد چاہتے ہیں، اللہ کریم سے ہی حفاظت طلب کرتے ہیں، اللہ ہی کی پناہ میں آنے کی درخواست کرتے ہیں۔ اور جن کا اللہ کریم سے رشتہ ہی نہ ہو، انہیں جب کوئی نعمت ملے تو وہ اسے اپنی ذاتی قابلیت سمجھتے ہیں اور اللہ کی بارگاہ سے منہ پھیر کر پہلو بدل لیتے ہیں۔ ایسے لوگ مشکل حالات میں نااُمید ہوتے ہیں، ان کے پاس سوائے ناامیدی کے کچھ نہیں ہوتا۔

فرما دیجیے قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ۔۔۔ کہ ہر شخص اپنی صوابدید پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ جنہیں عظمتِ الٰہی کا ادراک ہوتا ہے، جو اللہ کی پناہ میں آجاتے ہیں اور پناہ صرف اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم پناہی میں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا دامن تھام لیتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کرتے ہیں۔

لوگوں کی اکثریت تو آج یہ چاہتی ہے کہ ہم پارسا بھی مشہور ہوں، لوگ ہمیں اچھا کہیں لیکن کام ہم اپنی خواہش کے مطابق کریں۔ ہر بندے کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو میں چاہتا ہوں اور جس طریقے سے چاہتا ہوں ویسے کروں تو فرمایا: فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾ یہ چیزیں اللہ کریم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

اس آیہء کریمہ میں اللہ کریم نے صفاتی نام ربّ استعمال فرمایا ہے کیونکہ ربّ وہ ہستی ہے جو بناتا ہے، پیدا کرتا ہے، زندگی دیتا ہے، جو ایک ایک خلیہ (Cell) کو جوڑ کر تخلیق فرماتا ہے پھر ہر ذرے کی پرورش کرتا ہے، اسے کام کے قابل رکھتا ہے۔ جو ایک ایک خلیہ (Cell) کا خالق و مالک، پالنہار ہے، وہ جانتا ہے کہ کوئی کیا کر رہا ہے، کیا سوچ رہا ہے۔ سب کچھ اس مالک حقیقی کے علم میں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون ہدایت یافتہ ہے، کون سب سے زیادہ صحیح راستے پر چل رہا ہے، اس سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔

سورۂ بنی اسرآءیل رکوع 10 آیات 85 تا 93

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٨٥﴾ وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿٨٦﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿٨٧﴾ قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿٨٨﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٨٩﴾ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿٩٠﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿٩١﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَاۗءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ قَبِيْلًا ﴿٩٢﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَاۗءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٣﴾

اور یہ لوگ آپ سے روح کے بارے پوچھتے ہیں فرما دیجیے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے ﴿۸۵﴾ اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر وحی آپ پر بھیجی ہے سب واپس لے لیں پھر اس کے (واپس لانے کے) لیے آپ کو ہمارے مقابلے میں اپنا کوئی مددگار نہ ملے ﴿۸۶﴾ مگر (یہ) آپ کے

پروردگار کی رحمت ہے (کہ ایسا نہیں کیا) بے شک آپ پر اُس کا بڑا فضل ہے ﴿۸۷﴾ آپ فرما دیجیے کہ اگر (تمام) انسان اور جنات (اس بات کے لیے) اکٹھے ہو جائیں کہ ایسا قرآن بنا لائیں تب بھی اس جیسا نہ لاسکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں ﴿۸۸﴾ اور بے شک ہم نے لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے اس قرآن میں سب باتیں طرح طرح سے بیان فرما دیں ہیں پھر بھی اکثر لوگ انکار کیے بغیر نہ رہے ﴿۸۹﴾ اور کہنے لگے ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک آپ ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری نہ کر دیں ﴿۹۰﴾ یا آپ کے لیے کوئی کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو پس آپ اس میں جگہ جگہ نہریں جاری کر دیں ﴿۹۱﴾ یا جیسا کہ آپ کہا کرتے ہیں ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں یا اللہ اور فرشتوں کو (ہمارے) روبرو لے آئیں ﴿۹۲﴾ یا آپ کے لیے ایک سونے کا بنا ہوا گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپ کے (آسمان پر) چڑھ جانے کو بھی ہرگز نہ مانیں گے جب تک آپ (وہاں سے) ہمارے لیے ایک تحریر لے کر نہ آئیں جسے ہم پڑھ لیں آپ فرما دیجیے کہ میرا پروردگار پاک ہے کہ میں تو صرف آدمی ہوں (اور) پیغمبر ہوں ﴿۹۳﴾

تفسیر و معارف

اللہ کریم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو مبعوث فرما کر اپنی رحمت کے خزانے لٹا دیے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اللہ کا دین اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا حق ادا کر دیا لیکن نہ ماننے والے اپنی ہٹ دھرمی اور ضد پر ہی اڑے رہے۔ کفار و مشرکینِ مکہ بھی بجائے اس کے کہ اس نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ مند ہوتے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لاتے، قرآن کی حقانیت تسلیم کرتے، ربّ العالمین کو الٰہ واحد مانتے، اپنی خواہشات قربان کرتے، اطاعتِ الٰہی اور اتباعِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کرتے، انہیں اعتراضات ہی سوجھتے رہے اور وہ اپنی ساری قوت وطاقت حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے مخالف استعمال کرنے میں مشغول رہے۔

مشرکینِ مکہ نے اسی کام کے لیے اپنا ایک وفد علمائے یہود کے پاس مدینہ بھیجا کہ ہمارے ہاں ایک ہستی

نے دعوئ ءنبوت کیا ہے، تم ہماری راہنمائی کرو کہ ہم اُن کی سچائی معلوم کرنے کے لیے کیا سوالات کریں؟ انہوں نے تین سوال بتائے کہ اگر یہ اللہ کے سچے نبی ہوں گے تو دو سوالوں کے مفصل جواب دیں گے، تیسرے سوال کا مجمل جواب دیں گے اور اگر یہ شخص نبی نہیں ہوگا تو کسی بھی سوال کا جواب نہیں دے گا یا تینوں کا کچھ نہ کچھ جواب دے، دے گا۔ پہلا سوال اصحابِ کہف کے بارے تھا کہ وہ کون تھے؟ دوسرا اس شخص کے بارے پوچھا گیا تھا کہ وہ کون تھا جس نے مشرق و مغرب تک سفر کیے؟ اور تیسرا سوال یہ تھا کہ بتایے روح کیا ہے؟ یہ کہاں سے آتی ہے، کہاں چلی جاتی ہے، یہ کس چیز سے پیدا ہوئی، اس کی اصل کیا ہے، اس کی پیدائش کا طریقہ کیا ہے وغیرہ؟ اس کی تفصیل ارشاد فرمائیں۔

روح کیا ہے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے دو سوالوں کے جواب تو مفصل ارشاد فرما دیے جن کی تفصیل قرآنِ کریم میں موجود ہے اور روح کے بارے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اجمالاً ارشاد فرما دیا۔ یہاں قرآن کریم میں روح کے بارے میں ارشاد ہو رہا ہے۔ فرمایا: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ۔۔۔یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) سے روح کے بارے سوال کرتے ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) انہیں فرما دیجیے: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ۔۔۔روح میرے پروردگار کے امر میں سے ہے۔

عالم دو ہیں، ایک عالمِ خلق دوسرا عالمِ امر۔ دنیا، دنیا کی ہر چیز، اس کے علاوہ جنت، دوزخ، عرش، کرسی یہ سب عالمِ خلق کی چیزیں ہیں۔ یہ مخلوق ہیں، تخلیق کی گئی ہیں۔ جہاں تخلیق کی حد ختم ہو جاتی ہے، مخلوق کی حد ختم ہو جاتی ہے وہاں عالمِ امر ہے۔ ارشادِ باری ہے: لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔۔۔(الاعراف:54) اللہ ہی کے لیے ہے عالمِ خلق بھی اور عالمِ امر بھی۔ تمام تخلیقات کا تعلق عالمِ خلق سے ہے اور عالمِ امر کا تعلق تجلیاتِ باری سے ہے۔ یہ مرضیاتِ باری کا عالم ہے۔ فرمایا، روح عالمِ خلق کی چیز نہیں کہ تم پوچھنا چاہتے ہو کہ اس کی شکل کیسی ہے، قد کاٹھ کیسا ہے، کیا اس کا توالد و تناسل ہے، اس کی نسل چلتی ہے، یہ کہاں سے آتی ہے، کہاں چلی جاتی ہے، اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟ فرمایا، یہ سب عالمِ امر سے ہے، یہ عالمِ خلق میں سے نہیں ہے۔ تمہارے علوم تو عالمِ خلق کے بھی تمام علوم کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ دنیوی علوم کے بڑے بڑے ماہرین ہوتے ہیں لیکن ہر ایک کسی ایک شعبہ کا ماہر ہوتا ہے۔ کوئی شاعر ہے تو ادب کے میدان کا شہسوار ہے۔ تاریخ دان ہے تو تاریخ کا ماہر ہے، سائنسدان ہے تو اسی شعبے کا ماہر ہے۔ دنیا کے باقی تمام علوم کا کوئی ایک فرد کُلّی علم نہیں رکھتا۔ سب کے پاس جزوی علم ہوتا ہے۔ گویا عالمِ خلق میں بھی اتنی وسعت ہے کہ تمام علوم کا احاطہ ممکن نہیں۔ جب تم عالمِ خلق کو ہی مکمل طور پر نہیں سمجھ پاتے تو عالمِ امر تمہاری سمجھ میں کیسے آئے گا؟ وَمَآ

اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾ تمہارا علم تو بہت تھوڑا ہے، بہت محدود ہے، مادی اشیاء کے بارے بھی تم مکمل نہیں جانتے۔ دنیا میں کوئی ایسا فرد نہیں ہے جو ہر چیز جانتا ہو۔ تمام ماہرین اپنے شعبے کے ماہر ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً اس شعبے کا بھی کُلی علم ان کے پاس نہیں ہوتا، جزوی علم ہی ہوتا ہے۔ جب اس عالم کی پوری باتیں تم نہیں جانتے جس عالم میں رہتے بستے ہو، کھاتے پیتے ہو، سوتے جاگتے ہو تو پھر تم اپنے اس علم سے عالمِ امر کی باتیں کیسے جان سکتے ہو؟

عالمِ امر کی خبر صرف انبیاءؑ کو ہوتی ہے۔ عالمِ امر کا علم نبی علیہ السلام پر نازل ہوتا ہے۔ انبیاءؑ کے سچے متبعین، اولیا اللہ کو با اتباع نبیؐ من جانب اللہ اگر عالمِ امر کی باتوں سے آگاہی ہو جائے تو اس میں کوئی اِستبعاد نہیں۔ ایسا ہونا ممکن ہے اور درست ہے لیکن یاد رہے عالمِ امر کا علم نبیؐ پر نازل ہوتا ہے اور ولی کو نبیؐ کے طفیل عطا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ علومِ نبوت قلیل نہیں ہوتے۔

یہاں جس علم کو قلیل کہا گیا ہے وہ انسان کا وہ علم ہے جس کا تعلق عقل و شعور سے ہے جو محض مادّی، دنیوی امور کے حصول کے لیے دیا گیا ہے۔ اس علم کے ذریعے عالمِ خلق کے راز آشکار کیے جاسکتے ہیں عالمِ امر کے حالات جاننے کے لیے یہ علم قلیل ہے۔

علمائے ربانی نے روح پر بحثیں کی ہیں اور روح پر تحقیق کرنے پر بھی کوئی پابندی نہیں لیکن اس کے لیے اہل اللہ سے استفادہ ضروری ہے۔ علمائے حق نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔

فرمایا، روح کی ماہیت یا حقیقت یا یہ کہ روح کیسے بنی، کہاں سے آتی ہے، کہاں جاتی ہے، کہاں رہتی ہے؟ یہ سب باتیں عالمِ امر سے متعلق ہیں، تمہارے بس میں نہیں کہ انہیں اپنی مادّی عقل سے سمجھ سکو۔ اللہ نے اسے کیسے تخلیق فرمایا، یہ اللہ ہی جانتا ہے۔

اللہ کریم ہمیں یہ سمجھ دے، شعور دے کہ قرآن کریم اللہ کی عطا کردہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ اللہ کا ذاتی کلام ہے، اس کی برکات، کیفیات اور علوم کے خزانوں کا کوئی شمار نہیں اور یہ بھی یاد رہے کہ اس سے منہ موڑنے والوں پر جو عذاب ہوں گے اُن کی بھی کوئی حد نہیں۔ لوگو! جب تم اس کی ناقدری کرتے ہو، زندگی بھر تمہیں فرصت نہیں ہوتی کہ تم قرآن پڑھ سکو، اس کے معنی جاننے کی کوشش کرو، اس کو حرزِ جاں بناؤ، اس پر عمل کرو۔ جب تم اتنی ناقدری کرتے ہو تو کیا کبھی تم نے سوچا کہ وہ چاہے تو اپنا کلام اٹھا لے۔ تمام تحریریں مٹ جائیں، تمہارے دلوں اور ذہنوں سے محو ہو جائے اور تمہارے پاس اللہ کی مرضیات کو جاننے کا ذریعہ ہی نہ رہے۔ تمہیں معلوم ہی نہ ہو سکے کہ اللہ کس بات پر راضی ہے اور کس بات پر ناراض ہوتا ہے۔ کبھی تم نے یہ سوچا کہ: وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ

اِلَیۡكَ ۔۔۔ اگر وہ اپنا کلام اٹھالے تو تم زندگی بھر بھٹکتے رہو گے!

ایک عاجز مخلوق جو اپنی پیدائش میں، صحت میں، روزی میں، دل کی دھڑکن تک میں اس قادر مطلق، مالک حقیقی کی محتاج ہو، وہ اتنی جرأت کرے، اتنی خودسری کرے کہ اپنی خواہشِ نفس کے مطابق زندگی بسر کرے تو وہ کس قدر خسارے میں رہے گی۔ وہ مالک حقیقی تو ایسا رحم کرنے والا ہے کہ اس نے درِ رحمت وا کر رکھا ہے۔ اگر تم زندگی بھر بھٹکتے رہے ہو تو آج بھی تمہارے پاس ہدایت کا ذریعہ ہے۔ آج بھی قرآن کا دامن تھام لیتے ہو، قرآن کی پناہ میں آجاتے ہو تو وہ تم پر رحم فرمادیتا ہے۔ ساری زندگی کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ کبھی یہ بھی سوچا کہ تم جو ناقدری کرتے ہو، اگر اس سے ناراض ہو کر اللہ یہ ساری وحی اٹھالے تو پھر کیا کرو گے، کہاں جاؤ گے، کس سے پوچھو گے۔ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیۡنَا وَكِیۡلًا ﴿۸۶﴾ پھر اسے واپس لانے کے لیے تمہارا کوئی مددگار اور کوئی ساتھی نہیں۔ اگر اللہ کریم سلب کر لے تو پھر کون ہے جو اسے واپس لاسکے!

اگر وہ مالک وحی اٹھالے اور تمہارے پاس قرآنِ کریم کا کوئی لفظ نہ رہے، بتانے والا، سنانے والا کوئی نہ رہے تو کیا کرو گے، کون ہے جو تمہیں اتنی بڑی نعمت لاکر دے گا؟ اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ۔۔۔ مگر یہ اللہ کریم کی رحمت ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔

امت کو تاکید کی جارہی ہے کہ لوگو! سوچو، وہ مالک ومختار ہونے کے باوجود تمہاری کمزوریوں، کوتاہیوں سے درگزر فرما کر اپنی وحی کو روئے زمین پر پہنچا رہا ہے۔ اس نے اپنے خوش نصیب بندوں کو اس پر لگادیا ہے جو رات دن اذانیں بلند کرتے ہیں، صلوٰۃ ادا کرتے ہیں، تلاوت کرتے ہیں اور اللہ کا پیغام کسی نہ کسی صورت گھر گھر پہنچاتے رہتے ہیں۔ صرف اذان ہی کو دیکھ لیں، روئے زمین پر کوئی لمحہ ایسا نہیں کہ کروڑوں انسان اللہ کی عظمت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی شہادت نہ دے رہے ہوں، دعوت الی اللہ نہ دے رہے ہوں۔ اللہ نے ایک نظام بنادیا ہے کہ اس کے بندے تقریر وتحریر کے ذریعے اللہ کا پیغام مسلسل پہنچا رہے ہیں۔

اِنَّ فَضۡلَهٗ كَانَ عَلَیۡكَ كَبِیۡرًا ﴿۸۷﴾ فرمایا، اے میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ پر تو اللہ کا بڑا کرم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے قیامت تک کی مخلوق کے لیے روشن چراغ بنایا ہے کہ ہر قسم کی تاریکیوں کا سینہ چیر کر آپ لوگوں کے قلوب میں انوارات وتجلیات بھردیں۔ یہ اللہ کریم کا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر احسان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی قیامت تک آنے والی ساری مخلوق کے لیے راہنما ہیں۔

اب لوگوں پر ہے کہ وہ اللہ کریم کی اس نعمت کی قدر کریں۔ اللہ نے تو قرآن جیسی نعمت اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم

پر نازل کر دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ایک ایک حکم ہر آن اللہ کے بندوں تک پہنچانے میں کمر بستہ ہیں۔

لوگو! اب اس کی قدر تم نے کرنی ہے۔ قبول کرتے ہو یا نہیں، یہ فیصلہ تمہارا ہے۔ جان لو! کہ قبول کرتے ہو تو قربِ الٰہی نصیب ہوتا ہے اور نہیں کرتے ہو تو سزائیں مرتب ہوتی ہیں۔ وہ تو ایسا کریم ہے کہ تمہاری برائیوں سے، نافرمانیوں سے خفا ہو کر اپنی وحی بھی نہیں اٹھا رہا۔ تم اعتراض کرتے ہو، اعراض کرتے ہو، برائی کی طرف بھاگتے ہو اور وہ تمہیں اپنی طرف بلاتا ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آوازِ حق بلند کی تھی، وہ بلند تر ہوتی جا رہی ہے، پھیلتی جا رہی ہے اور تم روئے زمین پر جہاں بھی ہو وہ آواز ہر جگہ سنائی دے رہی ہے۔ اللہ کی حفاظت میں آنے، محفوظ و مامون ہونے کا ایک ہی ذریعہ ہے جو حتمی ہے اور یقینی بھی اور وہ ہے اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوصِ دل سے فرمانبرداری۔

عظمتِ قرآن:

عربی زبان کا ایک محاورہ ہے کَلَامُ الْمُلُوكِ مُلُوكُ الْكَلَامِ کہ بادشاہوں کی بات، باتوں کی بادشاہ ہوا کرتی ہے۔ قرآن حکیم عظیم ترین ہستی، اللہ کا ذاتی کلام ہے لیکن جو اس کے منکر ہیں وہ اسے عام کتاب سمجھتے ہیں، محض عربی عبارت سمجھتے ہیں۔ اللہ کریم نے یہاں اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں چیلنج کر دیں، انہیں دعوت دے دیں، کھلا اعلان کر دیں: قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾ کہ تم سارے انسان اور جنات اس بات پر جمع ہو جاؤ کہ تم بھی قرآن جیسی عبارت بنا لاؤ تو دنیا بھر کے دانشوروں، ادیبوں شاعروں کو جمع کر لو، جن و انس سب جمع ہو جاؤ اور قرآن جیسی ایک چھوٹی سی عبارت ہی بنا کر دکھاؤ!

انسانی کاوش اپنے کمال پر بھی پہنچ جائے تو بھی انسان خالقِ حقیقی کی تخلیق کردہ کسی صنعت جیسا نہیں بنا سکتا۔ جو صنعت خالق کی ہے وہ مخلوق نہیں بنا سکتی۔ میاں محمد بخشؒ نے کہا تھا۔

جے اک مچھر دا پَر بھجے سارا ای عالم لگے
فیر نئیں او ثابت ہوندا جیوں کر آہا اُگے

عہدِ جدید کی ساری تکنیک، ساری صنعتی نمائش کا زور لگا لو۔ اگر ایک مچھر کا پَر ٹوٹ جائے تو تم بالکل ویسا نہیں بنا سکتے جیسا اللہ نے بنایا ہے۔ ان خصوصیات کا حامل تم نہیں بنا سکتے۔ جو بھی بناؤ گے وہ اس کی نقل ہو گا ویسا نہیں ہو گا جیسا اللہ نے بنایا ہے۔

مخلوق تو ایک مچھر کا پَر نہیں بنا سکتی، وہ قرآن کریم جیسی عبارت کہاں سے لائے گی؟ تم سارے انسان و جن مل جاؤ، ایک دوسرے کی مدد کرو لیکن جو کلام خالق کا ہے وہ مخلوق پیش نہیں کر سکتی۔ آج پندرہویں صدی جا رہی ہے کفار و مشرکین، بالخصوص یہود نے اب بھی پورا زور لگا رکھا ہے کہ قرآن کریم کو غلط چھاپ لیں۔ قرآن کے غلط ترجمے تو ہرا یرے غیرے نے کیے ہیں، قرآن کو غلط معنی پہنائے ہیں لیکن اس جیسی عبارت بنانے کا دعویٰ آج تک کسی نے نہیں کیا، دعویٰ کرنے کی جرأت بھی نہیں کی۔

مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ:

کافر کی بات تو میں نہیں کرتا، وہ تو محروم ہیں لیکن کلمہ گو بھی اگر ساری زندگی اس عظیم الشان کلام کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے تو اس نے زندگی میں کیا پایا؟ وہ کیا خاک جیا! صرف پیٹ بھرتا رہا، بچے پیدا کرتا رہا اور مر گیا، یہ تو کوئی زندگی نہ ہوئی! کلام اللہ جل شانہٗ کا ہو، لانے والا اتنا عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلّم ہو تو پھر مسلمان کو اس کی عظمت پیش نظر رکھنی چاہیے۔ کچھ تو سمجھنے کی کوشش کرے، کچھ تو اس کے مطابق اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کرے۔ ہمیں قرآن اس نظریے سے پڑھنا ہے کہ میرا پروردگار مجھ سے مخاطب ہے، مجھ سے بات کر رہا ہے۔ بلاشبہ قرآن حکیم میں احکام بھی ہیں اور قصص بھی۔ صحابہ کرامؓ کے حق میں خوشخبری ہے اور کافروں کے لیے عذاب کی وعید بھی لیکن یہ ہم سے بھی مخاطب ہے کہ تم ایسا کرو اور ایسا نہ کرو۔

کبھی ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ قرآن کو پڑھ کر سمجھوں کہ مجھے کیا کرنا ہے، کیا نہیں کرنا، کس کا اتباع کرنا ہے، کس کا نہیں کرنا، کمانے کا کیا طریقہ اختیار کرنا ہے، کیا نہیں کرنا، کہاں خرچ کرنا ہے اور کہاں نہیں کرنا؟

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰىٓ اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

فرمایا، ہم نے اس میں زندگی کے ہر سوال کا جواب دے دیا ہے۔ معیشت کی بات ہو یا معاشرت کی، قانون، عدالت و انصاف کی بات ہو یا سیاست و حکومت کی۔ انفرادی و نجی زندگی، والدین، ازواج، بہن بھائیوں اور رشتہ داروں کی بات ہو یا ملکی، قومی امور کی اور بین الاقوامی تعلقات کی، زندگی کے ہر سوال کا جواب ہم نے عطا فرما دیا ہے لیکن اکثر لوگ اس سے منہ پھیرے ہوئے ہیں، انکار کیے ہوئے ہیں۔

عدم توجہی بہت بڑا جرم:

کافر منہ پھیرے کہ اسی لیے تو کافر ہے۔ مسلمان جب قرآن کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو کتنا بڑا جرم کرتا ہے۔ قرآن کی طرف متوجہ نہ ہونا غفلت کی نشانی ہے اور غفلت انسان کو برائی کی طرف لے جاتی ہے۔ قرآن کے

نازل ہو جانے کے بعد عدم توجہی بہت بڑا جرم ہے۔

یہ ماننا چاہیے کہ قرآن جو بتاتا ہے وہ حق ہے، سچ ہے، میں غلطی پر ہوں لیکن آج کے کلمہ گو کہتے ہیں وہی ٹھیک ہے جو ہم کر رہے ہیں، مولوی تو بس یونہی فتوے دیتے رہتے ہیں۔ یہ قرآن پر توجہ نہ کرنے کا نتیجہ ہے جس کا انجام اخروی خسارہ ہے۔

انسان کے پاس بہت تھوڑی سی فرصت ہے، لمحوں میں بیت جاتی ہے۔ بندہ خود اندازہ کر لے کہ آج ہمیں کوئی کہہ دے کہ مجھے یہ چیز دے دو، میں پچاس سال بعد دے دوں گا تو بندہ گھبرا جاتا ہے کہ جانے پچاس سال بعد کون ہوگا، کون نہیں ہوگا، میں نہیں دیتا۔ اور جن کی عمر کے ستر، اسی سال گزر چکے ہیں وہ کہتے ہیں، ''کل کی بات تھی جب ہم سکول جایا کرتے تھے۔'' گزری ہوئی زندگی مختصر لگتی ہے اور آنے والا وقت دور لگتا ہے۔ دنیا کی زندگی تو بس پل بھر کا میلہ ہے، گزرتی ہے تو آخرت سامنے آجاتی ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بغیر آخرت نہیں ملتی۔

کفار کے احمقانہ اعتراضات کا شافی جواب:

کفار و مشرکین ماننے کی بجائے مقابلے پر کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے: وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ ہم تب تک نہیں مانیں گے جب تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) زمین سے ایک چشمہ نہ جاری کر دیں یا: اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾ آپ کے لیے باغات کھل جائیں۔ آپ تو اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، آپ جہاں رہتے ہیں وہاں کھجوروں اور انگوروں کے باغ کھل جائیں اور ان باغوں میں نہریں جاری ہوں۔

یہ کفار کتنے احمق ہیں کہ بات تو عقیدے، نظریے، عمل و کردار کی ہو رہی ہے اور یہ ندیوں نہروں کی باتیں کر رہے ہیں۔ دیکھتے نہیں کہ دنیا ان نعمتوں سے بھری پڑی ہے۔ ندیاں نہریں پھوٹ نکلنا کوئی عجیب کام نہیں۔ روئے زمین پر اللہ نے اپنی قدرت سے چشموں، ندی نالوں اور نہروں کا نظام جاری کر رکھا ہے۔

اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾ اگر یہ سب نہیں کرتے تو آسمان کا کوئی ٹکڑا ہی ہم پر گرا دیں اور یہ بھی نہیں کرتے تو اللہ کے فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئیے۔ یا پھر: اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ۔۔۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے ایک سونے کا محل بن جائے یا پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے

سامنے آسمان پر چڑھ جائیں اور وہاں سے ہمارے لیے کوئی کتاب لے آئیں جسے ہم پڑھ سکیں۔

اللہ کریم نے کتنا چھوٹا سا لیکن شافی جواب عطا فرمایا: قُلۡ سُبۡحَانَ رَبِّیۡ هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۳﴾ فرمایا، میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلّم) فرما دیجیے میرا پروردگار پاک ہے اور میں خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کر رہا۔ میں انسان ہوں، بشر ہوں، میرے ساتھ وہ بات کرو جو بشر کی قوت میں ہے۔ میرے ساتھ ایمان ویقین کی بات کرو، میرے ساتھ کردار کی بات کرو۔ میرا کردار تمہارے سامنے ہے۔ میری قبلِ بعثت زندگی بھی تمہارے سامنے ہے اور اعلانِ نبوت کے بعد بھی تمہارے درمیان رہ رہا ہوں۔ مجھ پر اللہ کا احسان ہے کہ میرا کردار معیارِ انسانیت ہے۔

جو مطالبے تم کر رہے ہو، یہ اللہ کی قدرتِ کاملہ سے متعلق ہیں۔ میں نے تو ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ میں اللہ کی قدرت کے کاموں میں دخل دے سکتا ہوں۔ میں تو عالمِ انسانیت کا فرد ہوں، انسان ہوں، بشر ہوں، بشریت کے سارے تقاضے میرے ساتھ ہیں۔ کھانا پینا، سردی، گرمی صحت و بیماری، سونا جاگنا یہ سب میرے ساتھ ہیں ہاں! اللہ کا مجھ پر یہ کرم ہے کہ میں اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) ہوں۔ میرا مقام یہ ہے کہ بشر ہوں لیکن مجھ پر وحی آتی ہے، میں افضل البشر ہوں، معیارِ انسانیت ہوں۔ میری شان یہ ہے کہ میں اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) ہوں اور رسولؐ کا کام یہ ہے کہ جس کا رسول ہے اس کی بات ان تک پہنچا دے جن کے لیے اللہ نے اسے رسولؐ بنا کر بھیجا ہے۔

یہ میرا فریضہ ہے کہ میں خالق کی بات مخلوق تک پہنچا دوں۔ تم مجھ سے اس پر بات کرو، اس میں کوئی کمی ہے، کسی سوال کا جواب تمہیں نہیں ملا؟ میرے کردار کے بارے تم نہیں کہہ سکتے کہ جو بات میں تمہیں کرنے کو کہتا ہوں، اللہ کے اس حکم پر میں خود عمل نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو تم اعتراض کر سکتے کہ آپؐ ہمیں تو اللہ کا حکم سناتے ہیں اور خود عمل نہیں کرتے۔

جتنے مطالبات تم کر رہے ہو یہ اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ تم مجھ سے انسانی دائرے کے اندر رہ کر بات کرو۔ میں نے اپنے انسان ہونے اور اللہ کے رسولؐ ہونے کا اعلان کیا ہے، اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ جتنی باتیں تم کر رہے ہو ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو روئے زمین پر موجود نہ ہو۔ نہریں بھی بہہ رہی ہیں اور باغات بھی لگے ہوئے ہیں اور یہ جو تم اللہ کے عذابوں کا مطالبہ کر رہے ہو تو ان میں سے بھی کوئی ایسا نہیں جو پہلے واقع نہ ہوا ہو۔ پہلے لوگوں پر آسمان پھٹ پڑے، پانی برسے، آسمانوں سے آگ برسی، تم تو ایک محل کا مطالبہ کر رہے ہو، شداد نے سونے کی پوری جنت بنائی، لعل و جواہر کے فرش بنائے، جواہرات سے مزین باغات لگائے، نہریں کھودیں اور اس پر غضبِ الٰہی بھی نازل ہوا۔ یہ تو کوئی انوکھی بات نہیں جو تم کر رہے ہو!

تمہارا مطالبہ ہے کہ فرشتے اتر آئیں، اللہ کریم سامنے ہو، اس کے فرشتے اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور تمہیں یہ سب دکھائی دے تو ایسا ایک دن آئے گا۔ اسی کے بارے تو میں تمہیں بتا رہا ہوں تا کہ تم سوچو کہ جب ایسا دن آئے گا تو تمہارے دامن میں کیا ہوگا، اس وقت تم کیا کرو گے؟

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ ۔۔۔ فرما دیجیے، میرا پروردگار پاک ہے، جو چاہے کر سکتا ہے۔ تم نے کوئی نئی بات نہیں کی یہ سب کچھ اس کی قدرت کاملہ سے پہلے ہی ہو رہا ہے۔ رہی میری ذات تو: هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾ انسان اور اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ان دو باتوں پر تم مجھ سے بات کر لو۔ میں اللہ کا رسولؐ ہوں، تم دنیا و آخرت کا کوئی سوال میرے سامنے لاؤ، میں اللہ سے اس کا جواب لے کر تمہیں پہنچا دیتا ہوں۔

نور و بشر کی حقیقت:

کفار کا سب سے پہلا اور بڑا اعتراض یہ تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ہماری طرح کے انسان ہیں، ہم آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسول کیسے مانیں لیکن وہ تو کفار تھے، نہ ماننا ان کا شیوہ تھا اور وہ یہ سوالات اس لیے نہیں کرتے تھے کہ وہ حقیقت آشنا ہونا چاہتے تھے اگر یہ سب کچھ ہو جاتا جس کا یہ مطالبہ کر رہے تھے تو وہ پھر بھی انکار کر دیتے۔ یہ ان کی بدنصیبی تھی کہ کفران کے دل میں دھنس گیا تھا، ان کے دل سیاہ ہو گئے تھے۔ وہ ماننے کے لیے نہیں، محض اپنا جرم بڑھانے کے لیے اس طرح کی باتیں کرتے تھے۔

جو مسلمان ہو کر بشریتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار کرتے ہیں ان کی نظر سے یہ آیت کیوں محو ہو جاتی ہے کہ: هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾ میں بشر ہوں لیکن عام بشر نہیں ہوں، اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں۔ یاد رہے بشریتِ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا انکار نبوت کا انکار ہے کیونکہ نبوت سوائے بشریت کے کسی دوسری مخلوق کو عطا ہی نہیں ہوئی۔

ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا انکار کیوں کر دیتے ہیں؟ ہم سمجھتے ہیں کہ جیسے ہم بشر ہیں ویسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں، خیر البشر ہیں۔ ہم میں سے جو جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتا ہے، اتنا وہ بشر ہے۔ اس کے کردار کے جو حصے اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے باہر ہیں، اتنا ہی وہ بشر نہیں۔ ہیئت میں انسان نظر آتا ہے حقیقت میں نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشریت کا معیار ہیں۔ جو اس معیار کے جتنا قریب ہے اتنی اس میں بشریت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت اتنی اعلیٰ و ارفع ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی بشری وجود کے ساتھ

عرشِ عظیم اور اس سے آگے جہاں تک ربّ نے چاہا تشریف لے گئے۔ اسی جسدِ عالی سمیت جنت و دوزخ، عالمِ برزخ کے حالات کا مشاہدہ فرمایا۔ ساری مخلوق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اس صفت میں واحد ہیں، یکتا ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بشریت منزہ، مصفا اور روشن ہونے میں مثالی ہے۔

جولوگ بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم بشرنہیں نور ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی بشریت کے کمال کو سمجھے ہی نہیں۔

نور و بشر کی حقیقت یہ ہے کہ نور دو طرح سے ہے۔ ایک نور وہ ہے جو اللہ کی ذات ہے۔ یہ نور غیر منقسم ہے۔ یہ اللہ کے لیے خاص ہے۔ دوسرا نور وہ ہے جو مخلوق ہے، جسے اللہ نے تخلیق کیا ہے، یہ مخلوق نور ہے۔ جیسے فرشتے نوری مخلوق ہیں، نوری عالم ہے۔ نوری مخلوق فرشتوں میں سے جو سب سے اعلیٰ فرشتے ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے خادم ہیں۔ جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی بشریت کا انکار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو نور کہتے ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا رتبہ گھٹا رہے ہیں کہ نوری مخلوق فرشتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی بارگاہ کے دربان ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی بشریت، نورانیت کا کمال ہے صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ہی بشرِ کامل ہیں جن کی بشریت و نورانیت بے مثل و بے مثال ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی شان یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے بندے اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔

بارگاہ عالی صلی اللہ علیہ وسلّم کا ادب:

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ادب کا تقاضا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت میں اپنی ساری کوشش صرف کر دی جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے فضائل بیان کیے جائیں، درود وسلام بھی ادب سے پڑھا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ عالی کے بارے میں بحث نہ کی جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ والا صفات پر بحث کرنا سرے سے حرام ہے، ایسا کرنا سب سے بڑا جرم ہے۔ ہماری یہ حیثیت نہیں کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی شان کو تولیں۔ تولنے والا اپنے سے کم وزن کی شئے تولتا ہے۔ بندہ اپنے ہاتھ سے دس، بیس کلو سے زیادہ کیا تول لے گا، اس سے زیادہ کے لیے اسے مشین چاہیے تو اگر کوئی ذاتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تولتا ہے تو اس کا مطلب ہے وہ خود کو بڑا سمجھتا ہے تو یہ ویسے ہی جسارت ہے۔ اللہ پناہ دے۔

انبیاؑ کا کمال یہ نہیں کہ وہ مالدار ضرور ہوں، بادشاہوں کی طرح محلات میں رہیں، بڑی اعلیٰ پوشاکیں زیب تن کریں اور بڑی بڑی جاگیریں رکھیں۔ انبیاؑ کا کمال یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق زندگی بسر کریں، اُمت کے

لیے نمونہ ہوں، عام آدمی کی سطح پر زندگی گزاریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے عام آدمی کی طرح زندگی بسر کی اس لیے ہر شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اتباع کا مکلف ہے۔ اگر ایک خاص سطح پر زندگی محدود ہوتی تو پھر اسی سطح کے لوگ ماننے کے بھی مکلف ہوتے، باقی انسانیت کیسے بہرہ مند ہوتی؟

اولیاء اللہ کا کمال:

ولی اللہ وہ ہوتا ہے جس کی زندگی انسانی معیار کے مطابق بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا حقیقی متبع ہوتا ہے، اس کا کردار حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنتوں کی پیروی میں روشن ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ کا کمال یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے اتباع میں ڈھال کر متوازن کر دیتے ہیں اور عام آدمی کی زندگی جیتے ہیں۔

چوں بمنزل می رسد سوار پیادہ می شود

کہ جب کوئی اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو سواری سے اتر کر پیدل ہو جاتا ہے۔ کوئی کار، جہاز پر جا رہا ہے، گھوڑے یا کسی اور سواری پر سوار ہے تو یہ سب اس منزل تک پہنچنے کے ذرائع سفر ہیں۔ منزل پر پہنچ کر وہ بھی پیدل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ولایت کے سفر میں بعض لوگ مغلوب الحال ہو جاتے ہیں لیکن جسے منزل نصیب ہو جائے وہ پھر پیدل ہو جاتا ہے، عام آدمیوں میں مل جاتا ہے۔ ویسا ہو جاتا ہے جیسا اس کے گرد لوگ بستے ہیں۔

اللہ کریم نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان مبارک سے کہلوایا: هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾ میں تو صرف آدمی ہوں اور پیغمبر ہوں، میرے پاس آؤ میں تمہیں واصل باللہ کر دوں کہ یہی میرا فرض منصبی ہے۔

سورہ بنی اسرآءیل رکوع 11 آیات 94 تا 100

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٤﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿٩٥﴾ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۢ بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۢ بَصِيْرًا ﴿٩٦﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿٩٧﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿٩٨﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٩٩﴾ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّىْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿١٠٠﴾

اور لوگوں کو ایمان لانے سے کس چیز نے روکا جب ان کے پاس ہدایت پہنچ گئی سوائے اس کے کہ کہنے لگے کیا اللہ نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے ﴿۹۴﴾ فرما دیجیے کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے (اور) بستے ہوتے تو ہم ان پر ضرور آسمان سے فرشتے کو پیغمبر بنا کر بھیجتے ﴿۹۵﴾ آپ فرما دیجیے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ ہی کافی گواہ ہیں (کیونکہ) یقیناً وہ اپنے بندوں کو خوب جانتے (اور) دیکھتے

ہیں ﴿۹۶﴾ اور جس کو اللہ ہدایت دے دیں پس وہی ہدایت پانے والا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دیں تو آپ اُس (اللہ) کے سوا ان کے لیے ہرگز کوئی دوست نہیں پائیں گے اور ہم ان کو قیامت کے دن اندھے، گونگے اور بہرے بنا کر اوندھے منہ چلائیں گے ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے جب (اس کی آگ) دھیمی ہونے لگے گی تب ہم ان کے لیے اور بھڑکا دیں گے ﴿۹۷﴾ یہ ان کو اس بات کی سزا ہے یہ کہ وہ ہماری آیات کے ساتھ کفر کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟ ﴿۹۸﴾ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا ہے اس بات پہ قدرت رکھتے ہیں کہ ان جیسے آدمی دوبارہ پیدا فرما دیں اور ان کے لیے ایک وقت مقرر فرما دیا ہے جس میں ذرہ برابر شک نہیں سو اس پر بھی ظالم انکار کیے بغیر نہ رہے ﴿۹۹﴾ آپ فرما دیجیے کہ اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہوتے تو پھر تم خرچ ہو جانے کے خوف سے ان کو ضرور بند رکھتے اور انسان بڑا تنگ دل ہے ﴿۱۰۰﴾

تفسیر و معارف

اللہ کریم فرماتے ہیں: وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾ ان لوگوں کے بھٹکنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ جب ان کے پاس ہدایت آتی ہے، دعوتِ الٰہی آتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ مبارک سے دعوتِ حق سنتے ہیں تو وہی کہتے ہیں جو ان سے پہلے کے منکرین کہا کرتے تھے کہ ہم انہیں کیسے نبیؐ مان لیں جبکہ یہ ہمارے جیسے آدمی ہیں، کھاتے پیتے ہیں، صحت مند، بیمار ہوتے ہیں، انہیں گرمی سردی لگتی ہے، یہ شادیاں کرتے ہیں، اہل و عیال میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ فرمایا یہی بات ان کے لیے رکاوٹ بن گئی ہے کہ کہتے ہیں، کیا اللہ نے ایک بشر کو، ایک انسان کو رسولؐ بنا دیا ہے۔ فرمایا، انہیں جواب دیجیے: قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾ اگر زمین پر فرشتے آباد ہوتے تو رسولؐ بھی فرشتہ ہوتا۔ اگر زمین پر انسان بستے ہیں تو ظاہر ہے رسولؐ بھی انسان ہی ہوگا۔ اگر رسولؐ کوئی فرشتہ ہوتا تو صرف فرشتے ہی اس کی بات سنتے، انسان اس کی بات کیسے سنتے، اس جیسے

کام کرتے یا اگر فرشتہ انسانوں کو سکھاتا تو پھر وہ انسانی روپ میں آکر سکھاتا۔ فرشتے نے ہی انسان کی صورت میں آنا تھا تو انسان ہی کیوں نہ رسالت کے شرف سے مشرف ہو۔ فرمایا، تمہارا یہ اعتراض اس لیے بے جا ہے کہ زمین نوعِ بشر سے ہی آباد ہے۔ روئے زمین پر بشر ہی بستے ہیں، ہم نے انہی میں سے رسول مبعوث فرمادیے تاکہ استفادہ حاصل کر سکیں۔ غیر جنس سے تو کوئی بھی استفادہ نہیں کر سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ عظمتِ رسالت اتنی بلند ہے کہ فرشتے تو نبیؐ کے خادم ہوتے ہیں تو اعلیٰ درجے کی مخلوق کو اس منصبِ عالی کے لیے چُنا جانا تھا یا اس سے کم درجے کی مخلوق کو! قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۹۶ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہو رہا ہے، انہیں فرما دیجیے کہ مجھے اللہ کریم نے نبی اور رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) مبعوث فرمایا ہے۔ کسی انسان نے یہ منصب نہیں دیا، یہ اللہ کریم کی عطا ہے جو ہر متنفس کے ہر کام سے سے آگاہ ہے لہٰذا میرے اور تمہارے درمیان بہترین گواہ اللہ کریم ہی ہے کہ میں اللہ کا سچا رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہوں۔

ہدایت کا مدار:

رہ گئی بات ہدایت کی کہ لوگوں میں اللہ کے عظیم الشان نبی امام الانبیاءؑ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے جو سراپا رحمت ہیں، مجسم رحمت ہیں تو پھر لوگوں کو ایمان نصیب کیوں نہیں ہوتا، لوگ کیوں انکار کرتے ہیں؟ فرمایا: وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ۔۔۔ ہدایت اللہ کے پاس ہے۔ جس کسی کی بات اللہ سے بن جاتی ہے، رجوع الی اللہ پیدا ہو جاتا ہے، اللہ کریم اسے ہدایت دے دیتے ہیں۔ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِهٖ۔۔۔ اور جو لوگ قلبی طور پر اللہ سے بیزار ہیں، اللہ کی عظمت کا اقرار نہیں کرتے، اسے اللہ اور معبود نہیں مانتے، دوسروں کو اس کی ذات یا صفات میں شریک کرتے ہیں، ان کو اللہ کریم ہدایت نہیں دیتے، ان کی قسمت میں گمراہی آجاتی ہے۔ اور جسے اللہ گمراہ کردے پھر کوئی اس کی مدد کرنے والا ہی نہیں۔

اللہ کریم نے توحیدِ باری کا شعور پانے، ہدایت کے راستے کو سمجھنے کے لیے کائنات میں اپنی قدرت کی بے شمار نشانیاں بکھیر دی ہیں۔ ہدایت کے طالبوں کے سمجھنے کے لیے فطرت کے یہ مظاہر کافی ہیں۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ نے دلیل سے کفر کو غلط ثابت کیا جب نمرود نے کہا، میں خود معبود ہوں، مخلوق کا مالک ہوں، کسی کو زندہ رکھوں یا کسی کو ماردوں جو چاہوں کروں۔ ابراہیمؑ نے ایک ہی دلیل بیان فرمائی۔ فرمایا، میرے ربّ نے جو نظام بنایا ہے اس میں وہ سورج کو مشرق سے طلوع فرماتا ہے۔ اگر تو اپنے آپ کو مالک کہتا ہے تو سورج کو مغرب سے

طلوع کر اور مشرق میں غروب کر دے۔ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ۔۔۔(البقرہ:258) تو کافر مبہوت رہ گیا کہ وہ تو ایسا نہیں کر سکتا۔

ہر چیز پر اللہ کی قدرتِ کاملہ کا اختیار ہے۔ انسان کو اس نے ایک چھوٹا سا اختیار دیا ہے کہ وہ ہدایت اپنانے کا فیصلہ کرتا ہے یا گمراہی کا۔ ہدایت کا راستہ ایک ہے، باقی سارے راستے گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ انسان اگر ہدایت کا راستہ چنتا ہے تو اللہ کریم اسے قبول فرماتے ہیں اور اپنے انعامات سے نوازتے ہیں اور اگر وہ اپنی پسند سے گمراہی کی طرف جاتا ہے تو اللہ کریم کی ناراضگی مول لیتا ہے، جس کے نتیجے میں اللہ کریم کی طرف سے اس پر گمراہی مسلط کر دی جاتی ہے۔ اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر کون ہے جو اس کے کیے ہوئے کام کو پلٹ سکے۔ جسے اللہ بھٹکا دے، اور اللہ اسے اس کے اپنے فیصلے کی وجہ سے بھٹکاتا ہے۔

ہر سزا عمل کا بدلہ ہے:

پھر اسے لوگوں میں سے کوئی دوست، معاون اور مددگار نہیں ملتا جو اس کی قسمت کو تبدیل کر دے اس فیصلے کا آخرت میں انجام یہ ہوگا: وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا۔۔۔ ہم میدانِ حشر میں ان کو اندھا، بہرا اور گونگا بنا کر اٹھائیں گے یعنی ان کے ذرائع علم ختم کر دیے جائیں گے۔ وہ دیکھ نہیں سکیں گے، سن نہیں سکیں گے، اپنی بات کہہ، سن نہیں سکیں گے اس لیے کہ دنیا میں اللہ نے انہیں سننے، دیکھنے اور بات کہنے کی قوت دی تھی۔ یہ نعمتیں معرفتِ حق کے لیے تھیں اس لیے دی تھیں کہ نظامِ کائنات کو دیکھ کر کائنات کے خالق کی عظمت کا اقرار کریں، نیکی کی بات سن کر انہیں قبول کریں، قوتِ گویائی اس لیے دی تھی کہ حق کی بات کہیں۔ انہوں نے اتنی بڑی نعمتوں کو دنیا میں ضائع کر دیا تو میدانِ حشر میں ان سے یہ نعمتیں سلب کر لی جائیں گی۔ اللہ نے زندگی معرفتِ حق کے لیے دی تھی، اسے انہوں نے حق سے بیزاری میں گزار دیا لہٰذا میدانِ حشر میں وہ سن سکیں گے نہ دیکھ سکیں گے اور انجام کار ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے: مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ۞ جب اس کی آگ مدہم پڑنے لگے گی تو اسے پھر سے تازہ کر دیا جائے گا اور وہ ہمیشہ بھڑکتی ہی رہے گی۔ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۞ یہ اس بات کا بدلہ ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور مسلسل انکار کرتے رہے۔ اب ان کے لیے دوزخ بھی مسلسل بھڑکتی رہے گی یعنی ان کے کردار نے ہی دوزخ کو ایندھن مہیا کیا۔ جس طرح ان کے انکار کرنے میں کمی نہ آئی اسی طرح دوزخ کی تیزی میں بھی کمی نہیں آئے گی۔ ہر سزا عمل

کا بدلہ ہے۔انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا کہ جب ہم گل سڑ کر ہڈیاں ہو جائیں گے بلکہ ہڈیاں بھی چُور چُور ہو کر مٹی میں مل جائیں گی تو پھر کیسے ممکن ہے کہ کوئی ہمیں نئی مخلوق بنا کر کھڑا کر دے؟

کیا وہ اللہ کی کائنات پر غور نہیں کرتے، کیا وہ اپنی آنکھوں سے چیزوں کو بنتا اور ختم ہوتا نہیں دیکھتے؟ یہ تو روزمرہ کے مشاہدے میں آنے والی باتیں ہیں۔زمین پر کتنا سبزہ لہلہاتا ہے، گھاس کے تنکے گنے نہیں جاسکتے پھر ساری گھاس خشک ہو جاتی ہے۔کیا اسی زمین پر اچھی نئی سبز گھاس نہیں نکل آتی؟ درختوں پر ان گنت پتے ہوتے ہیں، خزاں آتی ہے تو جھڑ جاتے ہیں، مٹی میں مل جاتے ہیں، پھر اسی درخت پر نئے ہرے بھرے پتے نہیں نکل آتے؟ دن گزر جاتا ہے کیا پھر نیا دن نہیں آ جاتا، رات گزر جاتی ہے پھر نئی رات نہیں آ جاتی؟ کائنات میں ہر عمل مسلسل جاری ہے۔اس میں حیرت کی کیا بات ہے جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں۔

فرمایا: اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنۡ يَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ ۔۔۔کیا زمین و آسمان بنانے والے کی قدرت کے مظاہر نظر نہیں آتے؟ وہ اللہ جس نے آسمان پیدا کیے اور اس میں کتنا وسیع جہان آباد کیا، صرف وہی جانتا ہے کہ آسمانوں میں کیا کیا بنا رکھا ہے۔جس نے زمین بنائی اور زمین میں خزانے رکھ دیے۔زندگی بھر زمین سے ساری مخلوق اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرتی رہتی ہے اور اس کے خزانے کبھی ختم نہیں ہوتے۔ہر سال فصلیں کاشت کی جاتی ہیں، ہر سال کھیت پیداوار دیتے ہیں۔کھیت خالی ہوتے ہیں پھر بیج ڈالا جاتا ہے پھر فصل اگتی ہے۔یہ سب کچھ انسانوں کے سامنے ہے۔اسی زمین سے سونا، چاندی، دیگر دھاتیں نکل رہی ہیں ابھی مزید موجود ہیں۔ہر طرح کی بوٹیاں جن سے ادویات بنتی ہیں، اگ رہی ہیں، موسموں کے ساتھ اگتی ہیں، پھر زمین خشک ہو جاتی ہے پھر اللہ کریم اسے نمو دیتے ہیں وہ پھر اپنے خزانے اگلتی ہے اور یہ کام صدیوں سے جاری ہے۔چیزیں بن رہی ہیں، بکھر رہی ہیں اور یہ عمل مسلسل تمہارے سامنے جاری ہے تو تمہیں اس پر کیوں حیرت ہوتی ہے؟ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔وَجَعَلَ لَهُمۡ اَجَلًا لَّا رَيۡبَ فِيۡهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوۡنَ اِلَّا كُفُوۡرًا ۝۹۹ اس نے انسانوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا وقت طے کر دیا ہے، وقتِ مقررہ پہ قیامت قائم ہوگی، سب دوبارہ زندہ ہوں گے، اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔اسے نہ ماننے والے خود اپنے آپ کے ساتھ ظلم کر رہے ہیں۔حقیقت کا انکار کر کے اپنا نقصان خود کر رہے ہیں۔

ربوبیت صرف اللہ کی شان ہے:

انسان تو تخلیقی طور پر تنگ دل ہے۔ یہ تو اللہ کریم ہے جو ہر ایک کو پال رہا ہے، ہر متنفس کو روزی دے رہا ہے۔ جس کی غذا گوشت مقرر کی ہے اسے گوشت کھلا رہا ہے، جس کی غذا گھاس بنائی ہے اسے گھاس کھلا رہا ہے، جس کی غذا غلّہ بنائی ہے اسے غلّہ دے رہا ہے۔ جسے جیسا تخلیق فرمایا ہے اس کے مطابق اسے رزق پہنچا رہا ہے۔ اگر اللہ کی رحمت کے خزانے انسانوں کے بس میں ہوتے: قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّیْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا۠ فرمایا، اگر اللہ یہ خزانے انسانوں کے ہاتھ میں دے دے تو وہ اسے خرچ کرنے کے بجائے اس پر قبضہ کر کے بیٹھ رہیں اور کسی متنفس تک نہ پہنچنے دیں اس لیے کہ انسان تخلیقی طور پر ہی بڑا تنگ دل ہے۔ اس کے دل میں وسعت آتی ہی ایمان باللہ سے ہے، برکات رسالت سے ہے۔ بندہ جب برکاتِ رسالت سے، ایمان سے محروم ہو تو سخت کنجوس ہوتا ہے۔ اپنی ذات کے لیے خزانے جمع کرتا رہتا ہے اور کسی کو ذرّہ برابر بھی دینا پسند نہیں کرتا۔ یہ تو اللہ کریم کا احسان ہے کہ تمام بنیادی ضرورتوں کے وسائل کی تقسیم اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ ذرا سوچیں اگر ہوا انسانوں کے بس میں کر دی جاتی یا سورج کی دھوپ حکومتوں اور انسانوں کے اختیار میں ہوتی تو ہوا کا ایک جھونکا وہ کس قیمت پر بیچتے اور دھوپ کی تپش اور حرارت کس بھاؤ ملا کرتی؟ لوگ کتنی خطیر رقم دے کر چند قطرے بارش کے حاصل کرتے یا کتنے لوگوں سے سفارش کرواتے! فرمایا، میں اپنے خزانے لوگوں کے ہاتھوں میں دے دوں تو یہ کسی کو نہ دیں، خزانے بھرے رہیں اور لوگ ترس کر مر جائیں۔ انسانی مزاج ہی ایسا ہے۔

سورۂ بنی اسرآءیل رکوع 12 آیات 101 تا 111

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ﴿۱۰۳﴾ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ﴿۱۰۴﴾ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۱۰۵﴾ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا ﴿۱۰۶﴾ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ وَّیَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَیَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾ ۩ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ﴿۱۱۱﴾

اور بے شک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو نو (۹) واضح نشانیاں (معجزات) دیں تو بنی اسرائیل سے پوچھ لیجیے کہ جب وہ (موسیٰ علیہ السلام) ان کے پاس آئے تو فرعون

نے ان سے کہا اے موسیٰ (علیہ السلام)! میرا خیال ہے تم پر ضرور کسی نے جادو کر دیا ہے ﴿۱۰۱﴾ انہوں نے فرمایا یقیناً تم یہ جانتے ہو کہ یہ سب آسمانوں اور زمین کے پروردگار کے سوا کسی نے نازل نہیں کیے جو کہ سمجھانے کے لیے ہیں اور اے فرعون! بے شک میں یہ سمجھتا ہوں کہ ضرور تیری ہلاکت کا وقت آ گیا ہے ﴿۱۰۲﴾ تو اس نے چاہا کہ ان کو اس سرزمین سے نکال دے تو ہم نے اس (فرعون) کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو ڈبو دیا ﴿۱۰۳﴾ اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے فرمادیا کہ اس سرزمین میں رہو پھر جب آخرت کا وعدہ آئے گا تو ہم تم سب کو جمع کر کے لے آئیں گے ﴿۱۰۴﴾ اور ہم نے اس (قرآن) کو سچائی کے ساتھ نازل فرمایا ہے اور سچائی کے ساتھ نازل ہوا اور ہم نے آپ کو صرف خوش خبری دینے والا اور (انجام بد سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے ﴿۱۰۵﴾ اور ہم نے اس قرآن کو جزو جزو کر کے نازل فرمایا ہے تاکہ آپ اس کو لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سنائیں۔ اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ نازل فرمایا ہے ﴿۱۰۶﴾ فرمادیجیے کہ تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ (یہ حق ہے) بے شک جن لوگوں کو اس سے پہلے (دین کا) علم دیا گیا تھا جب ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں ﴿۱۰۷﴾ اور کہتے ہیں ہمارا پروردگار پاک ہے بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہو کر رہا ﴿۱۰۸﴾ اور ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے گرتے ہیں اور یہ (قرآن) ان کا خشوع (عاجزی) اور بڑھا دیتا ہے ﴿۱۰۹﴾ فرمادیجیے کہ 'اللہ' کہہ کر پکارو یا 'رحمٰن' کہہ کر۔ جس سے بھی تم پکارو گے سو اُسی کے لیے اچھے اچھے نام ہیں اور اپنی نماز نہ تو بلند آواز سے پڑھیے اور نہ بہت آہستہ اور اس کے درمیان کا طریقہ اختیار کیجیے ﴿۱۱۰﴾ اور فرمادیجیے کہ تمام خوبیاں اللہ ہی کے لیے ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے اور نہ سلطنت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ اس وجہ سے کہ اُسے کوئی ضرورت ہے کوئی اُس کا مددگار ہے۔ اور اُس کو بڑا جان کر اُس کی بڑائی کرتے رہیے۔ ﴿۱۱۱﴾

تفسیر و معارف

فرمایا: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۔۔۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا کہ اللہ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کتابِ حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ پہلے بھی انبیاءؑ مبعوث ہوئے، رسلؑ تشریف لائے، کتابیں لائے اور اللہ نے انہیں عظیم الشان معجزات سے نوازا۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے نو (9) نشانیاں دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو عصا تھا اس میں بے شمار معجزات سمو دیے۔ آپ علیہ السلام کے ہاتھ مبارک میں نور آ جاتا تھا۔ پھر فرعون کی قوم پر ان کی گستاخیوں کے سبب مختلف عذاب آتے رہے اور موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ٹلتے رہے۔ قحط آیا، پھلوں کی کمی ہوئی، کبھی طوفان آئے، کبھی جوئیں مسلط ہوئیں، کبھی ٹڈیاں چھا گئیں، کبھی ہر جگہ مینڈک ہی مینڈک ہو گئے، ان کے گھر مینڈکوں سے بھر گئے، کھانے کے برتنوں میں، پانی میں، بستروں پر کوئی جگہ نہ بچی۔ پھر پانی، خون ہو گیا، نہ کوئی پانی پی سکتا تھا نہ کھانا پکا سکتا تھا۔ پانی، پانی ہی رہتا لیکن جب بھی کوئی فرعونی اسے پینے کے لیے لیتا تو اس کے منہ میں خون بن جاتا۔ ان کے لیے پانی، خون بن گیا۔

فرعونیوں پر جب بھی کوئی مصیبت آتی موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھاگے بھاگے آتے اور کہتے آپ (علیہ السلام) دعا کریں اس مصیبت سے ہماری جان چھوٹ جائے تو ہم مان لیں گے۔ جب جان چھوٹ جاتی تو پھر اکڑ جاتے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے: وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ ۔۔۔ (الاعراف: 134) اور جب بھی ان پر کوئی مصیبت آتی تو کہتے، اے موسیٰ! (علیہ السلام) ہمارے لیے اپنے پروردگار سے دعا کرو جس کا اس نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے اگر تم ہم سے عذاب کو ٹال دو گے تو ہم ضرور ایمان لے آئیں گے۔ جب اللہ کریم ان سے تکلیف ہٹا دیتے تو وہ عہد شکنی کرنے لگتے۔

اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ ۔۔۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت الی اللہ دی تو کہنے لگا: اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ اے موسیٰ (علیہ السلام) میں خیال کرتا ہوں کہ آپ پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ بھلا میرے سوا کوئی اور معبود ہے، میرے سوا کوئی دوسرا مالک بھی ہے؟ ان سب کا مالک تو میں ہوں، ان کو ساری نعمتیں میں دے رہا ہوں لہٰذا یہ میری عبادت کریں۔ آپ (علیہ السلام) پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے اس لیے آپ (علیہ السلام) ایسی باتیں کر رہے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۔۔۔ تُو نے جو یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے اس کے لیے تو جتنا چاہے جھوٹ بول لے، اندر سے تو جانتا

ہے کہ تیرے بس میں کچھ نہیں۔ اگر تیرے بس میں ہوتا تو جب کوئی تکلیف آتی ہے تو میرے پاس کیوں آتا ہے کہ اللہ سے دعا کردیں ہماری جان چھوٹ جائے۔ جب پانی خون بن گیا تھا تو پلٹ کر اسے پانی بنالیتا۔ تُو خود کو مالک کہتا ہے، ربّ کہتا ہے، لوگوں کا معبود بنا بیٹھا ہے تو جتنے عذاب بھی آئے ہیں انہیں خود دور کردیتا، میرے پاس دعا کرانے کیوں چلا آتا رہا ہے۔ دراصل اندر سے تو بھی جانتا ہے کہ تیرے بس میں کچھ نہیں لیکن اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے اور لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لیے ایسی باتیں کرتا ہے۔ تجھے خبر ہے کہ یہ سارے اللہ کے کام ہیں جو آسمانوں اور زمینوں کا پروردگار ہے۔ اس لیے تم عبرت حاصل کرو، توبہ کرو، رجوع الی اللہ کرو لیکن تم اپنی خدائی برقرار رکھنے کے لیے جھوٹ بولتے ہو۔ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ یہ جو تو اللہ کی عظمت کا انکار اور اپنے ربّ ہونے کا دعویٰ کررہا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ تو تباہ ہوجائے گا۔ تیرا یہ رویّہ تجھے برباد کردے گا، تیرا کچھ باقی نہیں رہے گا۔

فرعون نے بجائے عبرت حاصل کرنے کے یہ سوچا: فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ۔۔۔ کہ ان کو اپنے ملک سے نکال دے، ان کا کہیں نام ونشان نہ ملے۔ جب فرعون نے یہ انتہائی اقدام کا سوچا تو اللہ کریم فرماتے ہیں: فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ﴿۱۰۳﴾ ہم نے اس کو، اس کے ساتھیوں اور لاؤ لشکر سمیت سمندر میں غرق کر دیا کہ تو میرے نبی (علیہ السلام) کو زمین سے کیا نکالے گا، میں تجھے اپنی اس دنیا سے نکال کر آگے بھیجتا ہوں۔ جن فوجوں پر اسے ناز تھا، جس اسلحے پر فخر تھا وہ سب کچھ لے کر سمندر میں ڈوب گیا اور جس پوری قوم کو اس نے غلام بنا رکھا تھا وَقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ﴿۱۰۴﴾ اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ یہ ساری سلطنت تمہارے قدموں میں ہے۔ اس میں رہو لیکن یہ یاد رکھو تمہیں بھی ایک دن میری بارگاہ میں آنا ہے۔ اس پر ہی فریفتہ نہ ہوجانا کہ فرعون کے محلات، اس کے سونے جواہرات کے خزانے، اس کی ہری بھری کھیتیاں اور آب پاشی کا وسیع نظام تمہارے قابو آگیا ہے تو جو چاہو کرو۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ بات سامنے رکھنا کہ جب قیامت قائم ہوگی تو تم سب کو ہم جمع کرلیں گے اور اس دن تمہیں بھی جواب دینا ہے لہٰذا اپنی آخرت کو یاد رکھو۔ دنیوی لذات، دنیوی عہدے واقتدار پانے کے بعد آخرت کو نہ بھول جانا، آخرت کو مدنظر رکھنا۔ دنیا میں اس طرح جینا کہ دنیا میں بھی آسانیاں ہوں اور آخرت میں بھی آسانی ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد باری ہے: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔۔۔ (البقرہ:210) کہ اے ہمارے ربّ ہماری دنیا بھی خوب صورت ہو، آرام دہ ہو اور آخرت بھی۔ چونکہ آخرت کا مدار اسی دنیا کی زندگی پر ہے اس لیے اسے اللہ کے حکم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر گزارو گے تو یہاں بھی عزت اور آسانی ہوگی اور آخرت

میں بھی عزت اور آسانی ملے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصبِ جلیلہ:

فرمایا: وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ۔۔۔ہم نے قرآن کو حق کے ساتھ پوری سچائی کے ساتھ نازل فرمایا ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۱۰۵﴾ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصبِ عالی ہے کہ جو ایمان لائے اسے بشارت دیں، خوشخبری دیں اور جو انکار کرے اسے آخرت کے عذابوں کی بروقت اطلاع دیں۔

اردو کا دامن تنگ ہے، عربی الفاظ کا صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اردو میں لفظ نذیر کا معنی ڈرانے والا لکھا جاتا ہے جو اس کا مکمل مفہوم نہیں ہے کیونکہ ڈر کئی قسم کے ہوتے ہیں، جیسے موذی جانوروں کا ڈر، ڈاکوؤں کا ڈر یا دشمنوں کا ڈر۔ انبیاءؑ کا ڈرانا مختلف ہے۔ انبیاءؑ نذیر ہوتے ہیں۔ یہ لوگوں کو ان کے برے اعمال کے برے انجام سے ڈراتے ہیں۔ دنیا میں ہی بتادیتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ کر رہے ہو اس کا آخرت میں نتیجہ کیا ہوگا۔ اگر برائی کر رہے ہو تو برا انجام پیش آئے گا۔ نذیر کا مفہوم یہ ہے کہ نبی علیہ السلام بندے کو بروقت اطلاع فرمادیتے ہیں۔ جیسے کوئی ڈاکٹر، حکیم یا طبیب کسی کو کوئی غلط غذا کھاتے دیکھے تو اسے بتادے کہ اس سے تمہارا معدہ خراب ہو جائے گا۔ گویا اس نے اسے بروقت متنبہ کردیا کہ یہ چیز کھاؤ گے تو یہ تمہیں بیمار کردے گی لہٰذا یہ نہ کھاؤ۔

انبیاءؑ وہ بات بتاتے ہیں جو کوئی ڈاکٹر، طبیب، فلاسفر، دانشور نہیں بتاسکتا۔ وہ بتاتے ہیں کہ دنیا میں تمہارے اس برے عمل کا جو نتیجہ نکلے گا وہ بڑا تکلیف دہ ہوگا۔ اگر تم ایمان سے فرار حاصل کر رہے ہو تو ہمیشہ کے لیے جہنم گلے پڑ جائے گی۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع نہیں کرتا، اسے بروقت اطلاع دیتے ہیں کہ یہ جو تم کر رہے ہو اس کا انجام بہت برا ہے۔ اگر کوئی اتباعِ پیغمبرؑ میں سستی کرتا ہے تو اسے اس کی سزا سے آگاہ کردیتے ہیں۔ اور جو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کرتا ہے، خلوص اور دیانت کے ساتھ کرتا ہے تو اسے خوشخبری دیتے ہیں کہ تجھ پر اللہ کا انعام ہے، تیرے لیے دنیا و آخرت میں نیک انجام ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصبِ جلیلہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نیکی پر نیک انجام کی بشارت دیں اور برائی پر اس کے برے انجام سے اس دنیا میں ہی مطلع فرمادیں پھر کون ایمان لاتا ہے اور کون نہیں، فرمایا، یہ معاملہ میرے اور میرے بندوں کے درمیان ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات مانے اس پر میں انعامات کی بارش کروں گا اور جو نہیں مانے گا اسے سزا دوں گا۔

قرآن کا تدریجاً نزول اللہ کا کرم ہے:

فرمایا: وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾ قرآن کو تدریجاً نازل

کرنا، اللہ کا کرم ہے۔ فرمایا، ہم نے قرآن کو جزو جزو کر کے تیئس (23) برسوں میں نازل فرمایا کہ جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا، ہم اس کا جواب نازل فرمادیتے اور وہ ہمیشہ کے لیے طے ہو جاتا۔ ہر آیت کا شانِ نزول، مسئلہ اور اس کا حل واضح کرتا ہے اور اس سے پتا چلتا ہے کہ فلاں سورۃ میں، فلاں آیت میں یہ مسئلہ بیان ہوا ہے۔ اگر ہم اسے اکٹھا نازل فرما دیتے تو مسائل کا حل تلاش کرنا دشوار ہوتا اور اختلافات بھی پیدا ہو جاتے۔ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ۔۔۔اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلّم) ہم نے اسے جزو جزو کر کے نازل کیا ہے تو آپ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) بھی آیات کو ٹھہر ٹھہر کر، الگ الگ کر کے سمجھا کر آرام سے پڑھیں تا کہ ہر آیت کا مفہوم ہر آدمی کی سمجھ میں بآسانی آتا رہے۔ وَنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾ ہم نے اسے اس طرح نازل کیا ہے جس طرح نازل فرمانے کا حق تھا۔ قدرتِ باری نے موزوں ترین طریقے پر قرآن نازل فرمایا تو (آپ صلی اللہ علیہ وسلّم) بھی اسی انداز سے تلاوت فرمایئے تا کہ ہر ایک کو بات سمجھ آجائے۔

گزشتہ الہامی کتابیں، عظمتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر گواہ:

فرمایا: قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) انہیں فرما دیجیے، تم لوگ ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، تم مانو یا نہ مانو، تم قرآن پر یقین کرو یا نہ کرو لیکن یہ ایسی کتاب ہے کہ جس کا تذکرہ پہلی الہامی کتابوں میں موجود رہا ہے۔ ان کتابوں میں قرآن کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی عظمت سے بھی مطلع فرمایا گیا۔ جن لوگوں کے پاس پہلی الہامی کتابوں کا علم ہے، ان پر جب قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں۔ انہیں سمجھ آجاتی ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ وہ صرف رواجاً تسلیم نہیں کرتے بلکہ حقیقتاً سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں کہ یہ اللہ جل شانہٗ کا عظیم کلام ہے، اس کیفیت کے ساتھ بے ساختہ سجدے میں گر جاتے ہیں۔ سجدے سے مراد ہے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔۔۔(البقرہ:285) ''ہم نے (آپ کا حکم) سنا اور ہم نے قبول کیا''۔ یعنی ایسے لوگوں پر جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اللہ کریم! ہم نے قرآن کو سنا اور قبول کیا۔

وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ اور کہتے ہیں، ہمارا پروردگار پاک ہے اور اس کا وعدہ یقیناً پورا ہو کر رہا۔ پہلی الہامی کتابوں میں اس وعدے کے پورا ہونے کی اطلاع دی گئی تھی۔ آج وہ ہمارے سامنے ہے یعنی قرآن کوئی اچانک نازل نہیں ہوا، پہلی کتابیں، پہلے صحیفے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے مبعوث

ہونے کی پہلے سے خبر دیتے رہے۔ انبیائے کرام، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلّم کی تشریف آوری کی اطلاع دے کر گئے۔ تمام الہامی کتابوں میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلّم کا، بعثتِ عالی کا، نزول قرآن کا اور عہد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اور بہت سی باتوں کا ذکرِ خیر تھا۔ بعثتِ نبوی کے وقت پہلی امتوں کے کچھ خوش نصیب لوگ ایسے بھی تھے جن کے پاس پہلی کتابوں کا علم بھی تھا، وہ اس پر یقین رکھتے تھے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے، وہ صاحب علم تھے۔

صاحبِ علم:

عالم یا صاحبِ علم اسے کہا جاتا ہے جو جانتا بھی ہو، مانتا بھی ہو، اس پر عمل بھی کرتا ہو۔ وہ جو جانتا ہے، مانتا نہیں وہ صاحبِ علم نہیں اور جو جانتا ہے، مانتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا وہ بھی صاحب علم نہیں۔

قرآنِ حکیم میں ہے کہ کسی جہالت کی وجہ سے جب بندے سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے اور وہ توبہ کر لیتا ہے تو اللہ کریم اسے معاف فرما دیتے ہیں۔ اس کی تشریح میں علمائے تفسیر لکھتے ہیں کہ گناہ کرنے والا خواہ کتنا بڑا عالم بھی ہو، جب اس سے گناہ سرزد ہوتا ہے اس وقت وہ جاہل ہوتا ہے۔ گویا اطاعت نہ کرنا گناہ ہے اور جب کوئی شخص اطاعت نہیں کرتا تو وہ جاہل ہوتا ہے۔ جب پڑھا لکھا شخص اطاعت نہیں کرتا تو وہ بھی اس وقت جاہل ہوتا ہے۔ اور کوئی ان پڑھ اطاعت نہ کرے تو وہ بھی جاہل ہے۔

فرمایا، پہلی امتوں کے صاحبِ علم جنہوں نے جانا بھی، مانا بھی اور اس پر عمل بھی کرتے رہے۔ وہ ایسے خوش نصیب لوگ تھے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا زمانہ پایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لے آئے اور اکابر صحابہؓ میں ان کا شمار ہوا۔ فرمایا، ان سے پوچھ لو، ان کے سامنے جب قرآن کی تلاوت ہوتی ہے تو یہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور کہتے ہیں، ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا پروردگار پاک ہے اور یقیناً ہمارے پروردگار کا (بعثتِ عالی کا، اور نزولِ قرآن کا) وعدہ پورا ہوا۔ اللہ نے پہلی کتابوں میں ذکر کیا تھا کہ میں اپنے عظیم الشان نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو مبعوث فرماؤں گا، ان (علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر اپنی کتاب قرآن نازل کروں گا۔ اللہ نے یہ وعدہ پورا کر دیا، اسی طرح قیامت اور آخرت کا وعدہ بھی یقیناً پورا ہوگا۔ ایسے کہتے ہوئے:

وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿١٠٨﴾ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿١٠٩﴾ وہ سجدے میں گر جاتے ہیں۔

آیتِ سجدہ:

اس آیۂ کریمہ پر سجدہ واجب ہے۔تمام سننے والوں پر بھی سجدہ واجب ہوجاتا ہے (سجدہ کرلیجیے) حکم یہ ہے کہ ایک مرتبہ آیت پڑھی جائے تو سجدہ واجب ہوجاتا ہے۔اسی محفل میں کئی مرتبہ دہراتے رہیں تو ایک ہی سجدہ کافی ہے۔

فرمایا، وہ سجدے میں گر جاتے ہیں، ان پر رقت طاری ہوجاتی ہے اور ان کی آنکھوں سے اشک رواں ہوجاتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں، اللہ کی رضا کے لیے، ان کا یہ رونا، رقت کا طاری ہونا، ان کی ایمانی کیفیات کو بڑھانے کا سبب بن جاتا ہے۔یہ وہ صاحبِ علم ہیں جو پہلے سے ہی خشیتِ الٰہی رکھتے ہیں، قرآن سن کر جب اللہ کی عظمت کا اقرار کرتے ہیں تو ان کا خشوع مزید بڑھ جاتا ہے، اللہ کریم انہیں مزید کرم سے نوازتے ہیں اور ان کے خشوع میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔

قرآن حکیم سن کر جہاں ماننے والوں کے ایمان میں اضافہ ہوا وہاں نہ ماننے والوں کی کج بحثی میں اضافہ ہوا۔ کہنے لگے، پہلے تو یہ مسلمان لوگ ہمیں اللہ کو ماننے کی دعوت دیتے تھے اب کہتے ہیں رحمان اور رحیم کو بھی مانو۔

جب بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ نازل ہوئی تو کفار و مشرکین کہنے لگے، اب اللہ کے ساتھ انہوں نے دو اور معبود الرحمن اور الرحیم بھی بنالیے ہیں تو یہ ہم سے کیا منوانا چاہتے ہیں؟

فرمایا: قُلِ ادۡعُوا اللّٰهَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدۡعُوۡا فَلَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى ۔۔۔انہیں فرما دیجیے کہ آپ اللہ کریم کو اللہ پکاریں جو اس کا ذاتی نام ہے یا اسے اس کے صفاتی ناموں الرَّحۡمٰنِ، الرَّحِيۡمِ سے پکاریں، جس نام سے بھی پکارو، سب خوبصورت نام اسی کے ہیں۔ الرَّحۡمٰنِ کی کوئی الگ حیثیت نہیں اور الرَّحِيۡمِ کی کوئی الگ حیثیت نہیں۔ اللہ اس کا ذاتی نام ہے، باقی اس کے صفاتی نام ہیں، جتنے بھی صفاتی ناموں سے پکارو گے تو بھی اسی ذاتِ الٰہی، اللہ کو پکارو گے۔

اسمِ اعظم:

ایک بات ضمناً عرض کرتا چلوں کہ اکثر لوگوں کو بہت شوق ہوتا ہے کہ معلوم کیا جائے اسمِ اعظم کیا ہے؟ لوگوں نے اس پر بڑی تحقیقات بھی کی ہیں، کتابیں بھی لکھی ہیں کہ فلاں آیت میں اسمِ اعظم ہے۔ سادہ سی بات ہے کہ اللہ کا ذاتی نام اللہ ہے باقی اس کے صفاتی نام ہیں۔ قرآنِ حکیم میں مختلف سورتوں میں، سورۃ الحشر، البروج، الحدید،

التوبہ، یونس، یوسف اور کئی دیگر سورتوں میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے صفاتی موجود ہیں۔ ہر نام ایک صفتِ باری کا نام ہے۔ایک ذاتی اسمِ مبارک ہے اللہ جس میں تمام صفات پائی جاتی ہیں۔ یہ سادہ سی بات تو ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ جز و بڑا ہوتا ہے یا کُل ۔ایک دریا سے پچاس نہریں نکال لیں تو دریا بڑا ہوگا یا نہر؟ منبع تو دریا ہے جس میں ساری نہریں سما جاتی ہیں۔اسم اعظم ''اللہ'' ہے جو اللہ کریم کا ذاتی نام ہے۔باقی سارے صفاتی نام اس میں سما جاتے ہیں۔

سادہ سی بات ہے اجزاء بڑے نہیں ہوتے کُل بڑا ہوتا ہے جن سے جز و بنائے جاتے ہیں۔کسی درخت کی بہت سی شاخیں ہوں تو درخت کا حصہ ہوتی ہیں، درخت نہیں۔تمام صفاتی نام بھی اسی ذاتی نام ''اللہ'' میں شامل ہیں۔

اسم کے معنی ہیں نام اور اعظم کے معنی بڑا یعنی 'بڑا نام' تو اللہ کا بڑا نام اللہ ہے جس میں سارے نام سما جاتے ہیں۔یہی اسمِ اعظم ہے۔اب یہ الگ بات ہے کہ کسی کو اللہ کہنا آ جائے۔ایک ہے کسی لفظ کو زبان سے ادا کرنا اور ایک ہے کسی کو اللہ وہ کیفیات بھی دے دیں کہ اس کی زبان سے نکلے تو اسمِ اعظم بن جائے۔ یہ الگ بات ہے اور اللہ کی عطا ہے۔

فرمایا: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ۔۔۔آپ اللہ کریم کو اس کے ذاتی نام اللہ سے پکاریں یا صفاتی نام سے: اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى پکاریں۔۔۔ سارے خوبصورت اور پیارے نام ہیں، اللہ ہی کے ہیں۔ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا ۔۔۔فرمایا، اپنی صلوٰۃ میں قرأتِ قرآن کو اتنا بلند نہ کرو کہ نامناسب ہو جائے اور اتنا آہستہ بھی نہ کرو کہ مقتدی سن ہی نہ سکیں۔ وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾ اس کے درمیان میں رہیں کہ نہ تو شور ہو اور نہ مسجد کے اندر کسی کو سننے میں دقت ہو۔

شبینہ اور لاؤڈ سپیکر:

یہاں ضمناً یہ بات بھی آ جاتی ہے کہ ہمارے ہاں رمضان کے آخری عشرے میں رواج ہے کہ شبینہ کراتے ہیں۔رات بھر میں قرآن ختم کیا جاتا ہے تو پوری آبادی میں دور دور تک قرأتِ قرآن سنائی دیتی ہے۔ یہ درست نہیں، اس طرح قرآن کی توہین ہوتی ہے کہ کوئی سو رہا ہے، کوئی رفعِ حاجت کر رہا ہے، کوئی مریض ہے، کوئی کسی ضروری کام میں مشغول ہے یا کوئی کھانا کھا رہا ہے۔ساری آبادی کو کوئی کیسے مجبور کر سکتا ہے کہ وہ بشری تقاضے روک لے۔ان حالتوں میں قرآن کی تلاوت کی آواز آ رہی ہو تو وہ کیا کرے جبکہ حکم یہ ہے کہ جب قرآن سنایا جائے تو ادب سے، خاموشی سے، متوجہ ہو کر سنا جائے۔ایسی صورت میں لاؤڈ سپیکرز پر زبردستی سنوانے

والے سوچ لیں کہ کس گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہیں!

آدابِ قرآن:

قرآن کا پڑھنا سنّت ہے اور سننا فرض ہے۔ ارشادِ باری ہے: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الاعراف:204) جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ یعنی خاموش رہ کر پورے خلوص سے سننا فرض ہے۔

شبینہ ضرور کرائیں لیکن آدابِ قرآن ملحوظ رکھیں۔ جو مسجد میں آئے ہیں وہ تو سننے آئے ہیں، انہیں سنائیں اور وہ بھی متوجہ ہو کر غور سے سنیں لیکن جو گھروں میں ہیں انہیں سپیکرز کے ذریعے نہ سنوائیں۔ پتا نہیں کون کس حال میں ہے، اس طرح قرآن کی توہین ہوتی ہے۔

اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ شبینہ مسجد میں ہو تو بہت اچھا ہے، گھر میں کرائیں تو اور بھی اچھا ہے، برکت ہوتی ہے لیکن سپیکر باہر نہ لگائیں، آواز گھر کے اندر ہی اندر رہے۔ جسے سننا ہے وہ آکر سنے۔ اس آیۂ مبارکہ میں یہی طریقہ بتایا جا رہا ہے کہ بلند آواز سے تلاوت نہ کریں کہ شور ہو مشرکین کو استہزاء کا موقع ملے اور اتنا آہستہ بھی نہ ہو کہ مقتدی بھی سن نہ سکیں۔ اعتدال میں رکھیں۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿١١١﴾ فرمادیجیے، تمام خوبیاں ایک اللہ کے لیے ہیں جس کی نہ کوئی اولاد ہے نہ کوئی ہمسر، نہ اس کی سلطنت میں کسی کا حصّہ ہے نہ دخل۔ اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ وہ ہر شئے پر قادر ہے۔ وہ سب سے بڑا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ سب سے اعلیٰ، ہے، مالک و مختار ہے جو چاہے کرتا ہے لہٰذا اسے بڑا جان کر اس کی بڑائی بیان کرتے رہیے۔

سورۃ الکھف رکوع 1 آیات 1 تا 12

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۟ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۟ مّٰكِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا ۟ وَّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۟ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآىِٕهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۟ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ۟ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۟ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا صَعِیْدًا جُرُزًا ۟ اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِیْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا ۟ اِذْ اَوَی الْفِتْیَةُ اِلَی الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۟ فَضَرَبْنَا عَلٰۤی اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا ۟ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا ۟

تمام خوبیاں اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے (خاص) بندے پر (یہ) کتاب نازل فرمائی اور اس میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں رکھی ﴿۱﴾ سیدھی (قائم رکھنے والی، استقامت والی، سلیس) تا کہ وہ (لوگوں کو) سخت عذاب سے ڈرائے جو اس کی طرف سے آنے والا ہے اور ایمان والوں کو جو نیک کام کرتے ہیں خوش خبری سنائے کہ ان کے لیے اچھا بدلہ (جنت) ہے ﴿۲﴾ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ﴿۳﴾

اوران لوگوں کوڈرائے جو کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے ﴿۴﴾ اس کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں اور نہ ان کے باپ دادوں کے پاس تھی بہت بھاری بات ہے جوان کے منہ سے نکلتی ہے یہ جو کچھ کہتے ہیں یہ محض جھوٹ ہے ﴿۵﴾ (آپ ان پر اتنا غم کھاتے ہیں) سو شاید آپ ان کے پیچھے اگر اس وہ بات (قرآن) پر ایمان نہ لائے تو مارے غم کے اپنی جان دے دیں (یعنی اتنا غم نہ کیجیے) ﴿۶﴾ بے شک ہم نے زمین پر چیزوں کو اس (زمین) کے لیے رونق کا سبب بنایا ہے تا کہ ہم ان (لوگوں) کو آزمائیں کہ ان میں کون اچھے کام کرنے والا ہے ﴿۷﴾ اور یقیناً ہم اس پر تمام چیزوں کو (فنا کر کے) ایک صاف میدان کر دیں گے ﴿۸﴾ کیا آپ خیال کرتے ہیں یہ کہ غار والے اور رقیم (پہاڑ) والے ہمارے عجائبات (قدرت) میں سے عجیب تھے ﴿۹﴾ جب ان نو جوانوں نے غار میں پناہ لی تو کہنے لگے اے ہمارے پروردگار! ہم کو اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائیے اور ہمارے لیے ہمارے کام میں درستی (کا سامان) مہیا فرما دیجیے ﴿۱۰﴾ سو ہم نے ان کے کانوں پر اس غار میں سال ہا سال تک (نیند کا پردہ) ڈال دیا ﴿۱۱﴾ پھر ہم نے ان کو جگا اٹھایا تا کہ معلوم کریں دونوں جماعتوں میں سے جتنی مدت وہ (غار میں) رہے ہیں (اس کی مقدار) کس کو خوب یاد ہے ﴿۱۲﴾

تفسیر و معارف

سورہ کہف بھی ان سورتوں میں سے ہے جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں۔ اس میں اصحابِ کہف کا واقعہ مذکور ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے اپنا ایک وفد علمائے یہود کے پاس مدینہ بھیجا کہ ہمیں کچھ ایسے سوال بتائے جائیں جو ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر پیش کریں تا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دعوئ نبوت کی پرکھ ہو سکے۔ انہوں نے تین سوال بتائے۔ ایک اصحابِ کہف کے بارے تھا۔ دوسرا ذوالقرنین کے بارے اور تیسرا روح کے متعلق تھا۔ روح کے بارے جواب سورۂ بنی اسرائیل میں دیا جا چکا باقی دونوں سوالوں کے جواب اس سورۂ مبارکہ میں دیے جا رہے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے مطابق واقعہ یوں ہے کہ اصحابِ کہف امیر گھرانوں کے چند اچھے نوجوان تھے۔ دینِ عیسوی کا زمانہ تھا لیکن دین میں تحریف ہو چکی تھی۔ شرکیہ رسومات کو عبادت بنا رکھا تھا جن سے یہ نوجوان بیزار تھے اور اصل دینِ عیسوی کے پیروکار تھے۔

اس عہد کا بادشاہ ظالم، بے دین کافر تھا۔ اس کا نام مفسرین نے دقیانوس لکھا ہے۔ ان نوجوانوں کے توحید پرست ہونے کی خبر بادشاہ تک پہنچی تو اس نے انہیں بلا کر ڈانٹا اور کہا کہ ہمارے باپ دادا کے مذہب پر آ جاؤ اور یہ روّیہ چھوڑ دو۔ بادشاہ نے انہیں مہلت دی کہ خود کو اس مذہب پر لے آؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ انہیں سوچنے کی مہلت ملی تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی قیمت پر اصل دین نہیں چھوڑیں گے البتہ جان بچانے کے لیے اور کفر سے بچنے کے لیے، ظالم بادشاہ کے ظلم سے بچنے کے لیے آبادی سے نکل جاتے ہیں۔ یہ مکمل قصہ اگلی آیات میں آ رہا ہے۔ وہ جنگل میں گئے اور ایک غار میں پناہ گزین ہو گئے۔ اللہ کریم سے دعا کی۔ اللہ کریم نے انہیں اپنی جوارِ رحمت میں لے لیا اور تین سو نو سال بعد ان کی نیند کھلی۔ جاگنے کے بعد انہوں نے اپنے میں سے ایک کو اپنا سکہ دے کر بازار بھیجا تا کہ کھانا خرید لائے۔ لوگوں نے سکّے سے پہچان لیا کہ یہ بادشاہ دقیانوس کے زمانے کا سکہ ہے۔ چونکہ یہ کئی سو سال پرانی بات تھی تو آج بھی جب کسی قدیم زمانے کی بات کا ذکر ہو تو اسے دقیانوسی بات کہتے ہیں۔ اسی بادشاہ دقیانوس کے نام پر لفظ 'دقیانوسی' اردو محاورہ میں آج تک مستعمل ہے۔

جب وہ نوجوان ظاہر ہوئے تو اس وقت ملک پر ایک مسلمان بادشاہ حکمران تھا۔ ظالم بادشاہ کا دور ختم ہو چکا تھا۔ دقیانوس کی نسل ختم ہو چکی تھی۔ موجودہ بادشاہ خود دینِ عیسوی پر تھا لیکن اس وقت تک دین میں بہت سی باتوں کی آمیزش کر دی گئی تھی، حقائق مسخ ہو چکے تھے حتیٰ کہ ایک فرقہ حیات بعد الموت کا انکار کر رہا تھا۔

مالی و دنیوی مفادات کے لیے لوگ ہمیشہ سے گمراہ ہوتے رہے ہیں۔ خود باتیں گھڑ لیتے ہیں، نام دین کا ہوتا ہے، حاصل دنیا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ایک بڑا فرقہ ہے جو عذاب وثوابِ قبر اور برزخی زندگی کا انکار کرتا ہے۔

اس زمانے میں بھی یہ فتنہ پیدا ہو گیا تھا، کہا جاتا تھا کہ جو مر گیا، سو مر گیا، کون سی برزخی زندگی اور کیسا عذاب وثواب؟ ایک عظیم فتنہ تھا جو پوری ریاست میں پھیلا ہوا تھا۔ اللہ کریم نے جب اصحابِ کہف کو نیند سے جگا دیا اور وہ تین سو سال بعد پھر زندہ ہو کر ہوش میں آ گئے اور اپنا سکّہ لے کر بازار سے کھانا لینے گئے تو لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ یہ سکّہ تو بہت پرانا ہے، یہ لوگ کون ہیں، کیسے آئے؟ یوں وہ ساری بات کھلی تو لوگ اس فتنہ سے باز آئے، تائب ہوئے، حیات بعد الموت کا اقرار کیا مسلمان ہو گئے اور یوں یہ فتنہ ختم ہو گیا۔ اللہ کریم نے پھر انہیں موت دے دی۔

بندوں کی ہدایت لیے اللہ کا نظام:

اللہ کریم نے بندوں کی ہدایت کے لیے ایسا نظام بنا رکھا ہے جس میں ہر سبب اپنے وقت پر ظاہر ہو کر مخلوق کی ہدایت کا سامان بن جاتا ہے۔ اصحابِ کہف کو تین سو سال بعد ایسے وقت میں ظاہر کرنا جس میں عقائد کی خرابی کا فتنہ کھڑا تھا، اللہ کریم کے نظام کی منصوبہ بندی کا حصہ تھا۔ اللہ کریم نے تین سو سال پہلے انہیں غار میں مقیم کر دیا، صدیوں بعد جب فتنہء انکارِ حیات بعد الممات، سماعِ موتیٰ وغیرہ پیدا ہوئے تو اللہ کریم انہیں میدان میں لے آئے اور وہ لوگوں کی ہدایت کا سبب بنے۔ یہ اللہ کریم کے اپنے انتظامات ہیں جنہیں وہ خود ہی بہتر سمجھتے ہیں۔

اللہ کے خوش نصیب بندے:

انبیاء کرام علیہم السلام کے سچے پیروکار، اللہ کریم کے ایسے مخلص اور کھرے بندے ہر زمانے میں موجود رہے جن سے اللہ کریم نے مخلوق کی ہدایت کا کام لیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی اُمت کے خوش نصیب افراد رہتی دنیا تک اسی نظامِ حیات کی کڑی بنتے رہیں گے۔ ہماری نسبتِ اویسیہ کو ہی دیکھ لیجیے، حضرت سلطان العارفین اللہ دین مدنیؒ کو اللہ کریم نے توفیق عطا فرمائی۔

آپؒ کو ذوقِ شہادت عطا ہوا، آپؒ غزوۃ الہند میں شرکت کی غرض سے مدینہ منورہ سے چل کر یہاں برصغیر پہنچے، یہیں لنگر مخدوم میں وصال ہو گیا۔ تین سو سال تک ان کی قبر کا ایک رواجی احترام، جو کسی بزرگ کی نسبت سے ہوتا ہے، وہ تو ہوتا رہا لیکن کسی نے ان سے روحانی استفادہ نہیں کیا۔ صدیوں بعد خواجہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ پہلی ہستی تھی جنہیں استفادہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ خواجہ عبدالرحیم خود صوفی تھے، ان کے والد بھی صوفی تھے۔ مراقباتِ ثلاثہ انہوں نے والدِ گرامی سے حاصل کیے۔ مشاہدات بھی تھے۔ آگے راہنمائی کرنے کے لیے کوئی مل نہیں رہا تھا۔ اسی اثناء میں دورانِ ملازمت ان کا تبادلہ لنگر مخدوم ہو گیا۔ یہاں پہنچے، قبر مبارک پر گئے، مکاشفات تو تھے، حضرت اللہ دین مدنیؒ سے روحانی رابطہ ہو گیا، مراقباتِ ثلاثہ لے کر آئے تھے، حضرت مدنیؒ نے فنافی الرسول، فنا بقاء تک مراقبات برزخ سے کرا دیے۔

استاذی المکرم حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ اس علاقے میں کسی کام سے گئے۔ وہاں ایک محفل میں حضرت خواجہ عبدالرحیمؒ سے ملاقات ہوئی۔ وہاں بات چل رہی تھی کہ کیا صاحبِ قبر بات سن سکتا ہے یا نہیں، برزخ میں بات ہو سکتی ہے یا نہیں؟ حضرت جیؒ خود سماعِ موتیٰ کے بڑے مخالف تھے اور آپؒ کی عادت تھی کہ علماء کی محفل میں سماعِ موتیٰ کے خلاف دلائل دیتے تھے لہٰذا وہاں بھی آپ نے دلائل علمی و ظاہری بیان کیے۔ وہاں خواجہ

عبدالرحیمؒ تشریف فرما تھے، آپؒ نے کہا مولانا! آپ کی دلیلیں بڑی وزنی ہیں، آپ کی بات ٹھیک ہوگی لیکن ہمارے ساتھ تو برزخ والے باتیں کرتے ہیں، ہم آپ کی دلیلیں کیسے مان لیں؟ اُن کی یہ بے ساختہ بات، ان کا زہد و تقویٰ، ان کی پارسائی اور خود اُن کو دیکھ کر حضرت جیؒ کو خیال آیا کہ یہ بندہ جھوٹ نہیں بول سکتا، یہ واقعی، حقیقتاً کوئی بات ضرور ہے۔ حضرت جیؒ نے فرمایا، آپ اُن کے ساتھ میری بات کروادیں۔ آپ مزار پر تشریف لے گئے اور یہ سلسلہ آگے چلا۔ تین، سوا تین سو سال بعد یہ سلسلہ رشد و ہدایت اور نسبتِ اویسیہ کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ الحمدللہ آج روئے زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ اللہ کریم کی حکمت ہوتی ہے، جب جہاں، جیسے چاہے اسباب سے کام لے لیتا ہے۔ یہ اس کی منصوبہ بندی تھی کہ جب عقائد زد میں آگئے، ایمانیات میں تشکیک در آئی، حیاتِ برزخیہ کا انکار ہونے لگا، تصوف و مراقبات کا انکار ہونے لگا تو اللہ کریم نے نسبتِ اویسیہ کا چشمہ جو زیرِ زمین تھا، اسے رواں کردیا جس کے سبب سے عقائد و اعمال کی اصلاح کا کام لیا جا رہا ہے، دنیا کے ہر گوشے میں قربِ الٰہی کے متمنی، قربِ الٰہی سے ہمکنار ہو رہے ہیں۔ یہ اللہ کریم کا نظام ہے، خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ کریم اس نظام میں کڑی بننے کی سعادت عطا فرماتے ہیں۔ بلاشبہ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور سب کمالات اسی ایک ذات کے لیے ہیں جو مالکِ حقیقی ہے۔

تمام کمالات، اللہ کے لیے:

فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۟ؕ تمام خوبیاں، سارے کمالات، اس وحدہٗ لاشریک کے لیے ہیں۔ کہیں کسی میں حسن ہے، کسی کے پاس علم ہے یا قوتِ بازو، حکومت ہے یا دولت، سب اللہ کی عطا ہے، کسی کا کچھ بھی ذاتی نہیں۔ جتنے کمالات بھی کسی کے پاس ہیں، سب اللہ کی امانت ہیں۔ اسے وقتی اور لمحاتی طور پر دی گئی ہیں۔ دائمی سب اللہ کی ہیں کہ اس کی ذاتی ہیں۔ وہی حقیقی مالک ہے۔ اس مالک کا بے پناہ شکر ادا کرنا چاہیے جس کی عطا بے پناہ ہے، جس کی عنایات کی کوئی حد نہیں۔ اس نے اپنے بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم پر کتاب نازل فرمائی۔ یہ معمولی بات نہیں، نہ یہ معمولی کتاب ہے نہ کسی عام انسان پر نازل ہوئی۔ فرمایا: عَلٰی عَبْدِهٖ۔۔۔ اپنے خاص بندے پر نازل کی گئی۔ جس ہستی کو خود اللہ کریم اپنا بندہ کہے وہ اور بات ہے اور جو خود کہتا رہے میں اللہ کا بندہ ہوں وہ اور بات ہے۔

عبد دیگر، عبدہٗ چیزے دِگر:

یعنی سب اللہ کے بندے ہیں لیکن جسے اللہ کریم خاص اپنا بندہ کہے وہ مقام اور مرتبہ اور ہے! فرمایا، سب تعریفیں اللہ کریم کے لیے ہیں جس نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلّم پر یہ کتاب اتاری جس میں کوئی الجھاؤ نہیں جو

بڑے سے بڑے عالم اور فقیہہ سے لے کر ایک عام آدمی کی سمجھ اور فہم کے لیے آسان ہے۔ یہ اس کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اس کتاب کی ہر بات بڑی صاف، عام فہم، واضح رکھی ہے جو ایک عام شخص کی سمجھ کے مطابق ہے۔ اللہ کریم نے ایسی لازوال اور بے مثال کتاب نازل فرمائی کہ نزول سے لے کر قیامِ قیامت تک دنیا کے ہر گوشے، ہر ملک، ہر موسم، ہر قوم کے مزاج کے مطابق ہر سوال کا شافی جواب اس میں موجود ہے۔ یہ ایسی جامع، کامل واکمل ہے کہ اس کے بعد کسی کتاب کے نزول کی ضرورت ہی نہ رہی۔

بعثتِ عالی، تکمیل نبوت:

اسے اللہ کریم نے اپنے خاص بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل فرمایا جو اتنا عالی شان نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے کہ جس کی بعثت کے بعد قیامت تک کسی نبی کی ضرورت نہیں رہی جو پوری انسانیت کے لیے اللہ کے نبی و رسول صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں اور ہمیشہ کے لیے ہیں۔

ہم ختمِ نبوت پر دلیلیں دیتے رہتے ہیں لیکن اسے ہم اگر تکمیلِ نبوت کہہ لیں تو دلیلوں کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی یہی مثال ارشاد فرمائی۔ حدیثِ پاک کا مفہوم ہے کہ نبوت ایک شاندار، خوبصورت عمارت تھی، جب کوئی اس کے گرد گھوم کر دیکھتا تو حیرت ہوتی کہ اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی ذاتِ عالی کے بارے فرمایا کہ وہ سِل (اینٹ) میں ہوں، میں وہ ہستی ہوں جس سے اس خلاء کو پُر کر دیا گیا اور عمارت مکمل ہوگئی، نبوت کی تکمیل ہوگئی لہٰذا میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

علمائے حق کے دلائل:

برصغیر میں جب قادیانیت کا بہت زور ہوا تو علمائے حق میدان میں آگئے۔ علمی سطح پر دلائل سے اس فتنہ کا ردّ کیا گیا۔ عوام الناس کی یہ ہدایت و راہنمائی کے لیے مناظرے ہوئے۔ علماء نے اپنی بہترین کوششیں صرف کیں۔ برصغیر کے تمام جیّد علماء قادیانیت کے ردّ کے لیے میدان میں اتر آئے خصوصاً سید انور شاہ کشمیریؒ نے اس میں بہت کام کیا۔ چونکہ تعلیم یافتہ افراد بھی اس فتنہ میں مبتلا ہونے لگے تھے تو علامہ محمد اقبال نے اس ضمن میں سید انور شاہ کشمیریؒ سے تعاون کی درخواست کی۔ علامہ محمد اقبال خود فلسفہ کے ماہر تھے آپ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا مجھے قادیانیت کے بارے بتایئے۔

اہلِ علم اور اللہ کے بندوں کی شان الگ ہوتی ہے۔ کوئی مولوی ہوتا تو کسی آیت کا، کسی حدیث کا حوالہ دیتا، کسی کا قول پیش کرتا لیکن انہوں نے سادہ سا ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ اگر کسی کو نبی مان لیا جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی

انفرادیت ختم ہوجاتی ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا مقام بھی وہی رہ جاتا ہے جیسے پہلے انبیاء کرام دنیا میں آئے، دنیا سے تشریف لے گئے، اُنؑ کے بعد کوئی نیا نبیؑ تشریف لے آیا جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی انفرادیت ہے کہ قیامت تک نئے نبی کی ضرورت نہیں۔ ایسا کوئی نبیؑ پہلے تشریف نہیں لایا جس کے بعد نبوت کی ضرورت نہ رہی ہو۔ اگر ہم کسی کو نبی مان لیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی انفرادیت تو ختم ہوگئی (معاذ اللہ)۔ علامہ مرحوم فلسفہ دان تھے لہٰذا یہ بات ان کے دل میں اتر گئی کہ ایسا نہیں ہوسکتا، یہ ممکن نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم پر نبوت مکمل ہوگئی۔ بس اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔

قرآنِ حکیم، سببِ استقامت:

فرمایا، اللہ نے اپنے محبوب بندے صلی اللہ علیہ وسلّم پر کتاب اتاری جس میں قیامت تک کے لیے ہر بات کا جواب موجود ہے۔ ہر مسئلے کا حل موجود ہے، ہدایت موجود ہے۔

اس کتاب کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس نے اپنے نزول سے لے کر قیامت تک کے لوگوں کو کسی اور کتاب کی حاجت سے بے نیاز کر دیا ہے۔ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ① اس میں کوئی الجھاؤ نہیں اس کی ہر بات عام فہم ہے۔ ایک عام سادہ انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ اسے سنائیں تو وہ سمجھ لیتا ہے۔ یہ اللہ کریم کا اس ضمن میں دوسرا احسان ہے کہ اس نے اپنی کتاب کو اتنا آسان رکھا ورنہ عام قاری کو سمجھ ہی نہ آتی۔ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ ۔۔۔ یہ انسان کو بالکل سیدھا رکھنے والی کتاب ہے۔ اس میں کوئی افراط وتفریط نہیں، کسی طرف جھکاؤ نہیں، بالکل سیدھی، استقامت والی اور حصولِ استقامت کے لیے بہترین ذریعۂ عمل ہے۔ اور ان لوگوں کو دنیا میں ہی ان کے اعمالِ بد کے نتائج سے متنبہ کرنے والی ہے۔ انسان دنیا میں جو خرابیاں کرتا ہے۔ عقائد کی ہوں یا اعمال کی، ان کا جو نتیجہ مابعد الموت سامنے آئے گا، وہ اسے دیکھ کر سخت گھبرائے گا۔ یہ کتاب اس سارے منظر کو دنیا میں ہی، اسی زندگی میں انسان کو بتا دیتی ہے۔ یہ اللہ کریم کا احسانِ عظیم ہے۔ بندہ بے چارگی یا دھوکے میں نہیں مارا جاتا، اپنی بڑائی، گھمنڈ، تکبر یا غفلت سے مارا جاتا ہے۔

اللہ کریم نے تمام انسانوں کے لیے یہ اہتمام کر دیا ہے کہ اتنی عظیم الشان کتاب، اپنے عظیم الشان نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل فرمائی، قیامت تک اس کی حفاظت کا ذمہ خود لیا۔ اس اہتمام کے باوجود اس کو کوئی پڑھے ہی نہیں، سمجھنے کی کوشش ہی نہ کرے تو یہ محرومی اس کی اپنی ہے۔ ایک عام انسان کو کسی کا بھی خط آجائے تو وہ اسے کھولتا ہے، جاننا چاہتا ہے کہ بھیجنے والا کون ہے، کیا لکھا ہے؟ اور جب ذاتِ باری کا ذاتی کلام ہو، انسانوں کے نام ہو جس میں

کوئی کمی، کجی، الجھاؤ نہ ہو، سمجھنے کے لیے آسان اور عمل کے لیے آسان تر ہو اور بندہ ساری زندگی اسے پڑھنے کا تکلف ہی نہ کرے، سمجھنے کی کوشش ہی نہ کرے تو جرم کس کا ہے؟

اہلِ ایمان کون؟

وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝٢ فرمایا، بشارت ہے ایمان والوں کے لیے۔ اہل ایمان کون ہیں، اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا "ایمان والے وہ ہیں جو نیک کام کرتے ہیں۔ جن کے اعمال صالح ہیں۔"

عملِ صالح کیا ہے؟

جس عمل کا حکم اللہ نے دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس پر عمل فرمایا، جس کے عمل کرنے کا ارشاد فرمایا وہ عمل صالح ہے۔ جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا، جس سے قرآن نے منع کر دیا وہ غیر صالح ہے۔ نیند بھی عبادت ہے اگر سنت کے مطابق کی جائے، قتل کرنا بھی عبادت ہے اگر شرعی حکم کے مطابق کیا جائے۔ اگر اپنی خواہشِ نفس سے قتل کیا جائے تو یہ جرمِ عظیم ہے۔ جہاں معاف کرنے اور صلح کرنے کا حکم دیا ہے وہاں صلح کرنا، معاف کرنا عبادت ہے۔

فرمایا، ایمان والے وہ ہیں جو اعمال صالح کرتے ہیں یعنی احکامِ الٰہی پر عمل کرتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع بھی کرتے ہیں۔ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝٢ ایسے لوگوں کو یہ کتاب اجرِ عظیم کی بشارت دیتی ہے۔ جہاں جرم کرنے والوں کو آخرت کی سزاؤں کی اطلاع دیتی ہے کہ یہ جرائم چھوڑ دو ورنہ مصیبت میں جا پھنسو گے وہاں نیکی کرنے والوں کو بشارت دیتی ہے کہ اس پر قائم رہو اس کے بڑے بڑے انعامات ہیں جو ایمان لانے والوں اور اعمالِ صالح کرنے والوں کے منتظر ہیں۔ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝٣ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اس کے انعامات ختم ہونے والے نہیں۔

دنیوی زندگی بہت مختصر ہے۔ اس کے لمحوں کا حساب لگایا جائے تو اخروی زندگی کے مقابلے میں یہ بہت قلیل عرصہ ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا: وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (الحج:47) عند اللہ ایک دن ہزار سال کا ہے۔ پانچ ہزار کے پانچ دن ہوئے۔ ہزاروں سالوں میں کتنی مخلوق گزر گئی اور ہم ایسے بیٹھے ہیں جیسے ہم نے یہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ اگر بالفرض دنیا کی پہلی انسانی آبادی سے لے کر آج تک کی انسانی آبادی تک دنیا کی عمر پانچ ہزار سال ہے تو اس حساب سے ہماری عمر تو پانچ منٹ بھی نہیں بنتی اور ہم ہیں کہ یہ پانچ منٹ بھی ہم اللہ کی اطاعت

نہیں کرسکتے۔ان چند لمحوں میں بھی گمراہ ہوجاتے ہیں۔آخرت میں بھی ایسا ہی محسوس ہوگا۔کہیں گے کہ دنیوی زندگی تو کوئی پل تھا، لمحہ تھا جو گزر بھی گیا، پتا ہی نہیں چلا۔ہم سے اس میں کیوں خطا ہوگئی۔

اور آخرت کے جن انعامات کی خوشخبری یہ کتاب دیتی ہے وہ ہمیشہ کے لیے ہوں گے انعام یافتہ لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

حد سے گزر جانے والے:

فرمایا: وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ﴿۴﴾ ان لوگوں کو ان کے کفریہ عقائد سے ڈرایئے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے۔یوں تو گمراہی کی کئی صورتیں ہیں۔اللہ کے ساتھ انسانوں، بتوں، جنوں اور فرشتوں کو شریک کرلیا کہ فلاں بارش برساتا ہے، فلاں صحت دیتا ہے، فلاں روزی دیتا ہے لیکن ان سب کفریات میں سے شدید یہ عقیدہ ہے کہ معاذ اللہ، اللہ کی اولاد ہے۔اس میں ذاتِ باری پر سیدھا الزام آتا ہے، (نعوذ باللہ) ذات الٰہی کو تقسیم کرنے والی بات ہے۔یہ شدید ترین کفر ہے۔

ایسے لوگوں کو جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی اولاد ہے، یہ کتاب بہت ڈراتی ہے کہ ایسا نہ کہو، یہ بہت حد سے گزرنے والی بات ہے تم یہ بہت بڑا جرم کررہے ہو، گستاخی کررہے ہو۔

دراصل تمہاری باتیں نری جہالت ہے۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ۔۔۔یہ جاہل ہیں اور جہالت کی باتیں کررہے ہیں۔ان کو علم ہی نہیں اور نہ ان کے باپ دادا کے پاس کوئی علم تھا کہ آج تک اس پر انہوں نے کوئی علمی دلیل قائم کی ہو۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ﴿۵﴾ یہ بہت بھاری گناہ کی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے۔اللہ کریم کی ذات پر الزام لگارہے ہیں۔یہ یقینی بات ہے کہ یہ محض جھوٹ بول رہے ہیں۔ان کے پاس نہ عقلی دلیل ہے نہ نقلی، کوئی دلیل ہے ہی نہیں۔

قرآنِ کریم کی انہی باتوں سے تو اہلِ مغرب چڑتے ہیں اور ناراض ہوتے ہیں کیونکہ قرآن لگی لپٹی تو رکھتا نہیں سیدھی بات کہتا ہے جو انہیں کڑوی لگتی ہے۔اور پھر وہ مسلمانوں کے خلاف حیلے کرتے ہیں۔

شفقتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم:

فرمایا: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ ۔۔۔میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلّم) ان لوگوں کا تو یہ کردار ہے کہ کفر و شرک کرتے ہیں، لوگوں پر ظلم کرتے ہیں، ان کی عزتیں لوٹتے ہیں، جانیں لیتے ہیں، مال چھینتے ہیں، اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں، مخلوق کو خالق کی صفات میں شریک کرتے ہیں اور بالکل ہی حد سے گزر گئے ہیں

کہ اللہ کی اولاد مان رہے ہیں۔ یہ حد سے ہی گزر چکے ہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) ان کے لیے اتنے دکھی ہوتے ہیں گویا جان ہی دے دیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دکھ ہوتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثتِ عالی کے بعد بھی لوگ دوزخ کیوں جائیں، کوئی ایسا طریقہ ہو کہ یہ بچ جائیں۔ ہدایت پالیں اور اللہ کی رضا کو پالیں۔

سبحان اللہ! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے مزاجِ کریمانہ پر قرآن گواہی دے رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو کفار کے اسلام نہ لانے پر اتنا دکھ ہوتا تھا گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلّم جان ہی دے دیں گے۔ فرمایا: اِنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَسَفًا ۞ اگر یہ قرآن پر ایمان نہیں لاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اتنا دکھ محسوس فرماتے ہیں تو اللہ کریم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تسلی فرما رہے ہیں کہ اے میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلّم) آپ اس بات کا دکھ نہ کریں۔ کسی نے ان کو زبردستی گمراہ نہیں کیا یہ ان کا اپنا فیصلہ ہے۔ انتخاب کا حق میں نے بندوں کو دے دیا ہے جو راستہ چاہیں اختیار کریں۔ ان کے پاس یہ اختیار آج بھی ہے۔ آج توبہ کرلیں، میں قبول کرلوں گا۔ آج یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی غلامی میں آجائیں، میں ان کے سارے گناہ معاف کردوں گا۔ آج بھی توبہ کرلیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے در پہ آجائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم بھی ان کے لیے دعا کریں تو سارا معاملہ ٹھیک ہوجائے گا لیکن یہ آنا ہی نہ چاہیں تو یہ میرا فیصلہ ہے کہ انہیں زبردستی نہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) لاسکتے ہیں نہ کوئی اور یہ ان کا اپنا انتخاب ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا:

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

کیا شانِ رحمۃ للعالمینی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی! دشمنوں کے دکھ میں گھلے جارہے ہیں تو پھر دوستوں کو، ماننے والوں کو، اتباع کرنے والوں کو کب محروم کرتے ہیں۔ کیا بحرِ کرم ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا، کیا شانِ عالی ہے! آپ صلی اللہ علیہ وسلّم رحمۃ للعالمین ہیں ہر ایک پر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نظرِ کرم ہے۔ اب کوئی اس نظرِ رحمت سے چھپنا چاہے، سامنے نہ آنا چاہے تو یہ اس کی اپنی پسند ہے، اس کا نتیجہ اس کی اپنی ذمہ داری ہے۔

اللہ کریم کا یہ فرمانا کہ آپ ان لوگوں کا اتنا دکھ نہ کیجیے کہ اپنی جان ہی گھلا دیں۔ یہ کوئی محاورہ نہیں، یہ اللہ کریم کا کلام ہے، حقیقت ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ جو ہستی صلی اللہ علیہ وسلّم گمراہوں کی گمراہی پر اس قدر دکھ محسوس کرتی ہے اطاعت گزاروں پر کتنی کریم ہوگی! ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت کرتے ہیں یا سنت سے ہٹ کر رسومات و بدعات کی پیروی کرتے ہیں۔ اللہ نے یہ اختیار ہر ایک کو دیا ہے کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ اگر کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا دامانِ رحمت نہیں تھامنا چاہتا تو چھوڑ کر بھی دیکھ لے!

دنیوی زندگی، ایک امتحان:

دنیا کی زندگی، عرصۂ امتحان ہے۔ یہاں امیر و غریب کا اپنا اپنا امتحان ہے۔ یہ اللہ کریم کا اپنا نظام ہے۔ کسی کے پاس دولت ہے تو اس کی آزمائش ہے اور کسی کے پاس دولت نہیں ہے تو وہ بھی گمراہ ہوسکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ صرف امیر ہی گمراہ ہوں، غریب بھی گمراہ ہوتے ہیں۔ اللہ کی اطاعت سے منہ پھیرتے ہیں۔

دنیا کی زیب و زینت، مال و دولت، عہدہ و اقتدار، اس کی لذتیں ایسی ہیں کہ اس کی چمک دمک اور خوبصورتی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ دنیا کم خوبصورت نہیں، یہ اللہ نے خود بنائی ہے اور سجائی ہے اور اس درجہ سجائی ہے کہ یہی آزمائش ہے کہ بندہ یہ سب کچھ پا کر میری اطاعت میں اسے استعمال کرتا ہے یا اس کی فانی لذتوں پر فریفتہ ہو کر مجھے چھوڑ دیتا ہے۔

فرمایا: اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَى الۡاَرۡضِ زِيۡنَةً لَّهَا لِنَبۡلُوَهُمۡ اَيُّهُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ۞ دنیوی لذتوں کے فانی ہونے کا ذکر فرمایا کہ بلاشبہ ہم نے دنیا کو سجانے کے لیے اس میں زیب و زینت کا بے شمار سامان پیدا کیا ہے۔ اس میں دریا، چشمے، درخت پودے، پھل پھول، زر و جواہر، حکومت و اقتدار سب لذتیں فانی ہیں۔ یہ مستقل رہنے والی چیز نہیں۔ اردگرد یہ تغیر و تبدل جاری ہے۔ یہ سب کچھ کسی کے پاس آتا ہے اور چلا بھی جاتا ہے۔ بڑے بڑے صاحبِ اقتدار جیلوں کی نذر ہو گئے اور راہ گزرتے لوگ بادشاہ بن گئے۔ جب بھی کسی کا وقتِ آخر آ گیا تو محل، قلعے، جائیدادیں جاگیریں، مال و دولت، زر و جواہر ہر شئے چھوڑ کر چلا گیا۔ سانس رخصت ہوا تو مال وارثوں کا ہو گیا، اس کا رہا ہی نہیں۔ محض ایک ٹکڑا کفن کا لے کر چلا گیا۔ باقی اس کے ساتھ اس کے اعمال ہیں، اچھے یا برے، دنیا کی کوئی چیز ساتھ نہیں گئی۔

دنیا کی یہ ساری خوبصورتی اور اس کا حسن بنانے والے نے بنایا ہی اس لیے ہے کہ آزمائشیں کرے۔ مقابلہ یہ ہے کہ ایک طرف پروردگارِ عالی ہے دوسری طرف دنیا ہے۔ بندے کے انتخاب پر ہے کہ وہ کس کو چنتا ہے۔ دنیا استعمال کے لیے ہے۔ ساری نعمتیں مومن کے لیے ہیں۔ اگر دنیا کی نعمتیں جائز طریقے سے حاصل کرے، اسے اللہ کی اطاعت میں استعمال کرے تو بے حد باعثِ ثواب ہے اور اگر اطاعتِ الٰہی کے لیے دنیوی نعمتیں چھوڑنی پڑتی ہیں تو اللہ کی محبت میں انہیں چھوڑ دینا ہی کامیابی کی دلیل ہے۔

قصۂ اصحابِ کہف کا ماحصل:

اصحابِ کہف کا قصہ بیان کرنے سے پہلے ربِّ کریم نے اس کا ماحصل اور نتیجہ ارشاد فرما دیا کہ اصحابِ کہف

لوگوں کی ہدایت کا سبب بنے اور انہیں سمجھ آئی کہ محض دنیوی لذتوں کے لیے اللہ کی نافرمانی کرنا بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔ اور دنیا کو اللہ کے لیے قربان کر دینا بڑی لذت کی اور بڑے نفع کی بات ہے۔ اور یہ کہ جب بندہ اللہ کی خوشنودی، اس کی اطاعت کا فیصلہ کر لے تو ربِّ جلیل اُسے کسی کا محتاج نہیں رکھتا۔ فرمایا، جب اصحابِ کہف نے کفر کے مقابل میری توحید کو ترجیح دی اور جو کچھ ان کے پاس تھا انہوں نے اللہ کے لیے تج دیا تو میں اتنا کریم ہوں کہ میں نے انہیں کسی چیز کا محتاج ہی نہ رہنے دیا۔ انہیں لباس، غذا، چھت، کسی دنیوی حاجت کی محتاجی نہ دی۔ اپنی قدرت سے ہر چیز کو ان کی حفاظت پر پابند کر دیا۔ وہ اس حقیقت کو پا گئے تھے کہ باقی کے سامنے فانی ہیچ ہے۔

فرمایا: وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝۸ دنیا کی تمام زیب وزینت جو ہم نے بنائی ہے اس سب کو فنا کر کے ہم زمین کو صاف میدان بنا دیں گے۔ نہ کوئی محل ہوگا نہ مال و دولت نہ بیش قیمت سواریاں نہ عہدہ اقتدار۔ بالآخر سب کچھ فنا ہو جائے گا۔

اصحابِ کہف اور اصحابِ رقیم:

اصحابِ کہف کے غار کی تعیین کے بارے علمائے مفسرین کی اپنی اپنی تحقیق ہے۔ کسی نے کہا کہ فلسطین میں تھے، کسی نے کہا فلسطین کے جنوب میں ایک علاقہ تھا، کسی نے دیگر جگہوں کے نام لکھے۔ بعض تفاسیر میں ملتا ہے کہ رقیم اس وادی کا نام تھا جس میں غار تھا اور بعض کے نزدیک یہ ایک بستی کا نام ہے لیکن یہ سب اندازے ہیں حتمی بات نہیں۔ حال ہی میں مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی ایک کتاب منظرِ عام پر آئی ہے اس میں انہوں نے اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ اسی تحقیق کے لیے آپ خود وہاں تشریف لے گئے اور انہوں نے لکھا ہے کہ رقیم نام کی ایک بستی اس غار کے باہر وادی میں اب بھی موجود ہے لیکن یہ کوئی مستند بات نہیں کہ آج تک کسی نے متعین کیا ہو کہ یہ وہی غار ہے یا کوئی اور غار ہے۔ اب تو چودہ سو سال اور بھی گزر گئے۔ وہ تو اس سے بھی چار سو سال پہلے کی بات تھی۔ اب تو تقریباً دو ہزار سال گزر چکے۔ اس کی تعیین ضروری بھی نہیں۔ واقعہ چونکہ عجیب وغریب تھا اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بطورِ سوال پیش کیا گیا تو اللہ کریم نے اس کے جتنے ضروری حصے تھے وہ بیان فرما دیے۔ تفصیلات نہیں بتائیں کہ کون کس کا بیٹا تھا، ان کے نام کیا تھے، ان کا غار وادی سے کتنے گز دور تھا، شہر کتنی دور تھا وغیرہ۔ قرآن کریم تاریخ یا جغرافیے کی کتاب نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک واقعہ کے مختلف اجزاء مختلف جگہ بیان ہوتے ہیں اور کئی کئی بار دہرائے جاتے ہیں۔ اس وقت کی ضرورت کے لیے جو بات بطور دلیل جہاں بتانا ضروری ہوتا ہے، اتنی ہی بات ارشاد فرما دی جاتی ہے۔ محض قصہ سنانا مقصود نہیں ہوتا موقع محل پر دلیل دینا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں بھی کفار کو جواب دینا مقصود تھا تو ان کی ہدایت کے لیے اس قصہ کے جتنے

حصے بتانا ضروری تھے اس میں ان کی راہنمائی کر دی گئی۔

اصحاب کہف، قدرتِ الٰہی پر دلیل:

فرمایا: اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡكَهۡفِ وَالرَّقِيۡمِ ۙ كَانُوۡا مِنۡ اٰيٰتِنَا عَجَبًا۝ اے مخاطب! آپ کیا خیال کرتے ہیں، یہ غار والے اور پہاڑ والے، رقیم والے تو یہ ہمارے عجائباتِ قدرت میں سے تھے۔

سوال کرنے والوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ چند انسانوں کو تین صدیاں بغیر کھائے پیئے، چلے پھرے صحت مند اور زندہ رکھنا تمہیں عجیب لگتا ہے اور اس ساری کائنات کو میں نے کب سے بنایا اور ذرّے ذرّے کو قائم کر رکھا ہے، یہ تمہیں عجیب نہیں لگتا؟ تین سو سال تک ان کا سویا رہنا، جسم کا صحیح رہنا، لباس تک کا سلامت رہنا، گرمی سردی کا اثر نہ ہونا، یہ تو تمہیں بڑا عجیب لگتا ہے لیکن یہ ساری کائنات میں نے کب سے بنا رکھی ہے اور کب تک چلاؤں گا، اس کی سمجھ تمہیں نہیں آتی؟ چند لوگوں کا قائم رکھنا تمہیں عجیب لگتا ہے اور اتنی عظیم کائنات کا، زمینوں آسمانوں کا ان میں موجود ساری مخلوق کا قائم رکھنا نظر نہیں آتا؟ اس پر غور کیوں نہیں کرتے کہ انسان، حیوان، چرند پرند، زمینی آسمانی، سمندری آبی، صحرائی، کتنی مخلوق ہے۔ ہر مخلوق کی ہر ضرورت پہنچانا، اسے قائم رکھنا، میری عظمت ہے، میری شان ہے۔ تمہیں میری عظمت کے یہ دلائل نظر نہیں آتے کہ تم ان پر غور کرتے اور اپنی ہدایت کا سامان کر لیتے!

فرمایا: اِذۡ اَوَى الۡفِتۡيَةُ اِلَى الۡكَهۡفِ فَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً وَّهَيِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا۝ یہ چند نوجوان تھے۔ جب انہیں بادشاہ نے مجبور کیا کہ دینِ حق چھوڑ دو اور قوم کے ساتھ کفر و شرک میں شامل ہو جاؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے تو انہوں نے دین کی بجائے یہ خوبصورت دنیا چھوڑ دی۔ مال و دولت، عیش و عشرت سب تج کر ایک غار میں چلے آئے۔

جب غار میں پناہ لی تو عرض کی، اے ہمارے پروردگار! ہم سے یہی ہو سکتا تھا۔ ہم نے کفر و شرک اور بے دینی پر تیری عظمت کو ترجیح دی اور سب کچھ چھوڑ کر تیری بارگاہ میں آگئے ہیں، تو ہمیں قبول فرما، ہماری قربانی قبول فرما۔ ہمیں اپنے دامانِ رحمت میں جگہ عطا فرما اور ہمارے سارے کام درست فرما دے۔ اللہ نے انہیں اپنی جوارِ رحمت میں لے لیا اور انہیں دنیا کی ساری ضرورتوں سے بھی فارغ کر دیا۔

دعا کا سلیقہ:

مفسرینِ کرام اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ دعا مانگنے کا سلیقہ یہ ہے کہ خود کو ذاتی خواہشات و مفادات سے بالا کر کے اللہ کریم کی بارگاہ میں پناہ لے لو۔ مکمل اطاعتِ الٰہی اختیار کر لو۔ پھر جب ہاتھ اٹھاؤ گے تو وہ ہاتھ خالی

واپس نہیں آئیں گے۔

یہ مکر اللہ کے ساتھ نہیں چلتے کہ سارا دن جرم کرو، چوری ڈاکے ڈالو۔ خلافِ شریعت، خلافِ سنت کام کرو اور پھر ایک جگہ اکٹھے ہو کر دعا کرو کہ لوگ کہیں بڑی رقت آمیز دعا کی تھی۔ ایسی رقت آمیزی کی ضرورت نہیں۔ اپنے ساتھ دھوکہ نہ کرو۔ دنیا سے دامن چھڑا کر اس کی اطاعت کی پناہ میں آ کر دعا کرو تو تمہاری دعا سنی جائے گی، اس کا جواب بھی آئے گا۔ جیسا کہ اصحابِ کہف نے ربِّ کریم کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا اور پھر دعا کی تو اللہ کریم نے نہ صرف انہیں محفوظ رکھا بلکہ ان کا کتا بھی تین سو سال سوتا رہا۔ اللہ نے اسے بھی کھانے پینے کی احتیاج سے استثناء دے دیا۔ دنیوی حاجات سے بھی مستغنی رکھا اور زندگی بھی دی۔ اس کا مطلب ہے اللہ کے مخلص بندوں کے پاس بیٹھا جائے تو اللہ کریم قبول فرما لیتے ہیں۔ اللہ کریم نے اس کی بھی ہر طرح سے حفاظت فرمائی۔ یہ ہوتا ہے دعا کا اثر جب دعا خالص اللہ کی اطاعت کر کے کی جائے۔ جرائم کرتے رہنا، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کرتے رہنا، پھر مکر کر کے آنسو بہا کر دعائیں کرنا، گستاخی ہے۔

اللہ کریم نے جب ان کی عرض قبول فرمائی تو فرمایا: فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ﴿١١﴾ مدتوں اس غار میں ہم نے ان کے کانوں پر نیند کا پردہ ڈال دیا۔ اللہ کریم نے قرآن حکیم میں تمام علوم اور حقائق سمو دیے ہیں۔ نت نئی تحقیقات ان حقائق کی سائنسی توجیہات بتائی ہیں۔ قرآن حکیم نے آج سے چودہ سو سال پہلے فرمادیا ''ہم نے ان کے کانوں پر نیند کا پردہ ڈال دیا۔'' اور آج اکیسویں صدی میں سائنس کی تحقیق ہے کہ نیند کے وقت کانوں پر غفلت کا ایک پردہ آجاتا ہے۔ آواز نہیں آتی تو آنکھیں بھی بند ہو جاتی ہیں۔ اور جتنی بھی گہری نیند ہو آواز دینے سے، کانوں میں آواز جانے سے نیند بھی کھل جاتی ہے۔

فرمایا: ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴿١٢﴾ پھر ہم نے ان کو جگا اٹھایا تاکہ اللہ کی قدرتِ کاملہ پر یقین پا کر لوگ ہدایت کا رستہ پالیں وہ سوچیں کہ اصحابِ کہف کس طرح اتنا عرصہ غار میں رہے اور لوگ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ اللہ قادر ہے۔

سورۃ الکھف رکوع 2 آیات 13 تا 17

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ نَبَاَھُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّھُمْ فِتْیَۃٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّھِمْ وَزِدْنٰھُمْ ھُدًی ﴿۱۳﴾ وَّرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِہٖۤ اِلٰـھًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ ھٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖۤ اٰلِھَۃً ؕ لَوْلَا یَاْتُوْنَ عَلَیْھِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا ﴿۱۵﴾ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْھُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ فَاْوٗۤا اِلَی الْکَھْفِ یَنْشُرْ لَکُمْ رَبُّکُمْ مِّنْ رَّحْمَتِہٖ وَیُھَیِّئْ لَکُمْ مِّنْ اَمْرِکُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾ وَتَرَی الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ کَھْفِھِمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُھُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَھُمْ فِیْ فَجْوَۃٍ مِّنْہُ ؕ ذٰلِکَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ ؕ مَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَھُوَ الْمُھْتَدِ ۚ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ وَلِیًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾

ہم ان کا واقعہ آپ سے ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں۔ یقیناً وہ چند نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کر دی تھی ﴿۱۳﴾ اور ہم نے ان کے دلوں کو مربوط (مضبوط) کر دیا جب وہ (دین کے لیے) اٹھ کھڑے ہوئے تو کہنے لگے ہمارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے ہم اس کے سوا ہرگز کسی کو معبود جان کر نہ پکاریں گے کہ اگر ایسا کیا تو یقیناً اس وقت ہم نے بڑی ہی بے جا بات کہی ﴿۱۴﴾ ہماری قوم کے ان لوگوں نے اُس (اللہ) کو چھوڑ کر معبود قرار دے رکھے ہیں یہ لوگ ان (معبودوں) پر کوئی واضح

دلیل کیوں نہیں لاتے تو اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹی تہمت لگا دے ﴿۱۵﴾ اور جب تم ان سے اور ان کے معبودوں سے جو اللہ کے سوا ہیں الگ ہو گئے ہو تو غار میں چل کر رہو تمہارا پروردگار تمہارے لیے اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے لیے اس کام میں کامیابی کا سامان درست فرما دے گا ﴿۱۶﴾ اور (اے مخاطب!) جب دھوپ نکلتی ہے تو تُو اس کو دیکھے گا کہ وہ ان کے غار کی داہنی جانب کو بچی رہتی ہے اور جب چھپتی ہے تو ان کے بائیں جانب ہٹی رہتی ہے۔ اور وہ اس (غار) کے ایک فراخ موقع میں تھے یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے جسے اللہ ہدایت بخشیں سو وہ ہی راہ پاتا ہے اور جسے وہ بے راہ کر دیں تو آپ اس کے لیے کوئی مددگار راہ بتانے والا ہرگز نہ پائیں گے ﴿۱۷﴾

تفسیر ومعارف

واقعہء اصحابِ کہف:

فرمایا: نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾

اصحابِ کہف کے واقعہ میں بہت سی باتیں ملا جلا کر لوگوں نے اس کو کیا سے کیا قصہ بنا دیا تھا تو ارشاد ہوا: نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ۔۔۔ ہم آپ کو ان کی حقیقی کہانی سناتے ہیں۔ واقعہ جو کچھ ہوا وہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سناتے ہیں۔ واقعہ یہ تھا: فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ ۔۔۔ یہ چند نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے۔ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ ہم نے ان کے ایمان پر انہیں یہ انعام عطا فرمایا کہ اُن کو ہدایت میں مزید ترقی دے دی۔ اس واقعہ سے وضاحت ہوتی ہے کہ ایمان کیا ہے اُس کی حقیقت کیا ہے اس کے اثرات کیا ہیں، اس پر انعام کیا ملتا ہے؟ اور اس سے آدمی میں کیا تبدیلی آتی ہے کہ پتا چلے یہ مومن ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ یہ امیر گھروں کے کھاتے پیتے نوجوان تھے۔ ان کے بزرگ شاہی درباری اور بادشاہ کے قریبی لوگوں میں سے تھے۔ بادشاہ سمیت پوری قوم بت پرستی اور کفر و شرک میں غرق تھی لیکن یہ ایمان لے آئے۔ اور ایمان لائے تو اس پختگی سے لائے کہ اللہ کریم فرماتے ہیں ہم نے اُس پر ہدایت وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ بڑھا دی۔ ایمان لانا بھی تو ہدایت تھا لیکن اُن کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہم نے اُن

کے شعور میں وہ باتیں ثبت کر دیں جو اللہ کو پسند تھیں۔ ہدایت میں انہیں ترقی دی اور جو باتیں اللہ کو ناپسند تھیں من جانب اللہ انہیں یقین ہو گیا کہ یہ نہیں کرنا۔

خاصۂ ایمان:

ایمان کی خاصیت یہ ہے کہ جب کوئی خلوصِ دل سے ایمان لاتا ہے تو اللہ کریم اسے یہ توفیق دے دیتے ہیں کہ اسے نیکی سے محبت ہو جاتی ہے اور گناہ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ یہ خاصۂ ایمان ہے اور ہم سب کو اسے اپنے آپ میں ڈھونڈنا چاہیے، ہم دوسروں میں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اللہ کے بندو! دوسروں نے اپنا حساب دینا ہے اسے اپنے آپ میں تلاش کرو، سوچو! میں جب دعویٰ کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں، میں ایمان لایا ہوں تو کیا میں ایمان کے تقاضے پورے کر رہا ہوں؟ ایمان کا سادہ سا تقاضا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو اللہ کی نافرمانی چھوڑ دو۔ کیا میں ایسا کر رہا ہوں؟ ہمارے ہاں تو ایمان یہ ہے کہ ہم نے کلمہ پڑھ لیا۔ اس کے بعد ہم نماز بھی ادا نہیں کرتے۔ فرائض بھی ادا نہیں کرتے۔ حرام حلال کی بھی پروا نہیں کرتے۔ نیک و بد کی بھی تمیز نہیں ہے تو یہ ایمان کس درجے میں ہے؟ اسے ہم کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے جو عند اللہ مقبول نہیں ہے۔ وہ ایمان جو برائی سے روک نہ سکے، وہ ایمان جو نیکی پر پابند نہ کر سکے اس میں جان نہیں ہے، وہ نرا دعویٰ ہے۔ اس میں کوئی طاقت، کوئی قوت نہیں ہے۔ اللہ کریم کا انعام یہ ہے کہ جو یقین لے آئے اللہ کی عظمت پر اس کی توحید پر اور اپنے کام اس سے وابستہ کر دے فرمایا، ہم اس کی راہنمائی میں اور ترقی دیتے ہیں۔ اسے خود بخود نیکی کا راستہ ملتا جاتا ہے اور برائی سے نفرت ہوتی جاتی ہے۔ آدمی پسند کرتا رہتا ہے۔ مجھے یہ جوتا پسند ہے، مجھے یہ کپڑا پسند ہے، یہ گھڑی میری پسندیدہ ہے، یہ گاڑی میری پسندیدہ ہے، یہ جانور مجھے بڑا پیارا ہے، میرا پسندیدہ ہے۔ ہم ساری عمر ایسا کرتے رہتے ہیں۔ ہر بندہ اپنی حیثیت کے مطابق کرتا ہے لیکن مرضیاتِ الٰہی کا پسندیدہ ہو جانا جن باتوں پر اللہ راضی ہے ان کا محبوب ہو جانا اور ان کو نہ چھوڑ سکنا، یہ توفیق اللہ دیتا ہے۔ ہماری محدود نگاہ ہے اور ہم نزدیکی چیزوں کو دیکھتے ہیں جو چیز سب سے قریب تر ہو اسے دنیا کہتے ہیں مادی چیزیں قریب تر ہیں۔ آخرت، روحانیت، عند اللہ درجات یہ بڑی محنت سے جا کر نظر آتے ہیں۔

فرمایا، یہ ایسے نوجوان تھے جو اپنے اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے، ڈٹ گئے۔ انہوں نے ایسا فیصلہ کیا جو بڑا مضبوط تھا۔ یہ ان کے دل کا فیصلہ تھا۔ اللہ چونکہ دلوں کے حال سے واقف ہیں اللہ کریم نے ان پر مہربانی فرمائی۔

وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿١٣﴾ ان کی ہدایت بڑھا دی۔ جو چیزیں اللہ کو پسند تھیں وہ ان کو پسند اور محبوب ہونے

لگیں۔ جو چیزیں اللہ کو ناپسند تھیں اُن سے انہیں نفرت ہونے لگی۔ یہاں ہمیں اپنے آپ کو دیکھنا چاہیے کہ میرا بھی دعوٰئے ایمان ہے۔ کیا میری پسند اور ناپسند وہ ہے جو اللہ کی ہے؟

رابطہ:

فرمایا: وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ۔۔۔اور ہم نے ان کے دلوں کو مربوط کر دیا۔ ان کے دلوں سے ہم نے رابطہ کیا۔ اُن کے دلوں سے ایک خاص تعلق جوڑ لیا۔ یہ رابطہ تو بہت بڑا احسان ہے اللہ کریم کا جس دل کو نصیب ہو جائے وہ اطاعتِ الٰہی پر جم جاتا ہے وہ نہیں دیکھتا کہ اس میں دنیا کا نفع ہے یا نقصان ہے۔ اس کے نتائج کیا ہوں گے وہ کہتا ہے مجھے یہی کرنا ہے۔ جیسے اُمِ موسیٰ علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کی والدۂ ماجدہ کو اللہ کریم فرماتے ہیں: وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى ۔۔۔(القصص:7) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے بات کی، الہام کیا، القاء کیا۔ یہ اللہ کی مرضی۔ فرماتے ہیں، ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے بات کی کہ اس بیٹے کو دریا میں ڈال دو۔ دریا میں اس کا بگڑے گا کچھ نہیں۔ ہم تمہیں لوٹا دیں گے۔ اسے اپنا رسولؑ بنائیں گے۔ اولوالعزم رسولؑ ہوگا لیکن ایک بار تم اسے دریا میں ڈال دو۔ اب یہ کوئی آسان ہے۔ کسی ماں کے لیے کہ نوزائیدہ بیٹے کو دریا میں ڈال دے؟ فرماتے ہیں لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا ۔۔۔اگر ہم اس کے دل سے رابطہ نہ کرتے تو یہ کام اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ یہ رابطہ ایک عجیب بات ہے۔ صحابہ کرامؓ کے حق میں بھی آیا کہ ہم نے ان کے دلوں سے رابطہ کیا۔ فرمایا: وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ ۔۔۔(الانفال:11)

یہاں ان نوجوانوں کے حق میں آ گیا کہ اللہ نے ان کے دلوں سے رابطہ کیا۔ ایک آدمی جب اپنی زندگی بسر کر رہا ہو اور آدمی وہ، جو رئیس زادہ بھی ہو، امیر بھی ہو تو کتنی سوچیں آ سکتی ہیں کہ اگر یہ کروں گا تو گھر چھوٹ جائے گا، اعلیٰ لباس چھوٹ جائے گا، کھانا پینا نہیں ملے گا، دوست دشمن بن جائیں گے، حکومت خلاف ہو جائے گی، جان کا خطرہ ہوگا۔ انہوں نے کچھ نہیں سوچا۔ انہوں نے کہا ہم نے اللہ کی اطاعت کرنی ہے آگے کیا ہوگا؟ یہ اللہ کا کام ہے۔ فرمایا، جب انہوں نے یہ فیصلہ کیا تو ہم نے ان پر ہدایت کے راستے کھول دیے پھر ہم نے ان پر یہ کرم کیا کہ ہم نے ان کے دل سے رابطہ کیا۔ یہ رابطہ سارے تصوف کی بنیاد ہے۔ اب تو رواج ہو گیا اور خاندانی پیر بن گئے ہیں۔ باپ پیر ہے، بیٹا پیر ہے، استعداد ہے یا نہیں، کچھ حاصل کیا ہے یا نہیں بس ایک خانہ پُری ہے۔ پیروں کا بھی ایک خانہ ہے۔ زندگی میں کوئی نام رکھ کے خانہ پُری کر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف اساس ہے دین کی۔ قلبی اور باطنی معاملات، توجہات و برکاتِ نبوت سے چلتے ہیں تو جو حقیقی شیخ ہیں وہ بھی بندے کو لطائف کرا کے محنت کرا کے پھر سارا زور رابطے پہ دیتے ہیں کہ رابطہ کرو لفظ اللہ دل سے اٹھے اور عرش عظیم سے جا کر لگے یہ رابطہ وہ ہے جس کی کوشش بندہ کرتا ہے۔ اور بندہ

اپنی حیثیت کے مطابق کر سکتا ہے۔ لیکن وہ رابطہ اور ہے جو اللہ خود کسی بندے سے فرماتے ہیں۔ بندہ، بندے کی حیثیت سے محنت کر سکتا ہے۔ جب اللہ کرم فرماتے ہیں تو وہ بات اور ہو جاتی ہے۔ جہاں جہاں اتنے اہم کام آئے وہیں اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کے دلوں سے رابطہ کیا۔ کیسے خوش نصیب لوگ تھے جنہوں نے رابطہ الٰہی پایا! فرمایا: وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ۔۔۔ ہم نے ان کے دلوں کو مربوط کر دیا ان کا رابطہ عظمتِ الٰہی سے تجلیاتِ باری سے کر دیا۔ جب وہ تجلیاتِ باری سے پیوست ہو گئے تو غیر اللہ کی انہیں کوئی پروا نہیں رہی۔ کوئی بادشاہ ہے، کوئی مار دے گا، بھوک ہوگی، پیاس ہوگی، لباس وغیرہ۔۔۔ کوئی پرواہی نہیں۔ اللہ کے ساتھ جڑ گئے، سب کام اللہ کے سپرد کر دیے۔ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا﴿۱۴﴾ انہوں نے کہا یہ کیا ہے کہ اپنے جیسی مخلوق کو یہ پروردگار اور حاجت روا مانے بیٹھے ہیں۔ مخلوق تو اپنی تخلیق سے ظاہر ہے کہ خود محتاج ہے۔ مانے تو اسے جس نے کچھ تخلیق کیا ہو وہ خالق ہو۔ یہ تو خود مخلوق ہے۔ اس کو کون مانے! چیونٹی بھی ایک مخلوق ہے اور ہاتھی بھی مخلوق ہے۔ انسان بھی مخلوق ہے کوئی بڑا ہے کوئی چھوٹا ہے لیکن ہے تو مخلوق۔ اس میں الوہیت کی شان تو نہیں آ سکتی کیونکہ وہ خود مخلوق ہے جب وہ اٹھ کھڑے ہوئے تو کہا: رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ ۔۔۔ ہمارا پالنہار ہماری ضروریات پوری کرنے والا، ہماری ساری حاجات پوری کرنے والا ہمارا ربّ ہے جس نے زمین و آسمان تخلیق فرمائے۔

ایک زمین میں اس نے کیا کچھ رکھ دیا کہ آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر آج تک دنیا اسے کھائے جا رہی ہے۔ وہ خزانے ختم ہونے نہیں آتے۔ ہمارے آباؤ اجداد بھی گزارا کر گئے۔ ساری عمریں گزار گئے اور اب دیکھو یہ پہاڑی سے کوئلہ نکل رہا ہے، کروڑوں روپے لوگ کما رہے ہیں۔ اللہ کے خزانے ہیں جب کسی پر کھول دیتا ہے عطا کر دیتا ہے۔ یہی نمک تھا کوئی زیادہ زور لگاتا تو کھانے کے لیے توڑ لاتا۔ وہ بھی حکومتیں توڑنے نہیں دیتی تھیں اب اسی سے لاکھوں کروڑوں کا بزنس ہو رہا ہے اور بک رہا ہے۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا زمین کا ہے اس میں ہم چاول بھی کاشت کر لیتے ہیں، گندم بھی کاشت کر لیتے ہیں۔ سبزیاں بھی کاشت کر لیتے ہیں۔ پتا نہیں یہ سب کچھ کہاں سے آتا ہے ساری زمین کھود مارو تو مٹی ہی مٹی ہے۔ کچھ بھی نہیں لیکن وہ اتنا رزق دے رہی ہے کہ جتنی کارگاہِ حیات ہے۔ درخت، پھول، پھل، بوٹیاں، دوائیں، غذائیں۔ جس نے یہ سارا کچھ بنایا ہے اور جو مسلسل اسے چلا رہا ہے، اسے پروردگار مانیں یا جو خود مخلوق ہے، اسے مانیں؟ ہم تو اپنا ربّ، اپنا پروردگار، اپنی ضروریات کا کفیل اس ایک ربّ اللہ کو مانتے ہیں دراصل انسان اس کے آگے جھکتا ہے۔ جس کے بارے میں یہ سمجھتا ہے کہ اُس سے کچھ ملے گا۔ جس سے سمجھے کچھ نہیں ملنا اسے تو انسان دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ ہم کسی کی خوشامد کرتے ہیں یا دوستی بناتے ہیں سب کے پیچھے

یہ بات ہوتی ہے کہ میرا یہاں سے فائدہ ہوگا اور جہاں یہ پتا ہو کہ میرا نقصان ہوگا کون بے وقوف اُدھر جائے گا؟ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے آسمان اور آسمانوں میں عجیب وغریب مخلوقات بنادیں۔ زمینیں بنائیں اور اس میں خزانے سمودیے جو ختم ہونے میں نہیں آتے۔ اسے وہی چلا رہا ہے وہی بنا رہا ہے۔ ہم اس کا در چھوڑ کر اور کہاں جائیں جو خود مخلوق ہے ان کے پاس کیوں جائیں؟ مخلوق تو خود محتاج ہوتی ہے۔ ہم اس کے علاوہ کسی کو اپنی حاجات کے لیے نہیں پکاریں گے۔ صرف اس سے مانگیں گے اور خدانخواستہ اگر ہماری بدبختی آجائے اور ہم بھی اس کے علاوہ کسی اور کو پکاریں گے تو ہماری بات بھی جاہلانہ بات ہوگی۔ فضول بات ہوگی، بے جا بات ہوگی۔ یعنی ہم تو توحید پر قائم ہیں اور اسی کو پکارتے ہیں لیکن اللہ نہ کرے اگر ہم بھی گمراہ ہوجائیں تو اس کی شان میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ہماری بات بیہودہ ہوگی غلط ہوگی۔

فرمایا: هٰٓؤُلَآءِ قَوۡمُنَا اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً۔۔۔ یہ ہماری قوم کو دیکھو اللہ کو چھوڑ کر بتوں اور غیر اللہ کی پرستش اور پوجا میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ کا دین چھوڑ کر رسومات ورواجات میں لگ گئے ہیں۔ لَوۡلَا يَاۡتُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِسُلۡطٰنٍۢ بَيِّنٍ۔۔۔ یہ جو غیر اللہ کی پرستش ہے اس پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ اللہ کے علاوہ سب جو ہے وہ مخلوق ہے۔ مخلوق کو کیا حق حاصل ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں۔ وہ تو خود محتاج ہے، محتاج، محتاج کو کیا دے گا۔

یہاں آپ تھوڑا سا غور فرمائیں۔ ہم دنیا میں بھی جو زندگی بسر کرتے ہیں تو غریب آدمی کو بڑا آسرا ہوتا ہے کہ فلاں امیر سے میرا تعلق ہے میں اس کے پاس جاتا ہوں۔ حالانکہ غریب محتاج نہیں ہوتا، محتاج امیر ہوتا ہے۔ وہ غریبوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ آرہے ہیں میرا کوئی کام کردیں گے۔ غریب تو سارا کام خود کرلیتا ہے۔ امیر تو پانی پینے کا محتاج ہوتا ہے کہ کوئی مجھے پانی کا گلاس لاکر دے گا، کوئی میرے سامنے کھانا لگائے، کوئی میرے جوتے سیدھے کر دے۔ غریب کو کیا؟ وہ تو اس سے مستغنی ہے وہ تو اپنے سارے کام خود کرلیتا ہے۔ غریب سمجھتا ہے۔ محتاج میں ہوں درحقیقت محتاج امیر ہوتا ہے۔ دنیا کے سارے رشتے اسی بات پر ہیں کہ میرا اس میں کوئی فائدہ ہے۔ انہوں (اصحابِ کہف) نے کہا کہ فائدہ تو یہ ہے کہ بندہ اللہ کا ہوجائے ساری دنیا سے بے نیاز ہوجائے۔ اس ہماری قوم کو دیکھو کہ یہ مخلوق کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں۔ اس پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟

رسومات کو ثواب کہنا، اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے:

فرمایا: فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؁۱۵ یہ تو ایسا ہے کہ اللہ پر جھوٹ بولنے والی بات ہے اور اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا؟ اس پر علمائے کرام نے بڑا زور دیا ہے، مفسرین کرام نے اس آیۂ کریمہ پر بڑی بحث کی

ہے اور فرماتے ہیں کہ ان سب کا حاصل یہ ہے کہ جو رسومات و رواجات ہم اپنی طرف سے بنا لیتے ہیں یہ اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ ایک ہوتا ہے کافر ہو جانا، اللہ کا انکار کر دینا، غیر اللہ کی پوجا شروع کر دینا۔ یہ ایک بہت بڑا جرم ہے۔ ایک یہ ہے کہ ہم اپنی طرف سے عبادات بنا لیتے ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اللہ نے ان کے کرنے کا حکم نہیں دیا نہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے بارے میں بتایا اور نہ اُن کے کرنے کا حکم دیا، وہ کام کر کے ہم کہتے ہیں یہ بھی ثواب ہے۔ ایسا کرنا سب سے بڑا ظلم ہے چونکہ ثواب ہر وہ کام ہے جس کے کرنے کا حکم اللہ نے یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے دیا ہے۔ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت نہیں ہے تو انسانوں کی اپنی گھڑی ہوئی رسم ہے اور رسومات کو ثواب کہنا اللہ پر جھوٹ باندھنے والی بات ہے۔ یہ جرم کفر سے کم نہیں ہے۔ ہم زندگی بھر ایسا کرتے رہتے ہیں۔ اتنی رسومات بن گئیں ہیں، ہر کام میں اتنے جھوٹ جوڑ دیے گئے ہیں اور رسوم کو عبادت کا درجہ دے دیا گیا ہے تو یہ جائز نہیں ہے یہ درست نہیں ہے۔ عبادت یا ثواب کہنے سے پہلے یہ تلاش کرنا چاہیے کہ کیا یہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا حکم ہے؟ پھر تو ثواب ہے۔ اگر نہیں تو اس میں کوئی ثواب نہیں ہے اور اس سے بچنا چاہیے۔

اللہ کی نافرمانی کرنے سے دنیا کے دکھ اٹھا لینا بہتر ہے:

وَاِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاۡوٗۤا اِلَى الۡـكَهۡفِ يَنۡشُرۡ لَـكُمۡ رَبُّكُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِهٖ وَيُهَيِّئۡ لَـكُمۡ مِّنۡ اَمۡرِكُمۡ مِّرۡفَقًا ﴿۱۶﴾ انہوں نے کہا اب ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ ہم اس شہر، اس آبادی میں جہاں ساری قوم، پوری سلطنت و ریاست کفر و شرک پر متحد ہو گئی ہے یہاں رہ کر ہم دین پر قائم نہیں رہ سکتے۔

یہاں علماء فرماتے ہیں کہ جس ملک میں، جس شہر، جس ریاست میں آدمی دین پر عمل نہ کر سکے اور مشکل ہو یا ناممکن ہو جائے وہ ملک، وہ جگہ چھوڑ دینا چاہیے، وہاں چلا جائے جہاں پر اپنے دین پر عمل کر سکے۔ اب یہ جو نوجوان تھے انہوں نے سوچا کہ اگر ہمیں اس ملک میں رہنا ہے۔ انہی لوگوں کے ساتھ رہنا ہے۔ کھانا، پینا، لباس ضروریاتِ زندگی یہیں پوری کرنی ہیں۔ تو پھر ہم اللہ کی عبادت نہیں کر سکتے۔ اگر اللہ کی عبادت نہیں کر سکتے تو کہاں جائیں، کیا کریں؟ انہوں نے سوچا: فَاۡوٗۤا اِلَى الۡـكَهۡفِ ۔۔۔ فلاں پہاڑ میں بڑی غار ہے، چلو غار میں جاتے ہیں یعنی اللہ کی نافرمانی کرنے سے زندگی کے سارے وسائل چھوڑ کر غار میں چلا جانا بہتر ہے۔ وہاں غار میں کھانا کہاں سے آئے گا، بستر کون دے گا، پانی کہاں سے پئیں گے؟ اسبابِ زندگی کا تو کوئی سبب نہیں۔ وہاں نہ پانی ہے نہ کھانا نہ

بستر ہے۔ نہ کپڑا۔ غرض وہاں کوئی شئے میسر نہیں اُلٹا خطرہ ہے کہ پہاڑ کے دامن میں غار ہے جس میں سانپ، بچھو دیگر حشرات الارض ہوں گے، کاٹ کھائیں گے۔ وہاں زندگی کو خطرہ ہے، سیلن ہوگی، گرمی سردی کا کیا ہوگا لیکن انہوں نے فیصلہ کیا کہ اللہ کی نافرمانی کرنے سے مرجانا، دنیا کے دکھ اٹھالینا بہتر ہے۔ ہمارے لیے غار بہتر ہے۔ کم از کم وہاں ہمیں کوئی اللہ کی نافرمانی پر تو مجبور نہیں کرے گا۔ آگے کیا ہوگا؟ کھائیں کہاں سے، لباس کہاں سے آئے گا، آرام کہاں ملے گا؟ وہ سارا اللہ کے سپرد کردو۔ جس کے لیے ہم دنیا چھوڑ رہے ہیں۔

تم اللہ کے ہوجاؤ اللہ کی پوری کائنات تمہاری ہوجائے گی:

وَاِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ۔۔۔ فرمایا، جب تم نے ان لوگوں کو بھی چھوڑ دیا جو اللہ کے نافرمان تھے اور ان کے بتوں کو بھی چھوڑ دیا جن کو وہ معبود بنائے بیٹھے تھے۔ فَاْوٗۤا اِلَى الۡكَهۡفِ۔۔۔ تو غار میں آکر بیٹھ رہو۔ يَنۡشُرۡ لَـكُمۡ رَبُّكُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِهٖ۔۔۔۔۔ تمہارا پروردگار تم پر اپنی رحمتیں نچھاور کردے گا وَيُهَيِّئۡ لَـكُمۡ مِّنۡ اَمۡرِكُمۡ مِّرۡفَقًا ﴿۱۶﴾ وہ تمہارے کام میں کامیابی کے سامان درست فرمادے گا۔ فرمایا، تم غار میں چلے جاؤ اس لیے نہیں کہ ترکِ دنیا مقصود ہے بلکہ اس لیے کہ یہاں توحید پر رہنا ممکن نہیں رہا۔ تم توحید پر قائم رہنے کے لیے ساری دنیا چھوڑ رہے ہو تو میں تمہیں اپنی رحمت میں ڈھانپ لوں گا اور تمہارے سارے کام درست کردوں گا۔ کھانا پینا بھی مل جائے گا لباس ہر چیز، ہر ضرورت پوری ہوجائے گی۔ اصحابِ کہف کا یہ فیصلہ کہ ہم اللہ کی نافرمانی نہیں کریں خواہ اس کے لیے کچھ بھی چھوڑنا پڑے۔ یہ ایمان ہے۔ ہر بات پر ڈرتے رہنا کہ یہاں سے یہ نہ ہوجائے وہ نہ ہوجائے۔ دنیا کے کاموں سے ڈرنا کہ نقصان نہ ہوجائے اور دین کا نقصان برداشت کرلینا یہ ایمان نہیں ہے۔ ایمان یہ ہے کہ کچھ بھی ہوجائے دین پر قائم رہنا ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت کرنی ہے آگے کیا ہوگا؟ وہ اللہ بہتر کرے گا۔ نقصان کو تو چھوڑو ہمیں اُونگھ آجائے تو نماز نکل جاتی ہے کہ چھوڑو آرام کرتے ہیں، نماز پھر پڑھ لیں گے۔ یہ ایمان نہیں ہے۔ اس کی فکر اسی زندگی میں چاہیے اور ہر شخص کو کرنی چاہیے۔ عجیب بات ہے، ہم دوسروں کا ایمان ناپتے رہتے ہیں کہ فلاں کتنا نیک ہے اور کتنا نہیں۔ ہم نے دوسروں کا حساب دینا ہے یا اپنا دینا ہے؟ اپنے ایمان کو تولتے رہا کرو۔ یہ بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے۔ گناہ کرنے سے ایمان گھٹ جاتا ہے اور نیکی کرنے سے بڑھ جاتا ہے۔ اپنا محاسبہ روز کرو کہ ایمان بڑھ رہا ہے یا کم ہورہا ہے۔ دوسروں کو اللہ کے سپرد کرو۔ وہ جانیں اور ان کا مالک جانے۔ تم اللہ کی فرماں برداری پر قائم ہوجاؤ وہ تمہارے لیے اس کام میں کامیابی کا سامان فرمادے گا۔ تمہاری زندگی کے سارے اسباب مہیا کردے گا۔ تمہارے سارے کام

درست کر دے گا۔ اس پر بھروسہ کرو۔ اس کی نافرمانی کی طرف نہ جاؤ۔ دوسری طرف موت نظر آتی ہے تو وہ قبول کر لو۔ اس موت کو بھی اللہ چاہے تو زندگی کا سبب بنا دے گا۔

اللہ کریم فرماتے ہیں انہوں نے مجھ پر اس قدر بھروسہ کیا کہ زندگی کے سارے وسائل چھوڑ دیے۔ اس شرط پر کہ اللہ کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ اگر یہ لوگ ہمیں یہاں نہیں رہنے دیتے تو ہم غار میں چلے جاتے ہیں۔ فرمایا، پھر میں نے بھی ان پر یہ مہربانی کی کہ دیکھ لے اے مخاطب! وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ۔۔۔ کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو ان کی غار سے دامن بچا کے گزرتا ہے حالانکہ وہ غار کے درمیان جو کھلی جگہ تھی وہاں تھے۔ وہ غار چھوٹا موٹا نہیں بہت بڑا تھا درمیان میں کھلا میدان تھا۔ اس میدان میں لیٹے ہوئے بیٹھے ہوئے ٹھہرے ہوئے تھے۔ فرمایا، ہم نے سورج کو حکم دیا کہ تیری دھوپ انہیں پریشان نہ کرے۔ اپنا دامن بچا کر گزرنا وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ۔۔۔ دیکھ! سورج جب نکلتا ہے تو ان کے غار سے دامن بچاتا ہے، ان پر دھوپ نہیں پڑنے دیتا ذَاتَ الْيَمِينِ۔۔ دائیں سے ہو کر نکل جاتا ہے۔ سورج ان کی غار میں روشنی یا گرمی یا دھوپ نہیں پہنچاتا۔ وَإِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ۔۔۔ جب غروب کی طرف جاتا ہے تو بائیں جانب ہو جاتا ہے اور اپنا دامن سمیٹ لیتا ہے اور ان سے ایک طرف ہو کر گزر جاتا ہے۔ ہم نے ان کی خاطر سورج کو کہا کہ اپنی دھوپ اور اپنا دامن ان سے سمیٹ کے گزرنا۔ طلوع ہوتے ہوئے نہ پریشان کرنا نہ غروب ہوتے ہوئے۔ سارے دن میں کبھی تیری کرنیں انہیں پریشان نہ کریں۔ تو جس قادرِ مطلق نے سورج کو پابند کر دیا کہ ان کی نگہداشت کرو باقی چیزیں کیا ہیں! سورج تو کب سے طلوع و غروب ہو رہا ہے اور اپنے مقرر راستہ پر چلتا ہے اسے کسی کی پروا نہیں ہوتی کہ کون کہاں ہے کہاں نہیں۔ فرمایا ہم نے اسے بھی پابند کر دیا۔ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ۔۔۔ یہ اللہ کی قدرتِ کاملہ کی بہت بڑی نشانی ہے لیکن بات یہ ہے کہ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ۔۔ ہدایت اسی کو نصیب ہوتی ہے جسے اللہ چاہے۔

یہ سارے معجزات، یہ ساری نشانیاں دیکھ کر لوگ ایک ایک لقمے کے لیے اطاعتِ الٰہی چھوڑے بیٹھے ہیں۔ ہم سارا دن مزدوری کرتے ہیں دنیا کمانے کے لیے۔ گندم کاٹنی ہے، باجرہ بیجنا ہے فلاں فصل اٹھانی ہے یہ ہماری ضرورت ہے لیکن جو فصل ہم نے سارا سال محنت کر کے پانی لگا کے آبیاری کر کے، اس کی گوڈی کر کے تیار کی۔ ہمارے پاس کیا ضمانت ہے کہ ہم یہ کھائیں گے تو ہمیں یہ فائدہ دے گی، نقصان نہیں دے گی؟ ہو سکتا ہے اس کا کھانا ہماری موت کا سبب بن جائے۔ اتنی محنت کر کے ہم نے ایک چیز حاصل کی ہمارے پاس یہ گارنٹی نہیں کہ اسے کھائیں گے؟ کیا ڈاکٹر کسی غذا کھانے سے روک نہیں دیتے کہ نہ کھاؤ۔ حکیم منع کر دیتے ہیں۔

کیوں؟ تا کہ صحت بحال ہو جائے۔ اسی طرح اللہ کی نافرمانی مضر ہے۔ اگر ہم نے اللہ کی عبادت کو وقت نہیں دیا کہ فلاں دُنیوی کام ہو جائے، تو یہ کام ہمارے خلاف جا رہا ہے۔ ہم نے عظمتِ الٰہی کو چھوڑ دیا۔ عبادت کو چھوڑنا، ارکان کو چھوڑنا، نماز کو چھوڑنا، سجدے کو چھوڑنا ان کی اپنی قیمت نہیں ہے۔ ان کی قیمت تب بنتی ہے جب ان کو چھوڑنا اللہ کی نافرمانی بن جاتا ہے۔ اللہ کی نسبت سے جب دیکھیں تو کتنا گھاٹے کا سودا کیا۔ ہم نے اطاعتِ الٰہی کو چھوڑ دیا کہ فرصت نہیں ملی نماز کے لیے۔ آج فلاں مزدوری پہ تھا فلاں کام پہ تھا، آج جانوروں کو پالنا تھا، ان کو چارا دینا تھا، نماز کی فرصت نہیں ملی تو ہوسکتا ہے وہی جانور تجھے سینگ مارے اور تو مر جائے جس کے لیے تو نے اللہ کی اطاعت چھوڑی۔

فرمایا، جو اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور اس شرط پر نہیں کرتے کہ دنیا کا نقصان نہ ہو پھر کریں گے۔ دنیا کا نقصان ہو تو نہیں کریں گے۔ وہ دنیا کا نفع نقصان نہیں سوچتے۔ اللہ کے ساتھ جو تعلق ہے اس پر نظر رکھتے ہیں کہ اس میں خرابی نہ آئے۔ اللہ دنیا کی چیزوں کو اس کی خدمت پر لگا دیتے ہیں حتیٰ کہ سورج تک کو حکم دے دیتے ہیں کہ اس سے بچ کر گزرنا یعنی اسے پریشان نہ کرنا۔ واہ کیا بات ہے! فرمایا یہ اللہ کی بہت بڑی نشانیوں میں سے ہے۔ کوئی بندہ آ کر لیٹ جائے اور اللہ کریم سورج کو پابند کر دیں کہ اس کی نیند میں خلل نہ ڈالنا، اس پر دھوپ نہ ڈالنا، اس پر کرنیں نہ ڈالنا کہ اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں، دامن بچا کر گزرنا، اپنی کرنیں سمیٹ کر رکھنا۔ جب سورج کو ان کی اطاعت اور ان کی دیکھ بھال پر پابند کر دیا جاتا ہے تو پھر باقی چیزوں کو کیا ہے۔ پھر ہوا بھی انہیں تنگ نہیں کرے گی، بادل بھی انہیں پریشان نہیں کریں گے، کیڑے مکوڑے غرض دنیا کی کوئی چیز انہیں پریشان نہیں کرے گی۔

بندے کی کیا ہستی ہے وہ تو اپنی ذات میں ہر چیز کا محتاج ہے۔ پانی کے ایک گھونٹ کا، روٹی کے ایک لقمے کا، بدن کی سلامتی کا، صحت کا، غذا کا، دوا، لباس کا، ایک محتاج وفقیر کیا کرے گا؟ لیکن جب وہ اپنی اس احتیاج کی پروا نہ کرتے ہوئے اللہ کی اطاعت کا ارادہ کر لیتا ہے، کرتا کچھ بھی نہیں، ارادہ کر لیتا ہے کہ اللہ کی اطاعت ہر حال میں کروں گا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہر حال میں کروں گا خواہ کچھ ہو جائے۔ فرمایا، ہم نظامِ قدرت کو اس کے آرام پہ لگا دیتے ہیں کہ اسے دیکھ کر گزرنا، اسے سنبھال کر رکھنا یہ میرے نام پہ بیٹھا ہے۔ یہ تو بڑا سستا سودا ہے تو پھر سارے بندے کیوں نہیں کرتے؟ یہ تو بڑے مزے کی بات ہے کہ آپ اللہ کے ہو جائیں اور اللہ کا سارا نظام آپ کا ہو جائے، آپ کی دیکھ بھال پر لگ جائے۔ اس سے بڑی کیا بات ہے تو سارے بندے کیوں نہیں کرتے؟ فرمایا، بات یہ ہے کہ بندوں کی اللہ سے بگڑ گئی ہے یہ سودا وہی کرتا ہے جس کی اللہ سے بنی ہوئی ہے۔ یہ نہیں کہ لوگ نماز نہیں پڑھتے۔

بات یہ ہے کہ وہ پڑھنے نہیں دیتا۔ ان کی اس سے بگڑ گئی ہے، وہ کہتا ہے میرے دروازے پر سرمت رکھو۔ ایسا نہیں ہے کہ لوگ نیکی کرنا چاہتے ہیں اور وہ توفیق سلب کر لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کی اللہ سے بگڑ گئی ہے۔ وہ کہتا ہے، جب میری ذات کے ساتھ تمہاری نسبت نہیں ہے، احکامات کا کیا فائدہ! احکام تو بعد میں آتے ہیں پہلے تو ذات آتی ہے۔ میری ذات میں تم دوسروں کو شریک کر لیتے ہو، حاجات مانگنے دوسروں کے در پر جاتے ہو، دعائیں دوسروں سے مانگتے ہو دوستی کا دعویٰ میرے ساتھ کرتے ہو۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ میں واحد ہوں، لاشریک ہوں۔ میرے ساتھ تعلق ان حدود کے اندر ہوگا جو میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں بتادی ہیں۔ ان کے اندر رہتے ہوئے اگر تم میرے ہو جاؤ گے پھر یہ کائنات جو میری ہے پھر یہ تمہاری خادم ہے۔

محمود غزنوی رحمتہ اللہ علیہ، یہ آج کے دانشور تو مسلمان حکمرانوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اپنے (T.v Shows) ٹی وی شو میں کسی مسلمان حکمران کے ساتھ رحمتہ اللہ علیہ کہہ دیا جائے تو یہ بڑے ناراض ہوتے ہیں بڑا غصہ آتا ہے اور مزے کی بات ہے کہ کسی انگریز بادشاہ کا مذاق نہیں اڑاتے، کسی ہندو بادشاہ کا مذاق نہیں اڑاتے، کسی بھی کافر کا مذاق نہیں اڑاتے۔ آپ اپنے ٹی وی پر دیکھ لیں مسلمان بادشاہوں کا مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ ان میں ایسے ایسے نایاب لوگ ہوئے ہیں۔ انہیں میں سے سلطان محمود غزنویؒ ایک تھے۔ ایک غلام انہیں پسند تھا، پیارا تھا، ایاز نام تھا، اس کی بہت عزت ہوتی تھی۔ ان کو کہیں جنگل سے ملا تھا، ساتھ لے لیا، غلام بنالیا لیکن سب سے زیادہ اس کے ساتھ پیار کرتے تھے، اسے بڑی عزت دیتے تھے۔ ایک دن کسی سردار نے کہا کہ ہمارے باپ دادا آپ کے باپ دادا کی جانثاری میں جانیں دے گئے اور سبکتگین کے ساتھ مل کر فتوحات کرتے رہے اور جانیں لڑاتے رہے اور خون دیتے رہے۔ ہماری عمر آپ کی اطاعت میں گزر رہی ہے۔ ایک فتح کے بعد آتے ہیں تو دوسرے محاذ پر چل دیتے ہیں۔ تلوار ہے اور ہمارے سینے ہیں۔ گھوڑے ہیں اور ہم دوڑ رہے ہیں۔ اس سب کا صلہ یہ ہے کہ اس ایاز کی قدر ہم سے بھی زیادہ ہے۔ یہ غلام ہے نوجوان ہے، اس میں کیا رکھا ہے اس نے کیا کیا ہے؟ اس کا باپ دادا کا پتا نہیں یہ ہے کون؟ ہم سے زیادہ اس کی قدر ہے۔

اللہ جنہیں عظمتیں، رتبے دیتا ہے انہیں شعور بھی دیتا ہے۔ اس کی اپنی تقسیم ہے۔ بادشاہ نے بات تو سن لی جواب نہیں دیا۔ فتح کے بعد لوٹے، بادشاہ نے ایک بہت بڑے ہال میں مختلف چیزوں کے کتبے لگا دیے اور ایک جشن کا انتظام کیا۔ سارے سرداروں کو جمع کیا، کہیں اسلحہ تھا، کہیں گھوڑے، کہیں زمینیں جائیدادیں تھیں، کہیں دیہات تھے، کہیں دولت تھی، کہیں ہیرے، جواہرات تھے۔ تو حکم دیا جسے جو چیز پسند ہو اس پر ہاتھ رکھو وہ اسے عطا کی جائے گی۔ سب نے دیواروں کو دیکھا کسی کو گھوڑے پسند تھے تو اس نے اس کتبے پر ہاتھ رکھا کہ مجھے گھوڑے مل جائیں، کسی نے

جواہرات اور کسی نے سونے اور کسی نے چاندی، کسی نے دولت پر روپوں پر، کسی نے زمینوں اور جائیدادوں پر، ہر ایک نے جو چیز اسے پسند تھی اس پر ہاتھ رکھا۔ ایاز نے جا کر سلطان کے کندھے پر، ہاتھ رکھا اس وقت بادشاہ نے انہیں جواب دیا کہ دیکھو تم میرے جاں نثار ہو لیکن تمہیں میرے سوا بھی چیزیں پسند ہیں۔ تم صرف میرے جان نثار نہیں ہو تم میں سے کسی کو گھوڑے پسند ہیں، کسی کو دولت پسند ہے، کسی کو ہیرے جواہرات پسند ہیں۔ یہ واحد آدمی ہے جسے صرف میں پسند ہوں اور تم اس فلسفے کو نہیں سمجھ سکے کہ دولت لے لو تو بادشاہ کے خزانے میں تو کمی نہیں آئے گی۔ گھوڑے لے لو گے تو بادشاہ کے اصطبل میں تو کمی نہیں آئے گی لیکن اس نے ہاتھ بادشاہ پر رکھا ہے۔ اب جو کچھ بادشاہ کا ہے وہ اس کا ہے۔ جب بادشاہ اس کا ہے جو کچھ بادشاہ کا ہے اس کا ہے۔ تم نے تو ایک ایک چیز لی اس نے تو ساری سلطنت لے لی۔ بادشاہ ہی اس کا ہے تو پھر بادشاہ کی سلطنت بھی اس کی ہے۔

بات یہ ہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں جو میرا ہو جاتا ہے میری کائنات اس کی ہے۔ میں اس کی خدمت پر لگا دیتا ہوں لیکن یہ سارے لوگ کیوں سودا نہیں کرتے؟ فرمایا اس لیے کہ ان کی مجھ سے بگڑ چکی ہے، یہ مجھے پہچان ہی نہیں پائے، یہ مجھے وہ مرتبہ دینے کو تیار ہی نہیں جو مقام میرا ہے۔ کہتے تو ہیں کہ ہمارا اللہ ہے۔ کہتے تو کافر بھی تھے۔ اللہ کو زبانی تو کافر بھی مانتے تھے لیکن انبیاء علیہ السلام کو کہتے تھے یہ نبی نہیں ہے۔ یہ اللہ پر جھوٹ بول رہے ہیں۔ یعنی نبیؑ کی نبوت کا انکار کرنے کے باوجود اپنے خیال میں یہ اللہ کو مان رہے ہوتے تھے۔ قرآن میں جگہ جگہ آیا ہے کہ دیکھو یہ کہتا ہے مرنے کے بعد زندہ ہو جاؤں گا۔ یہ اللہ پر جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے اللہ کو جانتے تو تھے کہ اللہ ہے لیکن جیسا وہ ہے ویسا مانتے نہیں تھے۔ جیسا وہ ہے ویسا اس پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ اللہ کریم کو ماننے کی بھی ایک شرط ہے۔ ویسا مانو جیسا اللہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم منواتا ہے۔ خالی نام لینے سے بات نہیں بنتی۔ فرمایا ہدایت دینا تو میرا کام ہے۔ اور بنیادوں سے ان کی میرے ساتھ بنی ہی نہیں۔ مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِ۔۔۔ جسے اللہ ہدایت دے وہ ہدایت پر ہے۔ سودا تو بڑا ہے کہ تم اللہ کے ہو جاؤ اللہ کی پوری کائنات تمہاری ہو جائے گی لیکن کرے گا وہ جس کی میرے ساتھ بنتی ہو۔ ان کی میرے ساتھ بنی ہی نہیں۔ جب ان کی نہیں بنی تو میں نے ان پر ہدایت کے دروازے بند کر دیے یعنی سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں کوئی گمراہی پر مطمئن ہو جائے اور ہدایت کی فکر نہ کرے۔ آخرت کے سارے عذاب اس پر مرتب ہوتے ہیں کہ کوئی کتنا بے نیاز تھا عظمتِ الٰہی سے وَمَنۡ يُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرۡشِدًا ﴿۱۷﴾ اور جس کی اللہ کے ساتھ بگڑ جائے اللہ ناراض ہو جائے تو سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ وہ اسے گمراہ کر دیتا ہے۔ اس سے ہدایت کی توفیق سلب ہو جاتی ہے جو گمراہ ہو گیا اور جسے اللہ نے کر دیا پھر اس کے لیے نہ

کوئی ولی ہے نہ مرشد ہے۔ ولی ہوتا ہے، دوست، معاون، مددگار، مرشد ہوتا ہے راہنما، راستہ دکھانے والا۔ مرشد کا کام ہے راہِ ہدایت کی راہنمائی کرنا۔ نیکی کی طرف لے کے جانا، برائی سے بچانا۔ یہ بچے دینا، اولاد، مال ودولت دینا یہ مرشد کا کام نہیں۔ مرشد خود انسان ہوتے ہیں، اللہ کے محتاج ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کا کام ہے۔ مرشد ارشاد سے بنا ہے۔ ارشاد کا معنی ہے تلقین کرنا، تبلیغ کرنا، سمجھانا، بتانا، مرشد کا کام یہ ہے کہ اس کے ساتھ رہ کر آپ کو ہدایت نصیب ہو۔ دیکھنا چاہیے کہ اُس مجلس میں رہو جس میں نیکی نصیب ہو اور برائی سے نفرت ہو اور اگر یہ نہ ہو تو پھر اس کو مرشد بنانے کی ضرورت نہیں ہے تو دنیا کے باقی کام جو اللہ کو نہیں مانتے، اللہ ان کے بھی کر رہا ہے جو نبیوں کو نہیں مانتے، ان کی بھی اولاد ہو رہی ہے، ان کے کاروبار چل رہے ہیں، حکومتیں کر رہے ہیں، بادشاہتیں کر رہے ہیں۔ یہ دنیا کا نظام چلتا رہے گا۔ آخرت میں جا کر پتا چلے گا کہ کون فائدے میں رہا اور کون نقصان میں۔ فرمایا، جس کی اللہ سے بگڑ جائے تو پھر کون ہے جو اس کی راہنمائی کرے؟ اس کے لیے نہ کوئی مرشد ہے نہ راہنما نہ ولی نہ کوئی دوست نہ مددگار۔ لہٰذا بنیادی بات یہ ہے کہ جب اللہ سے بات بن جائے تو وہ مرشد بھی عطا کرتا ہے۔ جب اللہ سے بات بن جائے تو وہ نعمتیں بھی عطا کرتا ہے جب اللہ سے بات بن جائے تو وہ اسباب بھی عطا کرتا ہے۔ فرمایا! جب میرے لیے میری اطاعت کے لیے، مجھ پر ایمان قائم رکھنے سے یہ مجبور ہو گئے۔ زندہ انسانوں میں رہنا ان کے لیے مشکل، ناممکن ہو گیا۔ سب لوگ انہیں کفر پر مجبور کریں گے یہ کفر کرنا نہیں چاہتے لہٰذا انہوں نے آبادیاں، محلات، حکمران، دوست احباب، والدین مال ودولت سب چھوڑ کر ایک غار میں پناہ لی تو ہم نے سارے اسبابِ قدرت ان کی خدمت پر لگا دیے حتیٰ کہ سورج تک کو پابند کر دیا کہ ان سے بچ کر گزرنا کہ تیری دھوپ انہیں پریشان نہ کرے اور یہ بہت بڑی نشانی ہے عظمتِ الٰہی کی اور اس کے کرم کی، اور اس کی مہربانی کی کہ بندہ اپنی طرف سے جو کرتا وہ بندے کی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے لیکن جو انعام وہ دیتا ہے اس کی شان کے مطابق ہوتے ہیں۔

سورۃ الکھف رکوع 3 آیات 18 تا 22

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ
الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۚ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ
لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝١٨ وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ
لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۚ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۚ قَالُوْا لَبِثْنَا
يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۚ فَابْعَثُوْٓا
اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا
فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝١٩ اِنَّهُمْ اِنْ
يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا
اَبَدًا ۝٢٠ وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ
السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا
عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۚ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۚ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ
لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ۝٢١ سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ
وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ
وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۖ
فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۖ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ۝٢٢

اور (اے مخاطب!) تم ان کو جاگتا ہوا سمجھتے ہو حالانکہ وہ سوتے تھے اور ہم ان کو (کبھی) داہنی اور (کبھی) بائیں طرف کروٹیں بدلاتے تھے اور ان کا کتا چوکھٹ پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔ اگر (اے مخاطب!) تو ان کو جھانک کر دیکھتا تو ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑا ہوتا اور تیرے اندر ان کی دہشت سما جاتی ﴿۱۸﴾ اور اسی طرح ہم نے ان کو جگا دیا تاکہ آپس میں ایک دوسرے سے دریافت کریں ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ تم یہاں کتنی مدت رہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم ایک دن یا ایک دن سے بھی کچھ کم دیر رہے انہوں (دوسروں) نے کہا یہ تو تمہارا پروردگار ہی جانتا ہے کہ تم کتنا عرصہ رہے تو اپنے میں سے کسی کو یہ روپیہ دے کر شہر کی طرف بھیجو پھر وہ دیکھے کہ پاکیزہ کھانا کون سا ہے سو اس میں سے تمہارے پاس کچھ کھانا لے آئے اور آہستہ آہستہ (احتیاط کے ساتھ) آجائے کہ کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے ﴿۱۹﴾ اگر ان لوگوں کا تم پر بس چل گیا (تمہاری خبر ہوگئی) تو یقیناً تم کو سنگسار کر دیں گے یا پھر اپنے مذہب میں داخل کر لیں گے تو ایسے میں تم ہرگز کبھی فلاح (کامیابی) نہ پاؤ گے ﴿۲۰﴾ اور اس طرح ہم نے ان (لوگوں) کو ان (کے حال) سے باخبر کر دیا تاکہ وہ جانیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت میں کوئی شک نہیں اس وقت (اس زمانہ کے) لوگ ان کے معاملے میں آپس میں باہم جھگڑ رہے تھے سو ان لوگوں نے کہا کہ ان لوگوں (کے غار) پر کوئی عمارت بنا دو۔ ان کا پروردگار ان کے حال سے خوب واقف ہے جو لوگ ان کے معاملے میں غلبہ رکھتے تھے کہنے لگے ہم ضرور ان (کے غار) پر مسجد بنائیں گے ﴿۲۱﴾ اب وہ (لوگ) کہیں گے وہ تین ہیں چوتھا ان کا کتا ہے اور وہ (بعض) کہیں گے وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے، بے تحقیق بات کر رہے ہیں۔ اور کہیں گے وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔ آپ فرما دیجیے میرے پروردگار ان کا شمار خوب (صحیح صحیح) جانتے ہیں ان (کے شمار) کو بہت تھوڑے لوگ جانتے ہیں سو آپ

ان کے بارے میں سوائے سرسری بات کے زیادہ بحث نہ کیجیے اور آپ ان کے بارے ان لوگوں میں سے کسی سے نہ پوچھیے ﴿۲۲﴾

تفسیر و معارف

فرمایا: وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ۔۔۔ اصحاب کہف کی بات چل رہی ہے کہ اللہ نے انہیں تین صدیوں تک سلائے رکھا۔ ان کی نیند میں بھی بہت سی خرقِ عادات باتیں یعنی کرامات تھیں۔ فرمایا، اے مخاطب! ان کی نیند کی حالت ایسی عجیب تھی کہ دیکھنے والا یوں سمجھتا گویا یہ جاگ رہے ہوں۔ جیسے آدمی آرام کے لیے لیٹا، ستا رہا ہوتا ہے جبکہ وہ اتنی گہری نیند میں تھے کہ تین سو نو سال سوتے رہے۔ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ۔۔۔ اور ہم انہیں کبھی دائیں طرف اور کبھی بائیں طرف کروٹ بدلواتے تھے۔ عموماً نیند میں اتنا ہوش باقی رہتا ہے کہ ایک پہلو تھک جائے تو انسان سوتے ہوئے دوسرا پہلو بدل لیتا ہے۔ فرمایا، چونکہ وہ میرے لیے نکلے تھے تو میں نے انہیں اتنی تکلیف بھی نہیں دی کہ وہ خود پہلو بدلیں۔ ہم بدلواتے رہے۔

ایمان کی حقیقت:

ایمان کی حقیقت بھی یہی ہے کہ آدمی کی حرکت وسکون احکامِ الٰہی کے تابع ہو جائیں۔ انہیں تو ایمان کی حقیقت منجانب اللہ نصیب ہو گئی کیونکہ انہوں نے اپنا سارا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔ زندگی اور موت کے تمام امور اللہ کے سپرد کر کے غار میں چلے گئے تو اللہ کریم نے ان کی ہر ضرورت کا اہتمام اپنی قدرتِ کاملہ سے کر دیا۔

عجیب بات ہے تین صدیاں وہ سوتے رہے۔ زندگی کے سارے لوازمات وہیں ٹھہر گئے جیسے زمانہ ٹھہر گیا ہو۔ سوتے میں بھی وہ ایسے محسوس ہوتے تھے گویا جاگ رہے ہوں اور محض ستا رہے ہوں۔ ان کے اخلاص کو اللہ کریم نے ایسا شرفِ قبولیت بخشا کہ ان کے پہلو بدلنے کا جو اہتمام فرمایا اسے اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا۔

یہی وہ مقام ہے جس کے بارے حدیث قدسی ہے عنہ صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُوْلُ: مَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ، فَأَكُونَ أَنَا سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، ولسانَهُ الَّذِي يَنْطِقُ بِهِ، و قلبَهُ الَّذی يَعقِلُ بِهِ، فَإِذَا دَعَا أَجَبْتُهُ وإذا سَأَلَني اَعْطَيْتُهُ۔۔۔ (رواہ البخاری) اس حدیثِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مفہوم یہی ہے کہ جو لوگ میرے ہو جاتے ہیں، میں ان کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں، ان کی آنکھیں بن جاتا ہوں یعنی انہیں میرا اتنا قرب نصیب ہو جاتا ہے کہ

اللہ کے احکام کے خلاف کچھ کرنے کا وہ سوچتے بھی نہیں نہ ان کے ہاتھ پاؤں اللہ کی نافرمانی کے کاموں میں حرکت کرتے ہیں۔ وہ اطاعتِ الٰہی میں ہی سارے کام کرتے ہیں۔

نیکوں کا ساتھ ہمیشہ فائدہ دیتا ہے:

فرمایا: وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ۔۔۔ فرمایا، ہم نے تو ان کا اتنا لحاظ کیا کہ ان کے کتے پر بھی یہ کرم فرمایا کہ وہ بھی صدیوں سلامت رہا، مزے سے پاؤں پھیلائے غار کے منہ پر بیٹھا رہا۔ اس کا وجود بھی سلامت رہا اور اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ یہاں، علمائے کرام لکھتے ہیں کہ نیک لوگوں کا ساتھ ایک کتے کو بھی اتنا تحفظ دے گیا تو بندۂ مومن کا تو اپنا مقام ہے، بندۂ مومن اگر ولی اللہ کا دامن تھام لے تو وہ کتنا کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ نیکوں کا ساتھ ہمیشہ فائدہ دیتا ہے۔

اللہ والوں کی کرامات:

فرمایا: لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾ اے مخاطب! اگر انہیں جھانک کر غار میں دیکھ لیتا تو پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ اصحاب کہف کی کرامات میں سے ایک کرامت کا ذکر ہو رہا ہے۔ چونکہ غار شہر سے قریب ہی تھا تو اگر کفار میں سے کوئی انہیں تلاش کرتے وہاں آ جاتا اور جھانک کر دیکھ لیتا تو ان کے رعب سے ڈر کر بھاگ جاتا۔ ان کی دہشت سما جاتی، اُن کے رعب سے لرزنے لگتا اور ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتا۔ کرامات اولیاء احقاقِ حق کے لیے ہوتی ہیں، حق کو ثابت کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ کرامت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزے کی فرع ہوتی ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معجزہ اللہ کا فعل ہوتا ہے اور نبیؑ کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے۔ نبی کا معجزہ کسی فرد کی بڑائی کو منوانے کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی عظمت کو منوانے کے لیے ہوتا ہے۔ باطل کے مقابلے میں حق کو ثابت کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اسی طرح ولی کی کرامت احقاقِ حق کے لیے، حق کو ثابت کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ ولی چونکہ نبیؑ کا متبع ہوتا ہے، خلوصِ دل سے اتباع کرتا ہے تو اسے یہ شرف حاصل ہوتا ہے کہ نبیؑ کا معجزہ ولی کے ہاتھ پر اس کی حیثیت کے مطابق ظاہر ہوتا ہے جو کرامت کہلاتا ہے۔ ولی کی کرامت دراصل اس نبی کا معجزہ ہوتا ہے جس نبی کا وہ ولی پیروکار ہوتا ہے اور ولی کی کرامت بھی باطل کے مقابلے میں حق کو ثابت کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

اب تو معاملہ ہی الٹ گیا ہے۔ پتا نہیں کن کن شعبدوں کو کرامت سمجھا جاتا ہے اور کیسے کیسے لوگوں کو روحانی پیشوا قرار دیا جاتا ہے۔

اصحابِ کہف کی کرامت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اصحابِ کہف نے جب غار میں پناہ لی تھی اس وقت

ملک پر ایک مشرک حکمران دقیانوس کی حکومت تھی جو لوگوں کو شرک پر مجبور کرتا تھا۔ اسی کی وجہ سے وہ غار میں چلے گئے تھے جہاں اللہ کریم نے انہیں صدیوں سلائے رکھا۔ صدیوں بعد جاگے تو اس وقت کا حکمران مسلمان تھا۔ تب دینِ عیسوی کا زمانہ تھا اور وہ بادشاہ دینِ عیسوی پر تھا۔ نیک حکمران تھا لیکن اس کی قوم میں ایک فتنہ رونما ہو چکا تھا کہ لوگ آخرت کی زندگی، دوبارہ جی اٹھنے کا انکار کرنے لگے تھے۔ ایک ایسا فرقہ بن چکا تھا اور لوگوں میں تفرقہ پیدا ہو گیا تھا۔ مفسرینِ کرام لکھتے ہیں کہ وہ بادشاہ دعا مانگا کرتا تھا کہ بارالہا! میں اپنی ساری کوششیں کر چکا ہوں یہ فتنہ فرو نہیں ہو رہا، تو کوئی معجزہ ظاہر فرما کہ یہ فتنہ فرو ہو جائے تو اللہ کریم نے غار والوں کو جگا دیا جس کا انتظام اللہ نے تین سو سال پہلے کر رکھا تھا۔

فرمایا: وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ ۔۔۔ ہم نے انہیں جگا دیا۔ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ تاکہ وہ آپس میں دریافت کریں کہ ہمیں سوئے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۔۔۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا، ہمیں غار میں آئے ہوئے، یہاں پڑے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہوگی؟ قَالُوْا! ۔۔۔ دوسرے کہنے لگے: لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۔۔۔ دن بھر گزر گیا ہوگا یا دن کا کچھ حصہ۔ ابھی آ کر لیٹے تھے کچھ دیر کو آنکھ لگ گئی، دن کا کچھ حصہ ہی گزر گیا ہوگا۔

غیر ضروری بحث سے اجتناب:

قَالُوْا! کہنے لگے: رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۔۔۔ چھوڑو اس جھگڑے کو۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے جتنی بھی دیر گزری ہے، اللہ ہی جانتا ہے۔ تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے یہاں ایک بڑی نصیحت آموز بات ہے کہ بات مقصد کی کرنی چاہیے۔ غیر ضروری بحث میں نہیں پڑنا چاہیے جیسا کہ ان میں سے ایک نے کہا کہ ہم غار میں آئے، سو گئے، اب جاگ گئے ہیں، بھوک لگ گئی ہے۔ غیر ضروری بحث کو چھوڑو، مقصد کی بات کرو۔

فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ ۔۔۔ یہ چند سکے دے کر کسی کو بازار بھیجو۔ یہ بھی ان کی کرامت تھی کہ صدیوں سوتے رہے نہ بھوک نے تنگ کیا نہ پیاس نے ستایا جب جاگے تو زندگی کے سارے لوازمات واپس آ گئے۔ یہاں علمائے حق فرماتے ہیں کہ اپنی ضرورت کا سرمایہ رکھنا توکل کے منافی نہیں۔ جائز اسباب اختیار کرنا بجائے خود اطاعت اور عبادت ہے۔ بندہ سارے اسباب ہی چھوڑ دے اور کہے یہ توکل ہے تو یہ توکل نہیں۔ اللہ پر توکل کر کے غار میں گئے لیکن کچھ سرمایہ ساتھ لے گئے۔ جب آنکھ کھلی تو کہا کہ یہ پیسے کسی کو دیں کہ وہ بازار سے کھانا لے آئے۔

غذائے صالح کی شرائط:

جب سکے دے کر کھانا لینے بازار بھیجا تو تاکید کی: فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ ۔۔۔ کہ تلاش کرے کہ پاکیزہ کھانا کہاں ہے۔ چونکہ وہ تو یہی سمجھے ہوئے تھے کہ انہیں سوئے ہوئے دن کا کچھ حصہ ہی گزرا ہے اوران کی قوم بے دین ہے جنہیں حلال، حرام کی پروا نہیں، پاکی ناپاکی کا اہتمام نہیں اس لیے تاکید کی کہ پاکیزہ کھانا تلاش کر کے لائے۔

'اَزْكٰى' میں شرط ہے کہ حلال بھی ہو اور پاک بھی۔ بندہ مومن کو غذا میں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ وہ حلال بھی ہو اور پاکیزہ بھی۔ جسم کی نشوونما میں غذا کا بہت عمل دخل ہے۔ غذا سے جو خون بنتا ہے وہ پورے وجود میں گردش کرتا ہے۔ اگر کھانا حرام ہوگا تو وجود کے ہر عضو میں حرام کا اثر سرایت کرے گا۔ اگر ناپاک ہوگا تو ناپاکی کا اثر سرایت کرے گا۔ جن اعضاء میں ناپاکی کے اثرات داخل ہوں گے انہیں نیکی کی توفیق کیسے ہوگی؟ ایسے شخص کا ایمان کمزور ہوگا۔ ایمان کمزور ہوگا تو کردار کمزور ہوگا یوں انسان ضائع ہو جائے گا۔ آج کے ماحول میں جو آوارگی نظر آتی ہے اس کا بہت بڑا سبب حرام اور ناپاک کھانے ہیں جو مختلف ناموں سے بازار میں بکتے ہیں۔

انہوں نے صالح غذا کی تاکید کر کے بھیجا اور مشترکہ مال میں سے کھانا حاصل کرنے کے لیے سکے دیے۔ یہاں علماء فرماتے ہیں کہ اگر مال مشترکہ ہو تو یہ جائز ہے کہ اسے کسی ایک کے سپرد کیا جائے۔ سب اسے خوشی سے اجازت دیں کہ وہ سب کی بھلائی پر خرچ کرے۔ آپس کی رضامندی سے مل کر کھانے میں، مال میں بھی رضامندی سے شراکت جائز ہے۔ رضامندی سے ہو زبردستی نہیں۔ فرمایا: وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾ جو کھانا لینے جائے وہ آرام سے، آہستہ آہستہ بڑی احتیاط کے ساتھ، دیکھ بھال کر جائے اور کھانا لے کر واپس آ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ قوم کے لوگ پہچان لیں اور تمہیں پکڑ کر لے جائیں۔ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾ اگر انہیں تمہارا پتا چل گیا اور تمہیں پکڑ لیا تو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے یا واپس جبراً اپنے مذہب میں داخل کر لیں گے۔ ہمارے لیے خطرات ہی خطرات ہیں۔ یا تو ہمیں ایذا دے کر قتل کر دیں گے یا بے دینی پر مجبور کریں گے اور اگر ہم ان کے مذہب پر واپس چلے گئے تو ہم ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائیں گے لہٰذا بڑی احتیاط سے بچ بچا کر جانا گویا یہ بھی توکل نہیں ہے کہ آدمی محض مرنے کے لیے نکل پڑے۔ جان اللہ کی امانت ہے، اس کا تحفظ کرنا اور احتیاط کرنا دین کے مطابق ہے اور توکل کے منافی نہیں۔ فرمایا: وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ

وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۔۔۔ فرمایا، ہم نے اصحابِ کہف کو ایک طویل نیند سلانے اور دوسرے بادشاہ کے عہد میں جگا کر ظاہر کر دینے کا انتظام اس لیے کیا تھا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ جس ربّ نے اپنے بندوں کو صدیوں سلا دیا اور سلا کر اٹھا دیا وہ بندوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ اللہ نے لوگوں کو ان کے حال سے باخبر کر دیا تا کہ سب جان لیں کہ قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ اس طرح اس زمانے کا یہ فتنہ ختم ہو گیا۔ سب لوگ تائب ہو گئے، اللہ کی قدرت وعظمت کو تسلیم کر لیا۔

اس کا سبب اصحابِ کہف بنے جب انہوں نے وہ سکّہ دکان پر کھانا خریدنے کے لیے دیا دکاندار نے دیکھا کہ سکّہ تو تین سو سال پرانا تھا۔ اس نے دوسرے دکانداروں کو بتایا۔ اصحابِ کہف کے غائب ہو جانے کا قصہ تو مشہور تھا، لوگوں کو یاد بھی تھا۔ یہ خبر لوگوں میں پھیل گئی اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اللہ کی قدرت دیکھ لی۔ ملک میں جو مناظرے اور جھگڑے ہو رہے تھے کہ مرنے کے بعد کیسے زندہ ہوں گے، عذاب وثوابِ قبر کیا ہے؟ ان سب فتنوں کا منہ بند ہو گیا۔ لوگوں کو ہدایت نصیب ہوئی۔

اس کے بعد اصحابِ کہف غار میں واپس چلے گئے۔ اللہ کریم نے اُن پر موت وارد کر دی، وہ وفات پا گئے۔ حق کے لیے پہلے بھی غار میں گئے تھے، ان کا سلا دیا جانا اور جگا کر ظاہر کیا جانا بھی احقاقِ حق کے لیے تھا تو اللہ کریم نے ہی انہیں سنبھالا۔ نہ کسی نے جنازہ پڑھا نہ دفن کیا، نہ غار میں گھس کر قبر بنائی کہ اللہ جانے اور اللہ کے مقرب بندے جانیں۔ لوگ جمع ہو گئے کہ ان نیک لوگوں کی جائے وفات پر کوئی یادگار بنا دیتے ہیں۔ اس پر قوم میں بحث ہوئی کہ مینار بنا دیا جائے یا کوئی اور عمارت بطورِ یادگار بنا دی جائے۔ فرمایا: اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۔۔۔ قوم میں اس بات پر بڑی بحث ہوئی کہ ان کی یادگار کیسی ہو۔ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۔۔۔ کہنے لگے، ان کا پروردگار جانے جس نے انہیں تین صدیاں سنبھال کر رکھا وہی ان کے کفن دفن کا انتظام بھی کر دے گا۔ ہم اس میں مداخلت نہیں کرتے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور اس غار پر کوئی عمارت بنا دو جو یادگار رہے اور لوگ زیارت کے لیے آئیں۔ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿٢١﴾ ان میں سے جو معاملہ فہم، بااثر اور غلبہ رکھنے والے لوگ تھے انہوں نے کہا یہاں فالتو عمارت بنانے کی ضرورت نہیں، یہاں مسجد بناؤ جو آئے اللہ کی عبادت کرے، کتابِ الٰہی کی تلاوت کرے، اللہ کا ذکر کرے۔ اللہ کی نشانیوں کو بھی دیکھے اور اللہ کی عبادت بھی کرے چنانچہ انہوں نے غار کے منہ پر ایک مسجد بنا دی۔

ایک شرعی مسئلہ:

اس آیت کے ضمن میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اہل اللہ کی قبور پر مساجد بنانا منع نہیں ہے۔

کسی ولی اللہ کی قبر کے ساتھ مسجد بنا دی جائے تو اچھی بات ہے کہ لوگ مسجد میں بیٹھیں، اللہ کی عبادت کریں، اللہ سے دعا مانگیں۔ قبروں کو سجدے کرنا، قبروں سے مانگنا شرک ہے اور مسجد بنا کر مسجد میں عبادت کرنا باعثِ ثواب ہے۔

زائد از ضرورت بحث کی ممانعت:

فرمایا: سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ ---

فرمایا، اب یہ لوگ کہیں گے، وہ تو تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا جو ساتھ تھا۔ بعض دوسرے کہیں گے وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا، وہ سات تھے آٹھواں ان کا کتا تھا۔ یہ غیر ضروری بحث ہے۔ وہ پانچ تھے یا سات اس پر بحث کی کیا ضرورت ہے؟ جس مقصد کے لیے اللہ نے انہیں قبول فرمایا، احقاقِ حق کے لیے اور دینِ حق کے ثبات کے لیے انہیں سلائے رکھا اور جب قوم میں آخرت میں جی اٹھنے پر فتنہ رونما ہوا تو انہیں جگا دیا اور فتنہ فرو ہو گیا۔ لوگوں کو قیامت پر یقین آ گیا تو مقصد کی بات کریں ان کی تعداد پر بات کرنا غیر ضروری ہے۔

فرمایا: قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ---فرما دیجیے، ان کا پروردگار ان کی تعداد سے واقف ہے یا وہ چند لوگ جنہیں اللہ بتا دے۔ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۖ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿٢٢﴾ اور ان کے بارے سوائے سرسری بات کے زیادہ بحث نہیں کرنی چاہیے۔ مقصد یہ تھا کہ حق ثابت کیا جائے کہ قیامت قائم ہو گی، اللہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔ اللہ زندوں کو بھی صدیوں سلا کر اٹھانے پر قادر ہے۔ تمہارے نزدیک تو یہ مشکل ہے لیکن اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس مقصد کے لیے اللہ نے انہیں نیند دی، پھر اٹھایا، وہ مقصد پورا ہو گیا۔ اس کا مطلب ہے اللہ کریم صدیوں پہلے انتظام فرما دیتے ہیں جبکہ ضرورت صدیوں بعد ظاہر ہوتی ہے۔ یہ اس کا اپنا نظام ہے۔

چونکہ حق کو ثابت کرنے کے لیے اللہ کریم نے انہیں بطورِ کرامت زندہ رکھا، جگایا، وہ اپنا کام کر گئے اور حق ثابت ہو گیا تو اللہ نے انہیں اپنی آغوشِ رحمت میں لے لیا، بات ختم ہو گئی اب اس پر بحث کی کیا ضرورت تھی۔ جو بات ظاہر ہے وہی کافی ہے۔ اس کے بارے لوگوں سے سوال نہ کیے جائیں کہ ہر بندہ اپنی رائے ظاہر کرے گا تو بات الجھتی چلی جائے گی۔ ایسے معاملات میں وہ بات کرنی چاہیے جس سے کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہو۔ زائد از ضرورت بحث میں نہ الجھا جائے اس کا فائدہ نہیں ہوتا۔

سورۃ الکھف رکوع 4 آیات 23 تا 31

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۚ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿٢٤﴾ وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿٢٥﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ۫ وَّلَا يُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٦﴾ وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿٢٧﴾ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿٢٨﴾ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِی الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٢٩﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿٣٠﴾ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِئِيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٣١﴾ۚ

اور آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجیے کہ میں اس کو کل کر دوں گا مگر اللہ کے چاہنے
کو ملا لیجیے ﴿۲۳﴾ (ان شاء اللہ کہہ لیجیے) اور جب آپ بھول جائیں تو اپنے
پروردگار کا ذکر کیجیے اور کہہ دیجیے کہ مجھے امید ہے کہ میرا پروردگار مجھے (دلیلِ نبوت
کے طور پر) اس سے بھی زیادہ نزدیک تر، ہدایت کی بات بتلا دے ﴿۲۴﴾ اور وہ
لوگ اپنے غار میں (حالت نیند میں) تین سو (۳۰۰) برس تک رہے اور نو (۹) برس
اوپر اور رہے (کل تین سو نو (۳۰۹) برس رہے) ﴿۲۵﴾ فرما دیجیے کہ جتنی مدت
رہے اسے اللہ ہی خوب جانتا ہے اسی کے لیے ہیں آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں
وہ کیا خوب دیکھنے والا اور کیا خوب سننے والا ہے اُس کے سوا ان کا کوئی کارساز نہیں
اور نہ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک فرماتا ہے ﴿۲۶﴾ اور اپنے پروردگار کی کتاب جو
آپ کے پاس وحی کے ذریعے بھیجی جاتی ہے (لوگوں کے سامنے) پڑھتے رہا کیجیے
اس کی باتوں (وعدوں) کو کوئی بدل نہیں سکتا اور آپ اُس کے علاوہ کوئی جائے پناہ
ہرگز نہ پائیں گے ﴿۲۷﴾ اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھیے جو صبح و
شام (یعنی علی الدوام) اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اس کی خوشنودی کے طالب
ہیں اور دنیا کی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی توجہ ان سے ہٹنے نہ پائے اور
ایسے شخص کا کہنا نہ مانیے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ
اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا ہے ﴿۲۸﴾ اور فرما
دیجیے کہ (یہ دین) حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے سو جس کا جی چاہے پس
وہ ایمان لے آئے اور جو کوئی چاہے پس وہ کافر رہے یقیناً ہم نے ظالموں کے لیے
آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو گھیرے ہوں گی اور اگر (پیاس سے) فریاد
کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی فریاد رسی کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کی
طرح (گرم) ہوگا مونہوں کو بھون ڈالے گا کیا ہی بُرا پانی ہوگا اور کیا ہی بُری جگہ
ہوگی ﴿۲۹﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے تو یقیناً ہم نیک
کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتے ﴿۳۰﴾ ایسے ہی لوگوں کے لیے ہمیشہ

رہنے کے باغ ہیں جن کے تابع نہریں بہتی ہیں ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور وہ باریک اور دبیز سبز ریشم کے کپڑے پہنیں گے وہاں مسہریوں پر تکیہ لگائے ہوں گے کیا ہی خوب صلہ ہے اور کیا ہی خوب جگہ ہے ﴿۳۱﴾

تفسیر و معارف

امت کے لیے تعلیم:

ہمیشہ سے انبیاء علیہم السلام ہی امتوں کی تربیت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے تو تمام انسانوں کی تربیت کے لیے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے حال گزرے ہیں جو لوگوں کے لیے سند بن گئے۔ ان ہی میں سے ایک یہ ہے کہ اہلِ مکہ نے یہودیوں سے پوچھ کر جو تین سوال آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے انتظار میں فرمادیا کہ کل بتاؤں گا اور زبان سے ان شاء اللہ (اللہ نے چاہا تو) کہنا بھول گئے لیکن ہوا یہ کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پندرہ دن تک وحی نہ آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم افسردہ ہو گئے۔ کفار نے بھی مذاق اڑایا۔ پندرہ دن بعد وحی نازل ہوگئی اور فرمایا: وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۔۔۔۔ اے میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی کام کے بارے یوں نہ فرمائیں کہ میں کل کردوں گا ہاں! یہ فرمایا کیجیے کہ اللہ نے چاہا تو کل ہو جائے گا۔ اس کام کو اللہ کریم نے اتنی اہمیت دی کہ پندرہ دن تک وحی نہ بھیجی تاکہ یہ واقعہ سند بن جائے اور قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے راہِ عمل متعین ہو جائے۔ کوئی بات بھی کریں تو اس میں اپنی انا نہ آئے۔ کسی چیز کی نسبت بندہ یہ نہ کہے کہ میں یہ کردوں گا بلکہ یہ کہے کہ اللہ نے توفیق دی، اللہ نے چاہا تو میں یہ کر دوں گا۔ فرمایا: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ ۔۔۔ امت کو تعلیم دی جارہی ہے کہ اگر کسی دُنیوی کام کے سبب، کسی مشغولیت کی وجہ سے، سوجانے کی وجہ سے اللہ کی یاد رک جائے تو جیسے آنکھ کھلے، جیسے یاد آئے پھر ذکر شروع کردیں۔ زندگی، موت، مابعد الموت، قیامت، میدان حشر، جنت تک کے لیے انسان کے پاس جو سرمایہ ہے وہ ذکرِ الٰہی ہے۔ دنیا گزر جائے گی اور دنیا کے حالات بھی گزر جائیں گے۔ سب کچھ یہیں چھوڑ جائیں گے۔ آخرت میں اعمال ساتھ جائیں گے۔ اعمال کا دارومدار کس پر ہے؟ یادِ الٰہی، ذکرِ الٰہی پر۔ اللہ کی عظمت جس قدر دل میں پیوست ہوگی، جتنا آپ کا دل، دماغ اللہ کے حضور حاضر ہوگا اتنی آپ کو صالح اعمال کرنے کی توفیق

ہو گی۔ اللہ کی یاد بھول جائیں گے تو کس کے لیے عمل کریں گے اور کون توفیق دے گا؟ لہٰذا اے انسان اگر اللہ کی یاد کسی سبب سے بھول جائے تو جیسے ہی خیال آئے 'اللہ اللہ' کرنا شروع کر دے کہ سارے دین کی بنیاد اللہ کی یاد ہے۔ یہ یاد دل میں زندہ ہو تو بندہ نیکی کر سکتا ہے ورنہ توفیق نہیں ہوتی۔ خیال ہی نہ ہو تو بندہ نیکی کیا کرے گا۔

فرمایا: وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾ فرمایا، میرا ربّ قادر ہے مجھے دلیلِ نبوت کے طور پر اس سے بڑا معجزہ عطا فرما دے گا۔

اصحاب کہف کے بارے طرح طرح کی خرافات جمع کر کے کتنے ہی افسانے بنا رکھے تھے۔ جھوٹی کہانیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے صدیوں پہلے کی بات ضروری تفصیل کے ساتھ عین حق بتا دی۔ اس کے بارے فرمایا کہ یہ میری نبوت کی دلیل بھی ہے۔ اللہ کریم تو ایسا قادر ہے کہ اس سے بڑی دلیل بھی عطا فرما دے۔ یہ حقیقت عیاں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے معجزات کا شمار ممکن ہی نہیں۔ اللہ کا کلام قرآن حکیم حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا عظیم الشان معجزہ ہے۔ اللہ کی کتاب جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوئی، جو قیامت تک کے انسانوں کی راہنمائی کے لیے کافی ہے۔ جس کا محافظ خود ربّ العالمین ہے۔ اس میں ذرا سا رد و بدل، کمی بیشی کوئی نہیں کر سکتا۔ اپنے نزول سے لے کر آج تک کھلا چیلنج ہے۔ اللہ کریم کا اعلان موجود ہے کہ تمام انسان اور جن جمع ہو جاؤ اور ایسی ایک عبارت بنا لاؤ لیکن کوئی ایسا نہیں کر سکا اور نہ کر سکے گا۔

اللہ کی محبت پانے کا نسخہ:

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ مبارکہ کا ہر لمحہ معجزہ ہے، اگر کوئی سمجھ سکے تو! علمائے کرام فرماتے ہیں جسے اللہ سے محبت کرنی ہو وہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ مبارکہ کا مطالعہ کرتا رہے، زندگی مبارک کے حالات پڑھتا رہے تو اس سے دل ایسا صاف ہوتا ہے کہ عظمتِ الٰہی در آتی ہے اور اللہ کریم سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

فرمایا، میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلّم) انہیں فرما دیجیے کہ یہ جو تم حیران ہو رہے ہو کہ میں نے یہ قصہ بیان کر دیا۔ اس میں حیرت کی بات نہیں، میرا پروردگار قادر ہے کہ مجھے اس سے بڑے معجزات عطا کر دے۔

فرمایا، یہ بھی آپ کو بتا دیں کہ جس پر آپ جھگڑ رہے ہیں کہ کتنا عرصہ گزرا، کب یہ غار میں گئے، کب جاگے؟ تو سنیں! وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾ اللہ کریم فرماتے ہیں، یہ تین سو نو سال سوتے رہے۔

اللہ کے سوا کوئی غیب دان نہیں:

فرمایا: قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ۔۔۔فرما دیجیے، اللہ کریم خوب جانتا ہے کہ کون کہاں رہا، کتنا رہا، کب سویا اور کب جاگا؟ ہر ایک کے بارے اللہ کریم ذاتی طور پر جانتا ہے۔ زمین و آسمان کے تمام غیوب صرف اس کے لیے ہیں۔ اللہ کے علاوہ کوئی غیب دان نہیں۔ انبیاء جو غیب کی باتیں بتا دیتے ہیں تو وہ اللہ کریم خود انہیں تعلیم فرماتا ہے۔ قرآن حکیم میں دوسری جگہ ارشاد ہے: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۔۔۔(آل عمران:179) اللہ تمہیں اپنے غیب نہیں بتاتا لیکن اپنے انبیاءؑ میں سے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ غیب کی خبروں میں سے جو ضروری ہوں انہیں بتا دیتا ہے۔ قرآن نے اس کے لیے اصطلاح دی ہے 'اطلاع عن الغیب' لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ ۔ اللہ نے بتا دیا اس طرح یہ غیب نہ رہا، غیب پر اطلاع ہوگئی۔ اللہ کریم نے انبیاءؑ کو غیب پر مطلع کر دیا۔

انبیاءؑ کے علاوہ صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ اولیاء اللہ بہت سے مغیبات سے واقف ہو جاتے ہیں لیکن انہیں غیب پر اطلاع دی جاتی ہے اور جس بات پر اطلاع نہیں دی جاتی وہ اس بات سے واقف نہیں ہوتے۔ غیب دان صرف اللہ کی ذات ہے۔

انبیائے کرامؑ کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ جب اللہ نے چاہا اور جتنا چاہا غیب پر اطلاع دے دی۔ اور جب اطلاع نہ دی تو انبیاءؑ کو معلوم نہ ہوا۔ جیسے سیدنا ابراہیمؑ کے بارے ایک وقت میں فرمایا: نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔۔۔(الانعام: 75) ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو زمین و آسمان کی بادشاہت دکھا دی۔ ہم نے ہر چیز کھول کر ان کے سامنے رکھ دی کہ زمین میں کیا ہو رہا ہے، آسمانوں میں کیا کچھ ہو رہا ہے، کس طرح قدرتِ باری اس نظام کو چلا رہی ہے، زمین و آسمان کی ساری حقیقتیں کھول کر سامنے رکھ دیں لیکن جب خواب میں حکم دیا کہ بیٹے کو ذبح کرو تو تب حقیقت نہیں بتائی۔ آپؑ کو نہیں بتایا کہ اسمٰعیل علیہ السلام ذبح نہیں ہوں گے۔ ان کی جگہ جنت سے دنبہ آئے گا۔ ابراہیم علیہ السلام کو یہ معلوم نہیں تھا۔ آپؑ نے تو اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کر دی، اسمٰعیل علیہ اسلام پاس کھڑے مسکرا رہے تھے اور دنبہ ذبح ہو گیا تھا۔ آپؑ نے تو اپنی طرف سے اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کیا تھا۔ یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ کیا میری قربانی قبول نہیں ہوئی تو فوراً وحئ الٰہی آ گئی: قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۔۔۔(الصّٰفّٰت:105) آپؑ نے سچ کر دکھایا۔ یہ تو ہماری قدرتِ کاملہ ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام کو ہم نے بچا لیا اور دنبہ ذبح کرا دیا۔ انہی ابراہیم علیہ اسلام کو کبھی کائنات کا مشاہدہ کرا دیا اور کبھی یہ بھی نہ بتایا کہ

آپ کی چھری کے نیچے دنبہ آچکا تھا۔اسی طرح یعقوب علیہ السلام، اپنے بیٹے اور اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام کی جدائی میں برسوں روتے رہے یہاں تک کہ بینائی جاتی رہی۔ برسوں بعد جب یوسف علیہ السلام کی بھائیوں سے ملاقات ہوئی، والدِ گرامی کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اپنا کُرتا دے کر بھیجا کہ اسے میرے والد کے چہرے پر پھیر لو بینائی درست ہوجائے گی۔آپؑ کا کُرتا لے کر جب قافلہ مصر سے نکلا تو طویل مسافت کی دوری پر کنعان میں بیٹھے یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: اِنِّیۡ لَاَجِدُ رِیۡحَ یُوۡسُفَ۔۔۔(سورہ یوسف:94) مجھے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے۔مولانا رومیؒ نے اسے یوں منظوم کیا ہے:

کسے پر سید آں گم کردہ فرزند
کہ اے روشن گہر پیر خرد مند

کہ کسی نے ان بزرگ سے پوچھا کہ آپ دانا تر، صاحب کشف اور اللہ کے نبیؑ ہیں تو کیا بات ہے کہ

زمصرش بُوئے پیراہن شمیدی
چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی

کُرتے کی خوشبو تو آپ نے اس وقت سونگھ لی جب قافلہ مصر میں یوسف علیہ السلام کا کُرتا لے کر چلا اور تب آپ کو معلوم نہ ہوسکا جب یوسف علیہ السلام آپ کے علاقے کنعان کے کنوئیں میں پڑے رہے۔تب آپؑ کو یوسف علیہ السلام کی خوشبو کیوں نہ آئی؟ تو آپؑ نے فرمایا:

بگفت حالِ ما برق جہاں است
دمِ پیدا دمِ دیگر نہاں است

ہمارا حال ایسے ہے جیسے آسمان پر بجلی چمک جاتی ہے تو سارے ماحول کو روشن کر دیتی ہے اور جب چلی جاتی ہے تو کچھ سمجھائی نہیں دیتا۔

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم
گہے بر پشت پائے بر نہ بینم

کبھی اللہ کے حکم سے اللہ کے عرش عظیم پر بیٹھے کائنات کا نظارہ کرتے ہیں اور کبھی اپنے پاؤں کی پشت بھی نظر نہیں آتی جو ویسے ہر وقت نظروں کے سامنے ہوتی ہے۔جب اللہ کریم مشاہدات دیتے ہیں تو کائنات کھول کر دکھا دیتے ہیں اور جب نہ دکھانا چاہیں تو کچھ پتا نہیں چلتا۔

اس کے معنی ہیں کہ غیب صرف اللہ کی خصوصیت ہے۔غیب صرف اسی کے بس میں ہے اور وہ کیا خوب سننے

والا ہے، کیا خوب جاننے والا ہے!

اللہ کے سوا کوئی کارساز نہیں:

فرمایا: مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝ لوگو! اللہ کے سوا کوئی کارساز نہیں اور تم در بدر بھٹکتے پھرتے ہو کہ فلاں تمہارا کام کردے گا! تو ایسا مت کرو۔ ناجائز ذرائع اختیار نہ کرو اس لیے کہ کام اللہ نے کرنا ہے کسی اور نے نہیں کرنا۔ ہر کام چھوٹا ہے یا بڑا، دنیا کا ہے یا آخرت کا، زندگی کا ہے یا موت کا، ہر کام میں تمہارا کارساز اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ ہمہ وقت تمہارے ساتھ ہے، ہر کام کرنے پر قادر ہے اور اسی نے کرنا ہے۔ جائز وسائل اختیار کرنا اس کی اطاعت ہے اور ناجائز وسائل اختیار کرنا نافرمانی ہے، جرم ہے۔

اس کے حکم میں، اس کی بادشاہت میں کسی کو شریک نہ کرو کہ اللہ کا حکم چھوڑ دو اور دوسرے کی بات مان لو۔ ایسا نہ کرو۔ یہ بڑا خسارے کا سودا ہے۔ کُل مخلوق کے سارے امور خالق و مالک، وحدہٗ لاشریک نے انجام دیے ہیں۔ تمام انبیاءؑ کی تعلیم کا یہی خلاصہ ہے کہ اسی وحدہٗ لاشریک پر بھروسہ رکھو۔ اس کی ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ کرو۔ اس کے سوا کسی پر بھروسہ نہ کرو۔

نزولِ کتابِ الٰہی، شانِ ربوبیت کا تقاضا:

فرمایا: وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝ ارشادِ باری ہے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) تلاوت فرمایا کیجیے، پڑھتے رہا کیجیے، اپنے پروردگار کی کتاب جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی طرف وحی کی جاتی ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصبِ جلیلہ یہ ہے کہ جو وحیِ الٰہی آئی ہے اسے اللہ کے بندوں تک پہنچا دیں۔ کوئی مانتا ہے یا نہیں مانتا یہ معاملہ اس کا اللہ کریم کے ساتھ ہے۔ کوئی اس پر عمل کرتا ہے یا نہیں کرتا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہاں مِّنْ رَّبِّكَ۔۔۔ فرمایا یعنی جو کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ربّ کی طرف سے ہے۔ گویا کتاب اللہ کا بندوں تک پہنچانا اللہ کی شانِ ربوبیت کا تقاضا ہے۔ چونکہ ربّ وہ ہستی ہے جو ساری مخلوق کی ہر ضرورت، ہر وقت، ہر جگہ پوری کرتی ہے تو جس طرح ربّ کی طرف سے رزق دیا جاتا ہے اسی طرح یہ کتاب اللہ کی طرف سے روحانی رزق ہے۔

انسان صرف جسم کا نام نہیں۔ انسان، بدن اور روح سے عبارت ہے۔ علمائے حق فرماتے ہیں۔ جب الانسان کہا جائے تو اس سے مراد روح ہے۔ حقیقی روح ہے، بدن روح کا لباس ہے۔ بدن روح کی سواری ہے جسے

روح استعمال کرتی ہے۔

اللہ کریم نے جسم کے لیے بے پناہ مادی رزق پیدا فرمایا ہے۔ ارشاد باری ہے: خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ۔۔۔(البقرہ:29) زمین پر جو کچھ پیدا کیا ہے وہ سب تمہارے لیے ہے۔ سب تمہاری خدمت پر مامور ہیں۔ ادنیٰ سی گھاس سے لے کر بڑے تناور درختوں تک سب تمہارے فائدے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ کوئی پھل دے رہا ہے، کوئی عمارتیں بنانے کے لیے لکڑی بہم پہنچا رہا ہے، کسی کی لکڑی سے استعمال کی چیزیں بن رہی ہیں، کوئی جلانے کے کام آرہا ہے اور کوئی محض سایہ دے رہا ہے۔ اسی طرح جڑی بوٹیوں سے دوا بن رہی ہے تو کوئی غذا کا سامان دے رہی ہے۔ جانور انسان کی خدمت کررہے ہیں۔ کسی کا گوشت کھایا جارہا ہے، کسی کے ذریعے شکار کیا جارہا ہے، کسی پر بوجھ لادا جارہا ہے۔ بارشیں برستی ہیں تو سبزہ ہوجاتا ہے۔ چارا اُگتا ہے، فصلیں اُگتی ہیں، غرض اللہ کے پیدا کردہ رزق کی نعمتوں کو کوئی گن نہیں سکتا۔ اس مادی وجود کے لیے اللہ نے اتنا جہان سجادیا ہے حالانکہ یہ حقیقی وجود نہیں ہے۔ اصل وجود تو روح ہے تو روح کی غذا کے لیے اللہ نے کتنی نعمتیں پیدا کی ہوں گی!

اگر کوئی مہمان آجائے اور وہ کسی سواری پر سوار ہو تو اس کی سواری کی حفاظت کی جاتی ہے اس کے گھوڑے کو باندھا جاتا ہے، چارہ دیا جاتا ہے۔ گاڑی ہو تو اس کی حفاظت کی جاتی ہے، ڈرائیور ہو تو کھانا کھلایا جاتا ہے لیکن اصل اہمیت تو سوار کی ہوتی ہے۔ اصل اہتمام تو سوار کے لیے ہوتا ہے۔ اسی طرح بدن روح کی سواری ہے۔ اس کی خدمت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا خوان سجا رکھا ہے تو اس سوار کے لیے کیا اہتمام ہوگا! جس طرح بدن کے لیے تمام نعمتیں زمین پر موجود ہیں۔ ایک تختۂ زمین ہے جو ان نعمتوں کا امین ہے، کتنی مخلوق کب سے اس سے مستفید ہورہی ہے اور کب تک ہوتی رہے گی۔ سب کا حصہ اس کے پاس امانت ہے۔ سب اپنے اپنے وقت میں اسے استعمال کرتے رہیں گے۔

اسی طرح قرآن حکیم میں روح کے لیے نعمتیں ہیں۔ قرآن حکیم کے حروف والفاظ محض حروف والفاظ نہیں ہیں، ان میں بے پناہ کیفیات ہیں، بے حد و بے حساب ہیں۔ جتنی روح کی ضرورت ہے اس سے زیادہ کیفیات ان میں موجود ہیں۔ بارشیں برستی ہیں تو دریا بہتے ہیں، سمندر بھرتے ہیں لیکن کیا انسان اس سب کو استعمال کرلیتا ہے؟ انسان تو چند گھونٹ پی کر سیر ہوجاتا ہے۔ اللہ کی نعمتیں ہماری ضرورتوں سے زیادہ ہیں۔ اسی طرح روح کے لیے کتابِ الٰہی میں اس کی ضرورت سے زیادہ کیفیات موجود ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ ہمیں پڑھنے کی فرصت نہیں۔ اگر کوئی پڑھنے کی سعادت حاصل کرتا ہے تو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، سمجھ آ جائے تو اس پر عمل نہیں کرتے۔ اگر کسی کے پاس اچھا کھیت بھی ہو، پانی بھی وافر ہو، وہ جانتا بھی ہو کہ اس میں بیج ڈالیں گے، کاشت کریں گے تو اچھی فصل ہو جائے گی لیکن وہ اس میں بیج ہی نہ ڈالے، پانی نہ لگائے تو کھیت یوں ہی رہے گا، کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اسی کھیت کی طرح ہم نے اس مقدس کتاب کو خوبصورت غلافوں میں لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔ جب کسی کا مرنے کا وقت قریب آ جائے تو ہم اس پر سورہ یٰسین پڑھتے ہیں حالانکہ یہ وہ کتاب ہے جو مردہ دلوں کو زندہ کرنے کے لیے ہے، یہ حیات عطا کرنے کے لیے ہے اور جن کو اس سے حیات ملتی ہے ان پر موت اثر نہیں کرتی، وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ اللہ کے مقبول بندے زندہ رہتے ہیں اگرچہ دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے حیات قرآن حکیم سے پائی، جنہوں نے روح کو وہ غذا دی جو قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ ایسی حیات پانے والوں کی روح پر موت نہیں آتی، بدن پر آتی ہے۔ ایسے لوگوں کی موت یہ ہے کہ روح کا جو تعلق، حیاتِ دنیا کے لیے بدن کا ہے وہ منقطع کر دیا جاتا ہے۔ بندہ دنیا سے گزر جاتا ہے، روح نہیں مرتی، نہ نیک کی روح مرتی ہے نہ بد کی۔ گنہگار کی، کافر کی روح پر بھی موت نہیں آتی بلکہ عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ جن روحوں کو زندگی میں قرآنِ کریم سے غذا ملتی ہے، انہیں حیاتِ جاوداں مل جاتی ہے، وہ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔

اللہ کی کتاب کو ویسا ہی مانا جائے گا جیسی اللہ نے نازل فرمائی:

فرمایا: لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۔۔۔ اس کی باتوں کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ یہ اللہ کی کتاب ہے اس کے کسی حکم کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی تبلیغ روز افزوں ترقی پاتی گئی تو مشرکینِ مکہ جمع ہوئے کہ اس کا سدّ باب کیسے کیا جائے۔ وہ بہت پریشان تھے کہ ایک شخص نے پورے نظام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ رکھا ہے۔ ہمارے باپ دادا کے مذہب کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔ ہمارے بتوں کو جہنم کا ایندھن بتاتا ہے۔ اسلام سے انہیں دو باتوں پر شدید تکلیف تھی۔ ایک کفر و شرک اور بتوں کو بُرا کہنے پر اور یہ کہ ہم سرداروں کو غرباء کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ ہمارا مقام اور ہے، ہم قابلِ احترام ہیں۔ جب ہم سردار آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے پاس آئیں تو سرداروں کی مجلس میں غلاموں، مزدوروں اور غریبوں کو نہیں بیٹھنا چاہیے۔ یہ دو باتیں اگر بدل دیں تو ہم آپ کی بات سنیں گے۔

مشرکینِ مکہ نے ایک وفد بارگاہِ رسالت میں بھیجا جس میں کچھ لو کچھ دو کی پالیسی اپنا کر پیشکش کی گئی۔ وفد

نے عرض کیا کہ آپ اسی سرزمین کے رہنے والے ہیں، اسی قبیلہ کے عظیم فرد ہیں۔ آپ نے ایک تبدیلی کی بنیاد رکھ دی ہے۔ آپ کے ساتھ آپ کے جاں نثار ہیں۔ آپ کی دعوت اب پھیل کر مکہ مکرمہ سے باہر نکل رہی ہے، دیگر قبائل تک پہنچ رہی ہے، لوگ اپنا آبائی مذہب ترک کر کے اسلام میں داخل ہو رہے ہیں تو آپ اس ساری تگ ودو سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

مشرکینِ مکہ خالص مادّی سوچ کے حامل تھے، ان کی نظر یہیں تک تھی لہٰذا انہوں نے یہی سمجھا کہ جیسے ہر دنیادار لوگوں کو اپنے پیچھے لگا کر دنیوی مفادات حاصل کرنا چاہتا، اقتدار و شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے، دولت وقوت چاہتا ہے تو انہوں نے پیشکش کی کہ اگر آپ دولت جمع کرنا چاہتے ہیں تو آپ اپنا مذہب قائم رکھیں، اس میں بس چھوٹی سی تبدیلی کر دیں کہ ہمارے مذہب کو باطل نہ کہیں، ہمارے بتوں کی برائی نہ کریں، ہمارے عقائد و نظریات کو کفریہ اور شرکیہ عقائد قرار نہ دیں۔ اس تبدیلی کے بعد بے شک آپ اپنے نظریات پر کاربند رہیں۔ ہم پیشکش کرتے ہیں کہ اگر آپ دولت چاہتے ہیں تو ہم پورے عرب سے آپ کو اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ اور کسی کے پاس اتنی دولت نہ ہوگی۔ اگر آپ کسی حسین خاتون سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو ہم عرب کی حسین ترین اور کسی رئیس کی بیٹی آپ کے نکاح میں دے دیتے ہیں۔ آپ بادشاہ بننا چاہتے ہیں تو ہم سارے قبائل کو جمع کر کے آپ کی بادشاہی منوا کر آپ کو عرب کا بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ آپ اپنا دین بھی رکھیں، کلمہ بھی پڑھیں، نمازیں بھی پڑھیں لیکن ہمارے بتوں کو غلط نہ کہیں، ہمارے دین کو غلط نہ کہیں۔ پہلے بھی تو یہاں لوگوں نے بے شمار دین بنا رکھے ہیں۔ آپ بھی اپنا دین رکھیں۔ جس طرح وہ ہمارے بتوں کو، ہمارے نظام کو برا نہیں کہتے آپ بھی نہ کہیں۔

قرآنِ حکیم کی قدر و قیمت آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے زیادہ کون جانتا ہے، کون جان سکتا ہے! آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ یہ بادشاہی تو زمین کی ہے، یہ دولت تو دنیا کی شئے ہے۔ تم نے جو پیشکش کی ہے، وہ کچھ ہے جو تمہارے بس میں ہے۔ اور جو تمہارے بس میں نہیں ہے، بالفرض تم وہ بھی لے آؤ اور میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دو تو میں وہ بھی تمہیں لوٹا دوں گا اور یہ پیغام پہنچاتا رہوں گا۔

یہی کتابِ الٰہی جسے پڑھنے کی آج ہمیں فرصت نہیں، اسی کے بارے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم فرما رہے ہیں کہ میں قرآن کا پیغام پہنچاتا رہوں گا، پڑھتا رہوں گا، سناتا رہوں گا۔ تمہاری خواہش ہے کہ اس میں تبدیلی ہو جائے تو سن لو: لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۔۔۔ جو لفظ وحی سے نازل ہوگا وہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا نہ کسی سردار کے کہنے سے نہ کسی رئیس کے کہنے سے۔ جس کو ماننا ہے تو ویسے ماننا ہوگا جیسی نازل ہوئی ہے۔ اس کے الفاظ بدلے نہیں جائیں گے جسے منظور ہے وہ اسے قبول کر لے۔ یہ ارشاد فرماتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس کوئی خزانہ نہیں تھا،

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ کوئی فوج یا لشکر نہیں تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ اللہ جل شانہٗ کا ساتھ تھا۔ جو سب سے بڑی قوت ہے۔ یہی قوت حاصل کرنے کے لیے کتاب الٰہی ہے۔ اسی کے بارے اللہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم سے مخاطب ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) اسے پڑھتے رہا کیجیے اور اس کا پیغام پہنچاتے رہا کیجیے اور یہ اعلان بھی کر دیجیے کہ اس پر مِن وعَن عمل کرنا ہوگا۔ اس میں ذرہ برابر تبدیلی ممکن نہیں۔

اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے نزدیک کتابِ الٰہی، پیغام الٰہی، احکاماتِ الٰہی کی اہمیت کیا ہے اور ہمارا طرزِ عمل کیا ہے؟ ہم روز صبح اٹھ کر ملازمت پر، مزدوری پر یا کاروبار پر نکل جاتے ہیں۔ کیوں؟ زندگی بسر کرنے کے لیے خوراک، لباس، چھت اور ضروریات پوری کرنا ہوتی ہیں۔ درست ہے۔ فکر کرنی چاہیے، ضروری ہے لیکن کیا اسی پر بس ہو جائے؟ کیا صرف بدن کو ہی زندہ رکھنا ہے، اسے ہی صحت مند رکھنا ہے، اسی کی ضروریات ہی پوری کرنا ہیں، اسی کی بیماریوں کا علاج ہی کرنا ہے یا روح کی بھی فکر کرنی ہے؟ اللہ ہم پر رحم کرے، کیا ہمیں احساس ہے کہ ہمارے اندر روح بھی ہے، اس کی بھی کوئی ضرورت ہے، اس کی بھی کوئی غذا اور دوا ہے؟ ہمیں روح کی کوئی فکر نہیں کہ اسے زندہ رکھنا ہے، صحت مند رکھنا ہے۔ اللہ کریم بتا رہے ہیں کہ روح کی بیماریوں کا علاج بھی اسی قرآن میں ہے، اس کی غذا اور دوا بھی قرآن میں ہے، اس کی حیات بھی اسی میں ہے۔

ہم زندگی بھر دنیوی ضروریات کے لیے وسائل تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ہم مختلف چیزوں سے پناہ مانگتے ہیں کہ بھوکے نہ مر جائیں، عزت کم نہ ہو جائے، مکان اچھے بنالیں، لباس اچھا ہو جائے۔ ان سب امور کے لیے لوگوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں لیکن اللہ کریم فرماتے ہیں: وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿٢٧﴾ یہ سارے عارضی آسرے ہیں۔ جائے پناہ اگر ہے تو اللہ کی بارگاہ ہے، اللہ کی بارگاہ کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں۔ پناہ صرف اللہ کے پاس ہے اور اللہ کی بارگاہ کا راستہ وہ کتابِ الٰہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوئی۔ جس کے بارے امت کو تاکید کی گئی کہ قرآن کو پڑھتے رہیں دوسروں تک پہنچاتے رہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ پاک ہے: بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً (صحیح البخاری) میری طرف سے ایک کلمہ، ایک بات بھی پہنچے تو اسے آگے پہنچاؤ۔ یہی اسلام ہے۔ ہر بندۂ مومن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بارگاہ کا قاصد ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا پیغام انسانیت تک پہنچاتا رہے۔ کوئی مانے نہ مانے، یہ اللہ اور اللہ کے بندوں کے درمیان معاملہ ہے لیکن پہنچانا ضروری ہے۔ مگر پہنچائے گا کون؟

جس کے بچے بھوکے بیٹھے ہوں، وہ کھانا بانٹے گا؟ جب اس کے اہلِ خانہ کا پیٹ بھرے گا اور کھانا زائد ہوگا تو بانٹے گا۔ روحانی کیفیات بھی اسی طرح ہیں۔ اپنی روح منور ہوگی تو آگے بانٹیں گے۔ اسی لیے فرمایا، یہ کام ایک دن، ایک گھنٹے، ایک ساعت یا چند سالوں کا نہیں یہ عمر بھر کا کام ہے۔ پروردگارِ عالم کی طرف سے جو کتاب نازل ہوئی ہے، اسے پڑھتے رہنے کا حکم آیا ہے کہ اسے پڑھتے رہو، پڑھاتے رہو، سمجھتے رہو اور پہنچاتے رہو۔ یاد رکھو! اسے ویسا ہی ماننا ہے جیسی نازل ہوئی ہے۔ اس میں کسی کی خواہش پر تبدیلی نہیں ہوگی اور یہ بھی پلے باندھ لو کہ اس کے علاوہ کوئی جائے پناہ بھی نہیں۔ یہ دنیا کی زندگی عارضی ہے، یہ چند لمحوں میں ختم ہو جائے گی، جائے پناہ صرف اللہ کی بارگاہ ہے۔

اس سے آگے روح کے بارے ارشاد ہوتا ہے کہ روح کس طرح منور ہوتی ہے۔ ذکرِ الٰہی وہ نعمت ہے جو برکاتِ نبوت کو متوجہ کرتی ہے اور روح منور ہوتی ہے۔ ارشادِ باری ہے: وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ ۔۔۔ فرمایا، اے میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے آپ کو، اپنی ذاتِ والاصفات کو ان لوگوں کے ساتھ رکھیے جو صبح و شام علی الدوام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں، اس کی خوشنودی کے طالب ہیں، اس کی رضا چاہتے ہیں۔ یہ اپنے ربّ کو رات دن، ہر گھڑی پکارتے رہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد صرف اللہ کی رضا ہوتی ہے۔ یہ وظیفے نہیں کرتے رہتے کہ فلاں تسبیحات پڑھیں تو دولت پالیں، فلاں وظیفہ کریں تو عہدہ حاصل کریں وغیرہ۔ یہ رات دن اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اس سے ان کی مراد ہوتی ہے کہ میرا پروردگار مجھ سے راضی ہو جائے، مجھ پر رحم فرمائے، میری خطائیں معاف کر دے، مجھ سے خوش ہو جائے۔

ذکرِ اللہ کیا ہے اور کتنا ضروری ہے؟

ذکر اللہ حیات بھی ہے اور حیات آفرین بھی ہے۔ ذکر زندگی ہے اور زندگی کا سبب بھی ہے۔ ذکر کی کوئی حد نہیں۔ ہاں! درجات مختلف ہیں۔

ایمان لانا بھی ذکر ہے۔ جو شخص کفر چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوتا ہے یا بچہ مسلمان کے گھر پیدا ہو کر بالغ ہوتا ہے اور ایمان لاتا ہے تو یہ بھی ذکر ہے۔ ہر وہ عمل جو اللہ کے حکم کے مطابق ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق کیا جائے وہ ذکر ہے۔ ہر وہ بات جو اللہ کا حکم ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس انداز سے فرمائی ہے اسی انداز سے کی جائے تو وہ بات بھی ذکر ہے۔ یہ ذکر کی مختلف صورتیں ہیں۔ قرآنِ کریم نے اسی پر بس نہیں کی کہ ایمان لے آئے ذکر ہو گیا، اعمال شریعت کے مطابق ہو گئے ذکر ہو گیا، بس کافی ہے۔ نہیں۔ فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا

اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا○ (الاحزاب: 41) اے ایمان والو! اللہ کا ذکر بہت کثرت سے کرو۔ حکم دیا جارہا ہے کہ ذکرِ کثیر کرو اور علی الدوام کرو یعنی اس میں انقطاع نہ آئے۔

ذکرِ کثیر:

ذکرِ کثیر کیسے کریں جبکہ ہم باتیں بھی کرتے ہیں، کام بھی کرتے ہیں، دیگر امور میں مشغول ہوتے ہیں، سوتے جاگتے بھی ہیں۔ کون سا عمل ہے جسے ہم کثیر کہہ سکتے ہیں؟ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک ہم سانس لیتے رہتے ہیں، سوئے ہوں یا جاگے، ہوش میں ہوں یا بے ہوش، جب تک زندہ ہیں، سانس چلتی رہتی ہے۔ اس طرح سانس لینا عمل کثیر ہو گیا لیکن حکم یہ ہے کہ سب کاموں میں سے زیادہ کام یعنی عملِ کثیر ذکر اللہ ہونا چاہیے۔ سانس لینے سے زیادہ دل کی دھڑکن عملِ کثیر ہے۔ ماں کے پیٹ سے شروع ہوتی ہے اور موت پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ حکم یہ ہے کہ ذکر اس سے زیادہ ہو کہ ذکرِ کثیر کا حکم تب پورا ہو گا جب ہم تمام کاموں سے زیادہ ذکر کریں گے۔ جتنے کام ہم زندگی میں کرتے ہیں ذکر اس سے زیادہ ہو ورنہ جو کام اُس سے زیادہ کریں گے وہ کثیر ہوگا۔

برکاتِ نبوت سے ذکرِ کثیر:

برکاتِ نبوت کا اثر یہ ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے وجود کا ذرہ ذرہ متوجہ الی اللہ ہو گیا۔ ارشادِ باری ہے: ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ۔۔۔ (الزمر: 23) اُن کے قلوب بھی ذاکر ہو گئے اور اُن کے وجود کا ہر ذرّہ ذاکر ہو گیا۔ اس آیۂ مبارکہ میں قلب کو بدن میں شامل نہیں کیا گیا، قلب کا ذکر علیحدہ سے کیا اس لیے کہ جب لطیفۂ قلب ذاکر ہو جائے تب جا کر ذکر، ذکرِ کثیر بنتا ہے ورنہ باقی سارے عمل کثیر ہوتے ہیں اور ذکر قلیل رہ جاتا ہے۔

انسانی وجود میں دل، گوشت کا وہ لوتھڑا ہے جو مادّی وجود کی حیات کو قائم رکھنے کا سبب ہے۔ اسی دل کے اندر ایک لطیفۂ ربانی ہے جسے قلب یعنی (Subtle Heart) کہتے ہیں۔ جب وجودِ انسانی کے سارے ذرّات ذاکر ہو جائیں اور لطیفہ قلب بھی ذاکر ہو جائے تب ذکرِ کثیر ہوتا ہے۔

اللہ کریم تو فرما رہے ہیں کہ ذکرِ کثیر کرو۔ یہ ہمارے کرنے کا کام ہے۔ اسے ہم نے چھوڑ دیا ہے اور جو کام اللہ نے اپنے ذمہ لیا تھا وہ ہم نے اپنے ذمّہ لے کر اس کی فکر میں یہ اہم کام چھوڑ دیا ہے۔ رزق کمانا مومن کی ذمہ داری ہے، اس کے لیے محنت کرنا، جائز وسائل اختیار کرنا فرض ہے اور فرض کی ادائیگی عبادت ہے لیکن رزق کی فکر کرتے ہوئے اللہ کریم کا یہ ارشاد یاد رہے فرمایا: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔۔۔ (ھود: 6) اور زمین پر جو کوئی بھی چلنے پھرنے والا ہے اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے۔ یاد رہے! رازق وہ ہے، جتنا چاہتا ہے اتنا رزق

دیتا ہے۔ یہ جو ہم کسبِ رزق کرتے ہیں یہ رزق کا سبب نہیں ہے، یہ تعمیلِ ارشاد ہے کہ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ یہاں کے حکم دیا گیا ہے کہ جائز اسباب اختیار کرو۔ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے، اس کی سمجھ آ جائے تو پھر ناجائز اسباب اختیار کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جو ناجائز ذرائع اختیار کرتے ہیں تو اس لیے کہ انہیں اللہ پر بھروسہ نہیں ہے کہ وہ رازق ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ رزق انہوں نے ہی جمع کرنا ہے خواہ چھین کر کریں۔

ذکرِ کثیر اور معیتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم :

ساری کائنات میں اللہ کے بعد افضل ترین ہستی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعریف کرنا کسی کے لیے ممکن ہی نہیں۔ شاعر نے تھک ہار کر کہہ دیا۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اللہ کریم حکم دے رہے ہیں کہ اے میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلّم) اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ رکھیں جو ذکرِ کثیر کرتے ہیں، ذکرِ دوام کرتے ہیں، جن کے قلوب روشن ہیں، جن کے بدن کے ذرّات (Body Cells) ذاکر ہیں۔ اے میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلّم) وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۔۔۔ اپنی نظرِ کرم ان کی طرف رکھیے۔ سبحان اللہ! اس سے بڑا کسی انعام کا کوئی تصور ہو سکتا ہے کہ کسی کو معیتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نصیب ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اس سے راضی رہیں اور نظرِ کرم رکھیں۔

اللہ کریم اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کو حکم فرما رہے ہیں: تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔۔۔ ان دنیا داروں کی پروانہ کیجیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) اپنی نظرِ کرم ان لوگوں پر رکھیے جو صبح وشام محض میری رضا کے لیے مجھے پکارتے ہیں۔

دنیا میں نے بانٹی ہے، میں نے مشرکوں، کافروں اور رزیلوں کو بھی دے دی ہے۔ دنیا کی دولت، حکومت و سلطنت، ریاست وعہدہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ آپ انہیں شمار میں ہی نہ لائیں، توجہ ہی نہ فرمائیں۔ یہ سردارانِ مکہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کے پاس دولت و اقتدار ہے لہٰذا انہیں برتری حاصل ہونی چاہیے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ان سرداروں کو بھی میں نے ہی دولت دی ہے اور میں ہی ان سے حساب لوں گا۔ انہیں میرے ہی پاس آنا ہے، جتنا، جس کے پاس اختیار ہے اور جتنی دولت ہے جب اس کا حساب دینا پڑے گا تو پکار پکار کر کہیں گے کہ کاش وہ گداگر ہوتے، فقیر ہوتے، آج حساب تو نہ دینا پڑتا۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) ایسے لوگوں کی ہرگز پروانہ کریں۔ جب قلب میں اللہ کی یاد نہ ہوا ندھیرا اور

ظلمت چھائی ہو تو بندہ حیوانوں کی طرح محض خواہشات کا غلام ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے فرمایا: وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ جس شخص کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اس کی کوئی بات نہ سنیے، اس کی کوئی پروا نہ کیجیے۔ اس کا مطلب ہے ذکر نہ کرنا اور دل کا غافل ہونا عذابِ الٰہی ہے جو اللہ کی طرف سے مسلط کر دیا جاتا ہے۔ بندے کے کسی گناہ، کسی عمل، کسی نظریے سے ناراض ہو کر ذکر کی توفیق سلب کر لیتے ہیں۔ ذکر کی توفیق نہیں دیتے۔ یہاں اللہ کریم نے غفلت کو اپنی طرف سے فرمایا: اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا۔۔۔ جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا، آپ اسے کوئی اہمیت نہ دیں گویا ذکر اللہ نہ کرنا عذابِ الٰہی ہے۔

فرمایا، جب میں دل کو اپنی یاد سے محروم کر دیتا ہوں تو پھر کیا ہوتا ہے؟ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۔۔۔ وہ شخص خواہشاتِ نفس کی پیروی میں لگ جاتا ہے۔ وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ اس کا معاملہ حد سے بڑھ جاتا ہے۔ پھر اسے نہ عزت، بے عزتی کی پروا رہتی ہے نہ نیکی بدی کی تمیز۔ وہ خواہشاتِ نفس کے پیچھے جانوروں کی طرح بھاگتا رہتا ہے۔ اپنی ہوس پوری کرنے میں زندگی گزار دیتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمتِ مجسم ہیں۔ ارشادِ باری ہے: وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (الانبیآء: 107) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سارے عالمین کے لیے، ساری مخلوق کے لیے رحمت ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہو رہا ہے کہ جس کے دل کو ہم نے ذکر سے غافل کر دیا ہے اس کی بات کو پرکاہ اہمیت نہ دیں کہ جس کا دل ذکر سے غافل ہو جائے وہ خواہشاتِ نفس کا اسیر ہو جاتا ہے۔

آج کا ماحول اور معاشرہ اس کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ اس پر قرآن کا ارشاد حرف بہ حرف صادق آ رہا ہے کہ جو ذکر سے منہ پھیرے ہوئے ہیں وہ سارا دن نفس کی خواہشات کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ ذلیل و خوار بھی ہوتے رہتے ہیں، مصیبتیں بھی برداشت کرتے رہتے ہیں لیکن مقصد، خواہشات کی پیروی ہی ہوتا ہے۔ وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ ایسے لوگوں کا کام حد سے نکل جاتا ہے۔

جہاں تک میں سمجھا ہوں، وہ یہ ہے کہ جسے ذکرِ قلبی نصیب نہیں، کاش! وہ دنیا میں ہی نہ آیا ہوتا۔ عجیب ہیں وہ لوگ جو اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ زندگی گزار جاتے ہیں اس کی پروا نہیں کرتے۔ قرآن کریم جو فرما رہا ہے اور اس سے جو میں سمجھ رہا ہوں، اپنی اپنی سمجھ ہے۔ میں نہ عالم ہوں نہ مفسر نہ محدث نہ مفتی نہ پیر۔ میں ایک عام آدمی ہوں۔

اللہ کا احسان ہے قرآن کی باتیں اللہ سمجھا دیتا ہے سمجھ آ جاتی ہے۔ جو سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ جسے ذکر نصیب نہیں کاش وہ ہوتا ہی نہیں! اس کے پاس روزِ محشر کوئی جواب نہیں ہوگا کہ کیوں اس نے ذکر نہیں کیا۔

ذکرِ الٰہی سے مراد اپنی بڑائی نہیں ہے، کرامات کا حصول نہیں ہے، مستجاب الدعوات بننے کی بات نہیں ہے۔ ذکرِ الٰہی سے مراد صرف رضائے الٰہی ہے کہ اللہ کریم راضی ہو جائے۔ ہم اللہ کریم کی بے پناہ نعمتیں استعمال کر رہے ہیں۔ صرف ایک ہوا جس میں ہم سانس لے رہے ہیں چند لمحے بند ہو جائے تو پتا چلے۔ دھوپ کی قیمت دینی پڑے تو کون ادا کرے، بارش خریدنا پڑے تو کتنے لوگ حاصل کر سکیں گے؟ اللہ کی کتنی نعمتیں ہیں جنہیں ہم جانتے ہی نہیں، ان کو کبھی نعمت شمار نہیں کرتے۔ جس ربّ نے اتنی نعمتیں دی ہوں اس کا نام دل میں نہ ہو تو پھر کون سی جائے پناہ ہوگی!

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۔۔۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کو واضح کر دیجیے کہ یہ حق ہے اور تمہارے ربّ کی طرف سے ہے۔ تم مخلوق ہو، تم تک رزق پہنچانا اس کی شان ہے، وہ اپنی شانِ کریمی سے تم تک روزی پہنچا رہا ہے۔ اسی طرح دینِ حق تمہاری ضرورت تھی اس لیے ربّ کریم نے تمہارے روح کا رزق، غذا، دوا نازل فرمائی ہے بات صرف سمجھنے کی ہے کہ جس طرح ربّ العالمین نے دنیوی نعمتیں بنائی ہیں اُن سے اربوں گنا زیادہ پُرلذت نعمتیں قلب و روح کے لیے، اصل انسان کے لیے بنائی ہیں۔ دنیا کی نعمتیں باد و باراں سے، سورج کی گردش سے پیدا ہوتی ہیں، روح کی نعمتیں انوارات انبیاء سے پیدا ہوتی ہیں، قرآنِ حکیم کی آیات سے پیدا ہوتی ہیں، اس کے احکامات سے پیدا ہوتی ہیں اور بہت قیمتی ہیں۔ کسی نے کہا تھا۔

لذتِ ایں مے بخدا نہ شناسی تا نہ چشید

اللہ کی قسم! جب تک اس کو پیو گے نہیں اس کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ اور ہم ہیں کہ اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، کبھی اسے چکھا ہی نہیں۔ کوئی گھونٹ بھر لیتے تو اس کے دیوانے ہو جاتے۔ اس کی طلب بڑھتی، اور لیتے اور مستفید ہوتے۔ فرمایا: وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۔۔۔ فرما دیجیے، یہ دین، یہ کتاب، یہ بعثتِ عالی صلی اللہ علیہ وسلم، یہ سارا حق ہے اور یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ وہ ربّ العالمین ہے۔ ساری ضرورتیں پوری کرنے والی وہی ذات ہے۔ جس طرح مادّی بدن کی ضرورتیں ہیں کہ ہوا چاہیے، دھوپ چاہیے۔ رات کا اندھیرا ضرورت ہے تو دن کی روشنی بھی چاہیے۔ خشک موسم چاہیے تو برساتیں بھی چاہئیں، غذا بھی چاہیے اور دوا بھی۔ روح کو آرام کرنا ہے تو کام بھی کرنا ہے۔ ظاہری بدن کی ضرورتوں کی طرح روح کی بھی ضرورتیں ہیں۔ جس طرح مادّی دنیا میں سورج کی گردش سے

نہ صرف لیل ونہار کو نہ صرف موسموں کو ہواؤں کے آنے جانے سے وابستہ کر دیا ہے اسی طرح روح کی دنیا کے سورج ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ۔قرآن نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو سراجِ منیر کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم روحانی دنیا کا وہ سورج ہیں جو روشنیاں بانٹتا ہے۔اللہ نے اتنا اہتمام اس لیے کیا کہ وہ ربّ ہے، پروردگار ہے۔

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے قرآن حکیم کے ایک ایک حکم کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے میں تکلیفیں برداشت کیں، انسانوں کی مخالفت برداشت کی، ہجرت فرمائی، جہاد کیے۔صحابہ کرامؓ نے دین کے لیے جانوں کے نذرانے پیش کیے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلّم محنت شاقہ سے اس نعمت کو بانٹتے رہے۔اب یہ لوگوں پر ہے جس کو یہ بات اچھی لگے وہ اس پر ایمان لے آئے۔ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذمہ نہیں ہے کہ کسی پر اسلام مسلط کریں۔اللہ کریم نے یہ نہیں فرمایا کہ جو نہ مانے اس کے خلاف کارروائی کرو۔ نہ یہ فیصلہ کرو کو جو نہیں مانتا اسے زندہ رہنے کا حق نہیں۔دین پہنچانا فریضہ ہے اور یہ تو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا انسانیت پر بہت بڑا احسان ہے کہ دینِ حق ان پر پیش کر دیا۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ ۔۔۔اب جو چاہے ایمان لے آئے اور جو نہیں چاہتا: وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔۔۔وہ کفر کر کے دیکھ لے۔اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۔۔۔جو نہیں مانتا اسے بتا دو کہ نہ ماننے کا انجام یہ ہے کہ ہم نے ظالموں کے لیے آگ کے گھر بنا رکھے ہیں، ان کی رہائش آگ کی ہوگی، دیواریں، چھتیں، فرش اور بستر سب آگ کے ہوں گے۔دنیا کی زندگی تو لمحوں میں ختم ہو جائے گی، اگلا جہان ابدی ہے، ہمیشہ رہنے والی جگہ ہے۔ وہاں اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۔۔۔آگ کی دیواروں نے انہیں گھیرے میں لیا ہوگا۔ چہار اطراف آگ ہی آگ ہوگی۔ جب پیاس سے بے حال ہو کر فریاد کریں گے تو: وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ ۔۔۔انہیں وہ پانی دیا جائے گا جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح کھول رہا ہوگا۔يَشْوِى الْوُجُوْهَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ ۔۔۔منہ کی طرف لے جائیں گے تو منہ کی کھال ادھیڑ کر گرا دے گا اور گھونٹ بھریں گے تو جہاں تک جائے گا ہر چیز کو جلاتا جائے گا۔ پینے کی بہت ہی بری چیز ہوگی۔وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۝ اور رہنے کا کتنا برا ٹھکانہ ہوگا۔

فرمایا، انہیں نہ ماننے کا نتیجہ بھی بتا دیجیے۔کل میدانِ حشر میں کوئی نہ کہے کہ مجھے تو اس کی خبر نہ تھی، میرے ساتھ ایسا کیا ہو گیا۔آج بتا دیجیے کہ دینِ حق پیغامِ حیات ہے، نویدِ حیات ہے، قربِ الٰہی کا سبب ہے، اللہ کی رحمتوں کو پانے کا سبب ہے۔اگر اس پیغامِ حیات کو قبول نہیں کرو گے تو انجام سن لو! دنیوی عیش و آرام موت کے ساتھ ختم ہو جائیں گے، آگے آگ کے در و دیوار والے گھر ہوں گے، تانبے کی طرح پگھلا ہوا، کھولتا ہوا پانی ملے گا جو لبوں تک لے جاؤ گے تو منہ کو جھلسا دے گا، چہرے کی کھال پگھل کر گر جائے گی، کھانا پینا کتنا تکلیف دہ

ہوگا اور وہ رہنے کی کتنی تکلیف دہ جگہ ہوگی!

نیکوں کا نیک انجام:

فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔۔۔ جو مانیں گے وہ نیک انجام کو پالیں گے۔ ساتھ ہی ماننے کی نشانی بھی بتا دی جو مانیں گے ان کا کردار بھی صالح ہوگا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں، میرے پیغام کو، میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، میرے قرآن کو اس نے مانا جس نے اپنا کردار اس کے مطابق کر لیا، اس کا کردار صالح ہو گیا۔ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾ جو احسن عمل کرے، اچھے عمل کرے ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس نے عبادات میں مجاہدہ کیا، حرام چھوڑ کر غریبی قبول کر لی لیکن حلال کمایا، حلال کھایا، تکلیفیں برداشت کر لیں، ناجائز وسائل اختیار نہیں کیے تو۔۔۔؟ فرمایا، نیکی کبھی ضائع نہیں جاتی۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ احسن عمل کیا ہے، حُسنِ عمل کیا ہے؟ سارے کا سارا حسن اللہ جل شانہٗ کی ذات ہے۔ مخلوق میں سارا حسن ذاتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اللہ کا دین احسن ہے، اللہ کی کتاب میں حسن ہے، جس نے اللہ کے دین کو جتنا اپنایا اتنا اس کا کردار روشن ہو گیا۔

دیکھیں! اللہ کریم نے کس انداز سے اتباعِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعوت دی ہے۔ فرمایا، جو کام تم میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق کرو گے وہ حسین تر ہوگا۔ جن کے اعمال حسین، خوبصورت اور دلفریب ہوں گے، ان کے اعمال کو میں ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ ۔۔۔ ہمیشہ رہنے والے باغات، نعمتیں اور جنتیں، ان کا حسن و جمال، ان کا نور انہی لوگوں کے لیے ہے۔ جنت انہی لوگوں کے لیے بنائی گئی ہے۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ ۔۔۔ جن کے تابع نہریں بہتی ہیں۔ جنتی جہاں باغ لگانا چاہے گا، پانی اس کے حکم کے تابع ہوگا اور وہاں پہنچے گا جہاں جنتی چاہے گا۔ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ ۔۔۔ جنت کا سونا مردوں کی زینت ہوگا۔ وہاں سونے کے زیور پہنیں گے۔ یاد رہے! جنت کی ہر نعمت جنت کے لیے خاص ہے۔ دنیا کی نعمتوں سے اندازہ کر کے جنت کی نعمتوں کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ ۔۔۔ باریک اور دبیز سبز ریشم کے لباس پہنیں گے۔ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۔۔۔ جنت کی مسہریوں پر گاؤ تکیے لگائے مزے سے بیٹھے ہوں گے۔ بہترین لباس، بہترین گھر، بہترین محلات، ریشمی پردے، در و دیوار سے ٹپکتا نور، چین سے بیٹھے ہوں گے۔ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾ کیا خوب صورت بدلہ ملا انہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا! کیا خوب جگہ ہے رہنے کی! نہ کسی نعمت کے چھن جانے کا خوف نہ اندیشہ۔

سدا بہار نعمتیں، ہمیشہ ہمیشہ کی جوانی، لذیذ غذائیں، بہترین مشروب، بہترین ٹھکانہ۔ اب یہ لوگوں پر ہے کہ وہ کون سے راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔

زبردستی کسی پر نہیں:

ہمارے ہاں یہ غلط روش رواج پا گئی ہے کہ فلاں کا عقیدہ درست نہیں اسے گولی ماردو۔ یہ اسلام کے حکم کے خلاف ہے، اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ جنت تو اتنی خوبصورت جگہ ہے وہاں زبردستی لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟

اللہ کریم فرماتے ہیں جو دوزخ کی طرف جا رہا ہے اُسے ہمدردی سے بتا دو کہ وہاں کن مصائب کا سامنا کرنا ہوگا۔ جو جنت کی طرف چلنا چاہتا ہے اور راستے میں دشواریاں حائل ہیں تو اس کی ہمت بندھاؤ، کہ یہ مشکلات کچھ نہیں ہیں، جنت کی راحتیں ابدی ہیں اور دنیوی مسائل عارضی ہیں۔ یہ ہے دین کا راستہ یعنی حق بتائیں، اللہ کی رضا کے لیے بتائیں، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم پورا کرنے کے لیے بتائیں اور حق واضح کرتے رہیں۔ اب جو مانے گا اجر پائے گا جو نہیں مانے گا وہ اپنا انجام دیکھ لے گا۔ اس میں زبردستی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ نیکوں کا انجام کیا ہی خوبصورت ہے، کیا بے مثال جگہ ہے، جنت اللہ کی نعمتوں کا بے مثال مجموعہ ہے اور نیکوں نے کیا خوبصورت بدلہ پایا!

سورۃ الکھف رکوع 5 آیات 32 تا 44

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَيۡنِ جَعَلۡنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيۡنِ مِنۡ اَعۡنَابٍ وَّحَفَفۡنٰهُمَا بِنَخۡلٍ وَّجَعَلۡنَا بَيۡنَهُمَا زَرۡعًا ﴿۳۲﴾ كِلۡتَا الۡجَـنَّتَيۡنِ اٰتَتۡ اُكُلَهَا وَلَمۡ تَظۡلِمۡ مِّنۡهُ شَيۡـًٔـا ۙ وَّفَجَّرۡنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۙ ﴿۳۳﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكۡثَرُ مِنۡكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنۡ تَبِيۡدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۙ ﴿۳۵﴾ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰى رَبِّىۡ لَاَجِدَنَّ خَيۡرًا مِّنۡهَا مُنۡقَلَبًا ﴿۳۶﴾ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرۡتَ بِالَّذِىۡ خَلَقَكَ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ سَوّٰٮكَ رَجُلًا ؕ ﴿۳۷﴾ لٰـكِنَّا۟ هُوَ اللّٰهُ رَبِّىۡ وَلَاۤ اُشۡرِكُ بِرَبِّىۡۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَلَوۡلَاۤ اِذۡ دَخَلۡتَ جَنَّتَكَ قُلۡتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنۡ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنۡكَ مَالًا وَّوَلَدًا ۚ ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّىۡۤ اَنۡ يُّؤۡتِيَنِ خَيۡرًا مِّنۡ جَنَّتِكَ وَيُرۡسِلَ عَلَيۡهَا حُسۡبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصۡبِحَ صَعِيۡدًا زَلَقًا ۙ ﴿۴۰﴾ اَوۡ يُصۡبِحَ مَآؤُهَا غَوۡرًا فَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾ وَاُحِيۡطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصۡبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيۡهِ عَلٰى مَاۤ اَنۡفَقَ فِيۡهَا وَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوۡشِهَا وَيَقُوۡلُ يٰلَيۡتَنِىۡ لَمۡ اُشۡرِكۡ بِرَبِّىۡۤ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَلَمۡ تَكُنۡ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنۡصُرُوۡنَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنۡتَصِرًا ؕ ﴿۴۳﴾ هُنَالِكَ الۡوَلَايَةُ لِلّٰهِ الۡحَـقِّ ؕ هُوَ خَيۡرٌ ثَوَابًا وَّخَيۡرٌ عُقۡبًا ﴿۴۴﴾

اوران کے لیے دو شخصوں کا حال بیان کیجیے ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دے رکھے تھے اور ان دونوں کے گرداگرد کھجوروں کے درختوں سے احاطہ بنا رکھا تھا اور ہم نے ان دونوں کے درمیان کھیتی پیدا کردی تھی ﴿۳۲﴾ یہ دونوں باغ اپنا پورا پورا پھل دیتے تھے اور ان کی پیداوار میں ذرا بھی کمی نہ ہوتی تھی اور ان دونوں کے درمیان ہم نے نہر چلا رکھی تھی ﴿۳۳﴾ اور اس (شخص) کو (ان کی) پیداوار ملتی رہتی تھی (ایک دن) جب کہ وہ اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا تو اس سے کہنے لگا کہ میں تم سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور جماعت کے لحاظ سے بھی زیادہ عزت والا ہوں ﴿۳۴﴾ اور اپنے حق میں (ایسی شیخیوں سے) ظلم کرتا ہوا اپنے باغ میں داخل ہوا تو کہنے لگا میں نہیں خیال کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہو ﴿۳۵﴾ اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت برپا ہو گی اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا بھی جاؤں تو وہاں پہنچ کر ضرور اس سے اچھی جگہ پاؤں گا ﴿۳۶﴾ اس کا دوست جو اس سے گفتگو کر رہا تھا کہنے لگا کیا تم اس (ذات) سے کفر کرتے ہو جس نے تم کو (اوّل) مٹی سے پیدا فرمایا پھر نطفہ سے پھر تم کو پورا پورا آدمی بنایا ﴿۳۷﴾ لیکن میں تو کہتا ہوں کہ وہ اللہ ہی میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا ﴿۳۸﴾ اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے یوں کیوں نہ کہا جو اللہ کو منظور ہو وہی ہوتا ہے اللہ کی مدد کے سوا (کسی میں) کوئی قوت نہیں (ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ) اگر تم مجھ کو مال اور اولاد میں اپنے سے کمتر دیکھتے ہو تو ﴿۳۹﴾ تو عجب نہیں کہ میرا پروردگار مجھے تمہارے باغ سے اچھا عطا کر دے اور اس (تمہارے باغ) پر آسمان سے آفت بھیج دے پھر وہ چٹیل میدان ہو جائے ﴿۴۰﴾ یا اس کا پانی بالکل (زمین میں) اندر اتر جائے پس تم اس کو ہرگز نہ لا سکو ﴿۴۱﴾ اور اس کے پھلوں (مال و منال) کو (عذاب نے) آگھیرا پھر اس نے جو اس (باغ) پر خرچ کیا تھا اس پر ہاتھ

ملتا رہ گیا اور وہ (باغ) اپنی چھتریوں پر گرا ہوا (پڑا) تھا اور کہنے لگا اے کاش! میں نے اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا ہوتا ﴿۴۲﴾ اور (اس وقت) اس کے لیے اللہ کے علاوہ کوئی جماعت نہ ہوئی جو اس کی مدد کرتی اور نہ وہ (خود ہم سے) بدلہ لے سکا ﴿۴۳﴾ ایسے موقع پر مدد کرنا اللہ سچے (برحق) ہی کا کام ہے اسی کا ثواب اور اسی کا نتیجہ سب سے اچھا ہے ﴿۴۴﴾

تفسیر و معارف

آخرت یقینی ہے، وہاں کی نعمتیں حقیقی اور دائمی ہیں لیکن اس پر اُسے ہی یقین آتا ہے جو دنیا میں عمل کرتے ہوئے آخرت پر یقین کو فراموش نہیں کرتا۔ دنیادار محض دنیوی مال و دولت اور دنیوی زندگی کو ہی محورِ حیات بنا لیتے ہیں اس لیے وہ دنیا کے دھوکے میں آجاتے ہیں۔

محض دنیوی دولت رضائے باری کی دلیل نہیں:

جس کو دولت مل جائے، تھوڑی سی شہرت مل جائے، عہدہ و اقتدار مل جائے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس دولت بھی ہے، اولاد بھی، عہدہ و اقتدار بھی تو اللہ اس سے بڑا راضی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی خود فریبی ہے۔ حق یہ ہے کہ ایمان نصیب ہو، کردار درست ہو، حلال طریقے سے دولت آئے اور جائز طریقے سے خرچ ہو تو واقعی اس پر اللہ راضی ہے۔ محض دنیا کی دولت اللہ کی رضا کی دلیل نہیں۔ اگر دولت، ناجائز طریقے سے آئے، اقتدار غلط ہتھکنڈوں سے حاصل ہو، حکومت کو بھی خلافِ دین چلائے تو یہ اللہ کی پسندیدگی کی دلیل نہیں۔ اس کا انجام بہت بُرا ہوگا۔

قرآنی تمثیل:

دولت اور ناجائز اقتدار سے وہ افلاس اور بھوک کروڑوں درجہ بہتر ہے جس میں ایمان نصیب ہو۔ لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ایک مثال ارشاد فرمائی: وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ فرمایا، ان کے لیے دو دوستوں کا قصہ بیان کیجیے۔ دونوں دوستوں میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دے رکھے تھے۔ ان

کے گرداگرد کھجوروں کے درخت تھے جو باڑھ کا کام دیتے تھے اور پھل بھی دیتے تھے۔ درمیان میں زرعی زمین تھی یعنی ایک ہی قطعے میں ہم نے ان کی زراعت اور پھلوں کی پیداوار سب اکٹھا کر دیا تھا۔ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۔۔۔ یہ ایسے دو باغ تھے جو پورا، پورا پھل بھی دیتے تھے۔ ہر سال کھجور کے درخت پھل سے لد جاتے، انگوروں کی بیلیں پھل سے جھکی رہتیں اور کھیت بھر پور فصل دیتے ہیں۔ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ ان کے درمیان ہم نے نہر چلا رکھی تھی۔ دونوں کناروں پر دو باغ تھے، درمیان میں نہر جاری تھی۔ دونوں باغوں میں گرداگرد انگوروں کے پودے تھے، اُن کے گرد کھجور کے درخت تھے، درمیان میں کھیتیاں تھیں۔ وہ کھیتی باڑی میں خوش رہتا وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۔۔۔ ہر سال بہترین فصلیں حاصل ہوتیں، غلّہ بھی مل جاتا اور پھل بھی۔ کسی چیز میں کمی نہ ہوتی تھی لیکن وہ اللہ کی نعمتوں کو ذاتی بڑائی سمجھتا تھا اور شیخیاں بگھارتا تھا۔ ایک دن وہ اسی غرور وتکبر میں اپنے دوست سے کہنے لگا: فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ ۔۔۔ تم تو خود کو اللہ کا ماننے والا کہتے ہو، تم اللہ پر ایمان لائے ہو، آخرت پر ایمان رکھتے ہو، نبیؐ کو مانتے ہو، اللہ کی کتاب کو مانتے ہو تو پھر یہ ساری نعمتیں تو تمہارے پاس ہونی چاہیے تھیں، تم میری طرح مالدار کیوں نہیں ہو؟ میں تو مانتا بھی نہیں ہوں۔ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا ۔۔۔ پھر بھی میں کتنا مالدار ہوں، میرے ہاں دولت کی کتنی فراوانی ہے۔ وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾ اور میرے پاس افرادی قوت بھی بہت زیادہ ہے۔ میرے بیٹے، ساری اولاد، گھر والے، ملازم، خدمت گار سب کی تعداد گننے میں نہیں آتی۔ میں تو ہر لحاظ سے عزت دار ہوں اور تم پر فوقیت رکھتا ہوں۔ اگر تو مسلمان ہے حق پر ہے، اللہ کا پسندیدہ بندہ ہے تو یہ نعمتیں تیرے پاس کیوں نہیں ہیں؟ میرے مقابلے میں تُو مفلسِ محض ہے۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ ۔۔۔ اسی طرح اکڑتا اور شیخیاں بگھارتا ہوا اپنے باغ میں داخل ہوا۔ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۔۔۔ یہ سارا ظلم وہ اپنے آپ پر کر رہا تھا۔ دولتِ دنیا پر اِترانا خود اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے۔ اسی طرح غرور کرتا ہوا اپنے دوست سے کہنے لگا: قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ میں تو یہ خیال ہی نہیں کرتا کہ یہ باغات، یہ پھلدار درخت، ان میں قطعہء اراضی، درمیان میں بہتی یہ نہر تباہ ہو جائیں گے۔ ایسا نہیں ہوگا، یہ ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے۔ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۔۔۔ میں نہیں سمجھتا کہ قیامت وغیرہ آئے گی۔ یہ باتیں تو غریب لوگوں نے تسلی دینے کے لیے گھڑ رکھی ہیں کہ دنیا میں اگر حرام سے بچنے کے لیے تکلیفیں اٹھانا پڑ رہی ہیں تو کیا ہوا ہم اللہ کی فرماں برداری کرتے رہیں گے کہ اس نے نیکی پر

نیک انجام کا وعدہ کر رکھا ہے۔ وہ ہمیں آخرت میں انعام دے گا۔ کہنے لگا، غریب لوگوں نے دل کو تسلی دینے کے لیے ایسے افسانے بنا رکھے ہیں۔ کہاں کی قیامت!

وَّلَئِنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰى رَبِّىۡ لَاَجِدَنَّ خَيۡرًا مِّنۡهَا مُنۡقَلَبًا ﴿۳۶﴾ بفرضِ محال، مجھے اپنے پروردگار کے پاس جانا ہی پڑا تو جس طرح مجھے یہاں دولت سے نوازا گیا ہے وہاں بھی سب کچھ مجھے ہی ملے گا اور بہتر ملے گا۔ یہاں بھی تو تم مجھے کہتے ہو کہ یہ پروردگار کا جہان ہے، ہر نعمت وہی دیتا ہے تو جب اس نے مجھے یہاں بے شمار نعمتیں دے رکھی ہیں تو وہاں بھی وہ مجھے ہی دے گا۔ اگر کوئی اللہ ہے کوئی قیامت ہے اور ہمیں مر کر اس کے پاس جانا ہی ہے تو وہاں بھی وہ مجھ ہی کو دے گا، تمہیں نہیں دے گا۔ جس نے تمہیں یہاں دولت نہیں دی وہ تمہیں وہاں کیسے دے گا؟ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ۔۔۔ اس کا دوست جو اس سے گفتگو کر رہا تھا، اس کی بات سن کر کہنے لگا: وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرۡتَ بِالَّذِىۡ خَلَقَكَ مِنۡ تُرَابٍ۔۔۔ کیا تم اس پروردگار کی عظمت کا انکار کرتے ہو جس نے تمہیں مٹی سے بنایا ہے۔ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ۔۔۔ وہ ایسا کاریگر ہے جس نے خاک کو غذا کا روپ دیا۔ تیرے والد نے خوراک کھائی، اس سے کشید کر کے نطفہ بنا کر تیرے باپ کی پشت میں رکھا، پھر ماں کے پیٹ میں رکھا۔ ثُمَّ سَوّٰٮكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ پھر تجھے ننھا مُنا، بے بس سا بچہ پیدا کر کے اتنا کڑیل جوان بنایا۔ جس ہستی کی تم پر اتنی نعمتیں، اتنی رحمتیں ہوں، تُو اس کی عظمت کا انکار کر رہا ہے۔ تُو ہے کیا؟ اپنی حیثیت دیکھ، مشتِ غبار تھا، اللہ کریم نے اسے مٹی کے مختلف روپ دیے۔ کہیں غذا، کہیں دوا، کہیں تیرے والدین کی غذا بنائی۔ باپ کی پشت میں رکھا، باپ کے نطفے سے تجھے پیدا کیا، تو کمزور سا بچہ تھا پھر اتنی قوت دی کہ آج تو بھرپور جوان ہے پھر بھی اس کی عظمت کا انکار کر رہا ہے!

اقرارِ توحید، ضمانتِ فلاح:

اللہ کے نیک بندے نے اس نافرمان سے کہا: لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّىۡ وَلَاۤ اُشۡرِكُ بِرَبِّىۡۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ لیکن مجھے دیکھ، میں کہتا ہوں، وہی میرا پروردگار ہے۔ میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ میں اسے وحدہٗ لاشریک مانتا ہوں۔ تجھے تو اللہ کی نعمتوں کو پا کر کلمۂ شکر ادا کرنا چاہیے تھا۔ وَلَوۡلَاۤ اِذۡ دَخَلۡتَ جَنَّتَكَ قُلۡتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۔۔۔ تو جب اپنے باغ میں داخل ہوا تھا تو تُو نے کیوں نہ کہا کہ ساری طاقت اللہ کی ہے جو چاہے وہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری طاقت نہیں جو چیزوں کو بدل دے۔ اِنۡ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنۡكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۳۹﴾ اگر تیرا یہ خیال ہے کہ تیرے پاس مال و دولت زیادہ ہے تو اس پر شکر کر، تو اترا

رہا ہے، کفر کر رہا ہے۔ تجھے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے تجھے زیادہ نعمتیں دیں، راحتیں دیں۔ تجھے تو کہنا چاہیے تھا کہ اے اللہ! سب کچھ تیرا ہے، تُو ہی جسے چاہے دے سکتا ہے، جو تُو چاہے وہی ہوتا ہے کوئی دوسری طاقت نہیں جو تیرے مقابلے میں کچھ کر سکے۔

اللہ قادرِ مطلق ہے:

فرمایا: فَعَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یُّؤْتِیَنِ خَیْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَیُرْسِلَ عَلَیْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِیْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ اللہ تو قادر ہے کہ میرے ان باغوں کو تیرے باغوں سے زیادہ بہتر بنا دے۔ یہ جو تُو اپنی طاقت پر اترا رہا ہے تو اپنے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ اللہ قادر ہے کہ میرے باغ بہترین بنا دے، تیرے باغوں سے زیادہ پیداوار دینے لگیں اور تیرے باغات پر کوئی آسمانی مصیبت بھیج دے اور وہ چٹیل میدان ہو جائے۔ اَوْ یُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِیْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾ یا تیری اس نہر کو خشک کر دے، زمین میں نابود کر دے گویا یہاں کبھی پانی تھا ہی نہیں۔ تیری کیا جرأت ہے کہ تو پھر یہاں پانی لا سکے۔

پھر وہی ہوا۔ وَاُحِیْطَ بِثَمَرِهٖ۔۔۔ اللہ کریم نے اس کے تمام باغات پر عذاب بھیج دیا، تمام پھل تباہ ہو گئے۔ فَاَصْبَحَ یُقَلِّبُ كَفَّیْهِ عَلٰی مَآ اَنْفَقَ فِیْهَا وَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا۔۔۔ جو کچھ اس نے باغوں پر خرچ کیا تھا اس کے ضائع ہونے پر اپنے ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اس کا باغ اجڑ چکا تھا، وہاں خاک اڑ رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر کہنے لگا: وَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّیْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ کاش! میں نے اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا ہوتا۔ کاش! میں نے شرک نہ کیا ہوتا۔ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾

پھر اسے کوئی طاقت نہ ملی جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کرتی، اس کے باغات کو درست کر دیتی، اس کی طاقت وحشمت بحال کر دیتی۔ کون تھا جو اللہ کے مقابلے میں یہ کرتا؟ اور نہ ہی وہ خود اس قابل تھا۔

بادشاہی صرف اللہ کی ہے:

فرمایا: هُنَالِكَ الْوَلَایَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ۔۔۔ لوگو! ایسی مثالوں سے دنیا بھری ہوئی ہے۔ ساری مثالیں بتاتی ہیں کہ بادشاہی صرف اللہ کی ہے۔ یہی حق ہے کہ اس کی بادشاہی کو زوال نہیں۔ کوئی دوسرا اس جیسا نہیں، کسی دوسرے کو اختیار نہیں۔ یہ بات حق ہے، واضح ہے اور تمہارے سامنے کھلی ہوئی ہے۔ تم انقلاباتِ زمانہ دیکھ رہے ہو۔ بڑی عظیم

عمارات کے کھنڈرات بتاتے ہیں کہ کتنے طاقتور شہنشاہوں کی حکومت تھی، قلعوں کے درودیوار بتاتے ہیں کہ کیسے پُرشکوہ حکمران تھے پھر کہاں گئے وہ لوگ، کہاں گیا اُن کا کرّوفر؟ کہاں ہیں ان کے لاؤلشکر اور وہ افواج، کہاں ہیں وہ خود جو اپنے آپ کو شہنشاہ کہلواتے تھے؟ کتنے حکمران آئے جو اعلان کرتے تھے کہ ان کی کرسی بہت مضبوط ہے، دیکھتے دیکھتے وہ سب بھی قبروں میں اتر گئے جن کا دنیا میں طوطی بولتا تھا۔

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَخَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿٤٤﴾ اچھا نتیجہ، اچھا بدلہ اور اچھا انجام اللہ کی عظمت کو مان لینے میں ہے۔ بندہ اپنی حیثیت دیکھے تو اس کا اپنا وجود ہی بتاتا رہتا ہے کہ اس کی حقیقت وحیثیت کیا ہے۔ کبھی تنومند جوان تھے، پہاڑوں، وادیوں، گھاٹیوں کو عبور کرجاتے تھے اور کچھ مشکل نہ تھا۔ بیسیوں بار پہاڑوں پر چڑھتے، اترتے، شکار کرتے، بھاگتے دوڑتے تھے۔ آج منبر تک آنے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ کہاں گئی وہ جوانی، کہاں وہ طاقت وقوت؟ اگر انسان اپنے وجود ہی کو دیکھ لے تو اسے پتا چل جاتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اللہ اکیلا مالک ہے، ایسا بادشاہ ہے جس کی بادشاہت کو زوال نہیں۔ جس کی قدرت وطاقت ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گی۔

اللہ کی عظمت کو قبول کرلو، دونوں عالم سنور جائیں گے:

جب ہر کمال کو زوال ہے تو کیوں نہ آج اس کی عظمت کو قبول کرلیں۔ یہ سارا رکوع اسی موضوع پر ہے کہ اللہ کی عظمت کو قبول کرلو، دونوں عالم سنور جائیں گے۔ دونوں جگہ راحت اور سکون پاؤ گے۔ نہیں مانو گے تو بہت مشکل ہوگی، بہت مصائب سہنا پڑیں گے۔ یہاں سے تو گزر جائیں گے وہاں بہت تکلیف دہ زندگی ہوگی۔ لوگ مرنا چاہیں گے لیکن موت نہیں آئے گی۔ جہنم ٹھکانہ ہوگا جو بہت تکلیف دہ جگہ ہے۔

اللہ کریم نے ساری حقیقت کھول کر رکھ دی ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے پیغام الٰہی پہنچانے کا حق ادا کردیا۔ خوش نصیب لوگ قیامت تک اللہ اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا پیغام آگے پہنچاتے جائیں گے۔ اپنی ذات کو شریعتِ مطہرہ کے دائرے میں لانے کے لیے مسلسل مجاہدہ کرتے رہیں گے اور زبانی بھی پہنچاتے رہیں گے۔ بڑے خوش نصیب ہوں گے وہ لوگ جو سن کر قبول کرتے جائیں گے۔ اور بدنصیب ہیں وہ جنہیں قبول کرنا نصیب نہ ہوا۔ وہ اپنے انجام پر پچھتائیں گے۔

اللہ کریم ایمان وعملِ صالح کی توفیق عطا فرمائیں، ایمان وعمل پر خاتمہ نصیب فرمائیں اور اپنے نیک بندوں کے ساتھ حشر نصیب فرمائیں۔

سورۃ الکھف رکوع 6 آیات 45 تا 49

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۢ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

اور ان سے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کیجیے (وہ ایسی ہے) جیسے پانی جس کو ہم نے آسمان سے برسایا تو اس کے ساتھ زمین کو روئیدگی مل گئ پھر وہ چورا چورا ہو گئی کہ ہوائیں اسے اڑائے پھرتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتے ہیں ﴿۴۵﴾ مال اور بیٹے (اولاد) دنیا کی زندگی کی رونق ہیں اور باقی رہنے والے نیک اعمال آپ کے پروردگار کے نزدیک ثواب کے لحاظ سے بھی اچھے ہیں اور امید کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں ﴿۴۶﴾ اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے (ہٹا دیں گے) اور تم زمین کو ایک کھلا میدان دیکھو گے اور ان (لوگوں) کو ہم جمع کریں گے تو ان میں سے کسی

کو بھی نہیں چھوڑیں گے ﴿۴۷﴾ اور سب کے سب آپکے پروردگار کے روبرو صف باندھ کر پیش کیے جائیں گے (ارشاد ہوگا) بے شک تم ہمارے پاس ویسے ہی آ گئے جیسا ہم نے تم کو پہلی بار پیدا فرمایا تھا بلکہ تمہارا خیال تو یہ تھا کہ ہم نے تمہارے لیے (قیامت کا) کوئی وقت مقرر ہی نہیں فرمایا ﴿۴۸﴾ اور (اعمال کی) کتاب (کھول کر) رکھی جائے گی تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ اس میں جو کچھ (لکھا) ہوگا اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے وائے شامت! یہ کیسی کتاب ہے نہ چھوٹی بات (گناہ) کو چھوڑتی ہے اور نہ بڑی بات کو مگر اسے لکھ رکھا ہے اور جو عمل کیے ہوں گے سب کو حاضر پائیں گے اور آپ کا پروردگار کسی پر زیادتی نہیں کرے گا ﴿۴۹﴾

تفسیر ومعارف

دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کے حقیقی اور دائمی ہونے کا تذکرہ جاری ہے۔ فرمایا جارہا ہے کہ تمہارے سامنے حیاتِ دنیا ہے۔ دیکھتے دیکھتے کتنی قومیں عروج پر آئیں اور ایسا لگتا تھا کہ کبھی زوال پذیر نہیں ہوں گی لیکن آج ان کا تذکرہ تاریخ کے صفحات میں ہی ملتا ہے۔ کتنے لوگ تمہارے ہاتھوں میں پلے بڑھے، جوان ہوئے اور پھر تمہاری نظروں کے سامنے خاک میں مل گئے۔ کتنے عزیز واقارب، خاندان کے کتنے بزرگ تھے جو صاحبِ مال بھی تھے، صاحبِ عزت بھی، کس شان سے رہتے تھے! کہاں ہیں وہ آج؟ کیا مال وزر ساتھ لے گئے؟ کون سا مکان انہیں رہنے کو ملا؟ وہی ساڑھے چار ہاتھ کی قبر اور وہی ایک ٹکڑا کفن کا!

فرمایا: وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ ۔۔۔ دنیا کی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسی آسمان سے بارش نازل ہوتی ہے، بادل برستے ہیں اور جل تھل ہو جاتا ہے۔ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ ۔۔۔ ان بارشوں کے ساتھ زمین کو روئیدگی مل جاتی ہے۔ کروڑوں، اربوں تنکے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر تنکا گل بکف ہوتا ہے، اس پر پھول کھلا ہوتا ہے۔ جنگلوں اور صحراؤں میں سبزے کی چادریں بچھ جاتی ہیں، کہیں پھولوں کے تختے نظر آتے ہیں۔ ہر پھول کا رنگ اپنا اور خوشبو اپنی ہوتی ہے، ذائقہ اور اثر بھی جدا ہوتا ہے۔ فَاَصۡبَحَ هَشِيۡمًا تَذۡرُوۡهُ الرِّيٰحُ ۔۔۔ تمہارے دیکھتے دیکھتے پھر خزاں آجاتی ہے۔ پھول چورا چورا ہو جاتے ہیں، نہ کوئی سبزہ باقی رہتا ہے نہ پھول۔ ہوا کے بگولے ان کے ذرات کو اڑائے پھرتے ہیں۔ تمہارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ بہاریں

کیسے پھول کھلتے ہیں، درخت سرسبز ہو جاتے ہیں اور خزاں آتی ہے تو سارا سبزہ خشک ہو جاتا ہے، پتے جھڑ جاتے ہیں، درخت ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝ اللہ کریم ہر چیز پر قادر ہیں۔ کسی کو مہلت دے دیتے ہیں، اقتدار دے دیتے ہیں، سلطنت دے دیتے ہیں اور پھر انجامِ کار نہ وہ سلطنت رہتی ہے نہ اقتدار حتیٰ کہ ضعفِ پیری آلیتا ہے اور پھر موت آجاتی ہے۔

اللہ کریم ہر چیز پر قادر ہیں۔ جس تنکے کو چاہیں گُل بکف کر دیں اور جب چاہیں کھلے ہوئے پھولوں کو خشک کر کے خاک میں ملا دیں۔

انسانی زندگی کی مثال بھی یہی ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو اتنا بے بس کہ یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ اسے بھوک لگی ہے یا پیاس۔ اسے کہیں درد ہے یا تکلیف، مائیں سنبھالتی ہیں۔ والدین سنبھالتے ہیں پھر اللہ اسے جوان اور طاقتور کر دیتے ہیں۔ وہ دولت کما لیتا ہے، اقتدار پا لیتا ہے لیکن کیوں یاد نہیں رکھتا کہ کل وہ ایک بے بس و بے کس بچہ تھا اور آنے والے کل وہ ایک میّت ہوگا، ایک مردہ جسم ہوگا۔ درمیان میں جو مہلت ملتی ہے تو انسان یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ اس فرصت سے فائدہ اٹھاؤں اللہ کی اطاعت کروں۔ اللہ کریم کو راضی کر لوں۔ یاد رہے! درخت، گھاس، پھول، پھل آ کر ختم ہو جاتے ہیں انہیں کہیں جواب تو نہیں دینا لیکن اے انسان! تجھے تو جواب دینا ہے زندگی کا حساب دینا ہے، تجھے اللہ کے روبرو کھڑا ہونا ہے تو تیرے پاس یہ جو تھوڑی سی فرصت ہے اس میں اللہ کی اطاعت کیوں نہیں کرتا؟ فرمایا: اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔۔۔ یہ دولت، یہ دنیا، یہ اولاد، یہ بیٹے، یہ بھائی، یہ زورِ بازو، یہ برادری، اس کی قوت، یہ پارٹیاں، یہ طاقت سب دنیا کا دکھاوا ہے اور کچھ نہیں۔ چند روزہ زندگی ہے۔

تم نے وہ نہیں دیکھے جن کے پاس بڑے بڑے لاؤ لشکر تھے اور جنہوں نے ملکوں پہ ملک فتح کر لیے تھے۔ امیر تیمور کہاں وسط ایشیاء سے اُٹھ کر دہلی تک اور ایشیائے کوچک تک گیا اور اس نے کتنے ملکوں کو تاراج کیا۔ وہ خود اپنی سوانح میں لکھتا ہے کہ میرے خیال کے مطابق میری جنگوں کے نتیجے میں دو کروڑ انسان قتل ہوئے اس زمانے میں جب لوگ تلوار سے لڑتے تھے تو تعداد دو کروڑ تھی۔ آج تو آسمان سے بم گرائے جاتے ہیں اور لاکھوں لوگ مر جاتے ہیں۔ ایٹم بم گرائے جاتے ہیں اور آبادیاں خاک میں مل جاتی ہیں لیکن جس زمانے میں تلوار سے لڑائی ہوتی تھی اس زمانے میں وہ لکھتا ہے کہ میری جنگوں میں دو کروڑ انسان قتل ہوئے۔ غضبناک ایسا تھا کہ ستر سال کی عمر میں اسے ملک چین کی کسی بات پر غصہ آیا تو اس پر چڑھائی کرنے کے لیے چل پڑا۔ راستے میں تھا کہ اسے سکتہ ہو گیا۔ سکتہ ایسی بیماری ہے کہ بندے کے ہوش و حواس، قویٰ سارے زائل ہو جاتے ہیں، سن رہا ہوتا ہے، دیکھ نہیں رہا ہوتا، بات سمجھ رہا ہوتا ہے لیکن بول نہیں سکتا، بتا نہیں سکتا۔ جس بندے نے دو کروڑ انسان غارت کیے وہ ایک میّت کی شکل میں پڑا

ہے۔ طبیب کان میں بتا رہے ہیں کہ آپ کو سکتہ ہو گیا ہے، وہ نہ بول سکتا ہے نہ کچھ کر سکتا ہے۔ اسی سکتے میں ایک ہفتے کے اندر اندر مر گیا۔ دو کروڑ انسانوں کو قتل کرنے کی بجائے کاش اُس نے دو انسانوں کی زندگی بچالی ہوتی! اللہ نے اسے طاقت دی تھی اسے اطاعتِ الٰہی پر خرچ کرتا، ملکی انتظام پر خرچ کرتا، امن قائم کرتا۔ آج کوئی ہے جو اس سے جا کر پوچھے ان کاموں کا کیا نتیجہ ہوا؟ پتا تو اب چلے گا کہ کتنے خون اس کے دامن پر ہوں گے اور کیا جواب دے گا؟ دنیا میں بڑے بڑے لوگ آئے دنیا فتح بھی کی، تحریکیں بھی چلائیں، حکومتیں بھی کیں۔ یہیں برصغیر میں دیکھ لو۔ وسط ایشیاء سے آ کر مغلوں نے اسے فتح کیا۔ صدیوں اس پر حکومت کی اور اس زمانے میں کی جب جدید ذرائع نقل وحمل نہ تھے دہلی میں بیٹھ کر بنگال سے کابل تک اور ہمالیہ سے دکن تک ان کی سلطنت تھی۔ اس وقت نہ کوئی تار تھی نہ ٹیلی فون تھا نہ کوئی گاڑی تھی نہ موٹر سب سے تیز سواری گھوڑا ہی تھا۔ پھر بھی انہوں نے ایسا انتظام کیا کہ پوری حکومت پر ان کا مکمل کنٹرول تھا لیکن بالآخر ختم ہو گئے۔ دنیا کی زندگی عارضی ہے زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔۔۔ چندروزہ ہے جب تک دم میں دم ہے یہ تمہاری زینت ہے۔ یہ دعویٰ بھی تب تک ہے جب تک دنیا میں ہو کہ فلاں بڑا دولت مند ہے، دلیر ہے، طاقتور ہے، صاحبِ اقتدار ہے۔ آنکھ بند ہوئی تو ہر چیز ختم۔ قبر میں تمہیں یکا و تنہا ہی جانا ہے جیسے شکمِ مادر سے یکہ و تنہا پیدا ہوئے تھے۔ ویسے ہی خالی تنہا اور بے بس قبر میں گاڑ دیے جاؤ گے۔ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾ ہاں! اگر تم نے اللہ کی اطاعت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کر لیا تو یہ باقیات الصالحات ہیں ان کا ثواب تمہیں ملتا رہے گا۔ نیک اجر ملتا رہے گا، یہ باقی رہنے والے اعمال ہیں۔ یہ نیکیاں باقی رہنے والی ہیں۔ اگر کسی نے کوئی نیک کام شروع کیا تو جتنے لوگ وہ نیکی کریں گے اور جب تک کرتے رہیں گے جتنا اُن کو ثواب ملے گا۔ اتنا اس اکیلے کو ملتا رہے گا۔ جس نے برائی شروع کی اور وہ لوگوں میں پھیل گئی تو جب تک لوگ برائی کرتے رہیں گے جتنی سزا ان کی ہے اتنا عذاب اس اکیلے کو ملتا رہے گا۔ یہ انتخاب کرنا بندے کا کام ہے۔

باقیات الصالحات:

باقیات الصالحات کے بارے علمائے حق لکھتے ہیں کہ اس میں اولاد بھی شامل ہے۔ اگر والدین نے اولاد کی تربیت کی، انہیں نیکی بدی کی تمیز دی، انہیں اللہ کی عظمت سے آشنا کیا، انہیں صداقتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے آشنا کیا۔ اور والدین کی وفات کے بعد بھی انہوں نے اللہ کی اطاعت کی، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تو اس اطاعت کا ثواب والدین کو بھی ملتا رہے گا۔ وہ باقی رہنے والی نیکیاں ہیں۔ نیک اعمال اور نیک اولاد اس کا اجر انہیں ملتا رہے گا۔ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا ۔۔۔ فرمایا، وہ تمہارے پروردگار کے نزدیک بہترین اجر کا، بہترین بدلے کا، ثواب کا بہترین انعام کا ذریعہ ہیں۔ وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾ اور نیک اُمید ہیں، بہتر امید ہیں، ان سے اچھی امید کی جا سکتی

ہے۔ تم جو نیکیاں باقی چھوڑ جاتے ہو یا نیک صالح اولاد چھوڑ جاتے ہو تو وہ ایک نیک امید ہے، بھلائی کی امید ہے کہ ان کی وجہ سے فائدہ ہوگا۔

حشر ہوگا:

باقی رہی شوکتِ دنیا تو اگر تم نے اللہ کی اطاعت نہ کی اور اپنے اس گھمنڈ میں اور اپنے زُعم میں گزر گئے تو کیا ہوگا؟ ایک وقت آئے گا۔ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ ۔۔۔ کہ صدیوں سے ساکت وجامد کھڑے یہ پہاڑ چل پڑیں گے۔ ہمالہ جیسی چوٹیاں جو جب سے بنی ہیں جم کر کھڑی ہیں۔ تم دیکھو گے کہ یہ چلنے لگ جائیں گی یہ ڈگمگا جائیں گی۔ ادھر والی اُدھر چل پڑے گی۔ اُدھر والی ادھر چل پڑے گی۔ حتیٰ کہ آپس میں ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو کر خاک ہو جائیں گی۔ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً ۔۔۔ زمین کو ایک کھلا میدان دیکھو گے۔ کوئی اس میں نشیب رہے گا نہ فراز۔ ساری زمین کو جھنجھوڑ کر بدل دیا جائے گا اس دن زمین کو بدل کر ایک دوسری زمین بنا دیا جائے گا۔ زمین کے باسی زندہ ہو کر دیکھیں تو کہیں گے، کہاں گئے وہ کوہ ودمن، برف سے بھری پہاڑوں کی وہ چوٹیاں، سبزے سے لدی وادیاں، کہاں گئیں وہ بہاریں اور کہاں گئے وہ چشمے اور دریا، کہاں گئیں وہ نہریں اور کھیتیاں، کہاں گئے وہ سرسبز میدان؟ کچھ باقی نہ بچے گا صرف ایک چٹیل میدان ہوگا کوئی بھی نیچی اونچی جگہ نہیں رہے گی۔ سب برابر کر کے میدان بنا دیا جائے گا۔ وَحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا﴿٤٧﴾ سب لوگوں کو ہم وہاں اکٹھا کریں گے، کسی ایک فرد کو پیچھے نہیں چھوڑیں گے۔ ساری مخلوق جو آدم علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر قیامِ قیامت تک اپنے اپنے زمانے میں گزر چکی ہوگی وہ اُس ایک لمحے میں ساری اس میدان میں حاضر ہو جائے گی۔ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ۔۔۔ اور آپ کے پروردگار کے سامنے صف در صف سب کو پیش کر دیا جائے گا۔ انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام ہوں گے، اُن کی امتیں ہوں گی، اُن کے متبعین ان کے ساتھ صف در صف کھڑے ہوں گے۔ دوسری طرف کفار ومشرکین کی قیادت ہوگی، اُن کا اتباع کرنے والے، اُن کے ساتھ صف در صف کھڑے ہوں گے۔ نبی اکرم صلی علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب یہ صفیں بنیں گی تو مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم (سنن ابو داؤد) اس کا مفہوم ہے کہ جس نے جس قوم کی مشابہت اختیار کی وہ ان ہی میں ہوگا یعنی یہ کہ تم لباس اور حلیے کو شکل وشباہت کو اسلامی تشخص نہیں دینا چاہتے۔ ویسا بنانا چاہتے ہو جیسا دنیاداروں کا حلیہ ہے خواہ وہ کافر ہی ہوں تو یاد رکھو جس دن صفیں بنیں گی تو جس کا جس قوم کے ساتھ حلیہ ملتا ہوگا اس کو اس قوم کی صف میں کھڑا کیا جائے گا۔ آج تو ہم کافروں جیسا لباس پہننا اور ان جیسا

حلیہ بنانا تہذیب کی علامت سمجھتے ہیں، اس میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں عزت ہے، مسلمانوں کی طرح ہوگا تو کون پوچھے گا۔ فرمایا جب پوچھنے کا دن آئے گا تو جس بندے کا جو حلیہ ہوگا اسے اسی صف میں کھڑا کیا جائے گا۔ اس انجام تک پہنچانے والے کون سے عوامل ہوں گے؟ اس کی وضاحت حدیثِ مبارکہ میں آ گئی۔

علامہ ابنِ خلدون رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی تصنیف 'مقدمہ' میں لکھتے ہیں کہ بندہ اپنے حلیے میں جس شخص یا جس قوم کی پیروی کرتا ہے جس قوم جیسا حلیہ بناتا ہے اُس قوم کے بہت سے عیب اس کی نظروں میں بھلائیاں بن جاتے ہیں، خوبیاں بن جاتے ہیں۔ اگر ان کی برائیاں دیکھتا تو ویسا حلیہ نہ بناتا۔ جب حلیہ قبول کرتا ہے تو اُن کی بہت سی برائیاں اُس کی نظر سے اوجھل ہوجاتی ہیں وہ آہستہ آہستہ اپنی زندگی کے کاموں میں بھی اُن کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ اس وضاحت سے اِس ارشادِ رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی سمجھ آتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے کفار کی مشابہت اختیار کرنے سے کیوں منع فرمایا۔ اور اتنی بڑی وعید سنائی کہ جو جیسا حلیہ بنائے گا انہیں کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ صرف حلیہ بنانا اتنا بڑا جرم تو نہیں تھا لیکن انسانی مزاج ہے۔ جیسا حلیہ وہ بناتا ہے ویسی عادتیں بھی وہ اپنا لیتا ہے۔ اور اس کا کردار بھی اسی میں ڈھل جاتا ہے۔ اگر کوئی علماء جیسا حلیہ بناتا ہے تو اسے رفتہ رفتہ علم سے شغف ہوجاتا ہے۔ وہ اس طرف چل پڑتا ہے اس کا میلان نیکی کی طرف ہوجاتا ہے۔ جو نیکوں جیسا حلیہ بناتا ہے، نیکی کی طرف چل پڑتا ہے۔ بدکاروں جیسا بناتا ہے تو اسی طرف چل پڑتا ہے۔ یہ انسانی مزاج ہے اور علامہ ابن خلدون نے اپنی تصنیف 'مقدمہ' میں اس پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے بلکہ انہوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ دیہاتی اور بدّوی لوگ جب شہری زندگی اختیار کر لیتے ہیں تو ان کے بہت سے اوصاف جو بدّوی زندگی میں نظر آتے تھے وہ شہر منتقل ہوجانے سے ختم ہوجاتے ہیں۔ اُن کا کردار ویسا نہیں رہتا۔ بدّوی زندگی میں دیہات میں جب تک رہتے ہیں تو تنومند ہوتے ہیں، صحت مند ہوتے ہیں، اُن کا ایک کردار ہوتا ہے۔ کردار میں پختگی ہوتی ہے۔ اسی دیہاتی کو دیہاتی زندگی چھوڑ کر شہر میں بسا دو تو نفسا نفسی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ کسی کو پتا نہیں ہوتا، ایک گھر میں شادیانے بج رہے ہوں تو خواہ دوسرے گھر میں موت ہوگئی ہو۔ ایک گھر والے خوش گپیاں لگا رہے ہوتے ہیں خواہ دوسرے کسی گھر میں کوئی حادثہ ہوجائے۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی ایسی بیگانگی وہ چیز ہے جو قوموں کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے بہت سی مثالیں دی ہیں۔ ایک عجیب مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ کسی مرغی کو اونٹ کا گوشت چھوٹے چھوٹے ریزے کر کے تھوڑا تھوڑا روز کھلانا شروع کر دو۔ وہی مرغی جتنا انڈہ پہلے دیتی ہے اونٹ کے گوشت کی وجہ سے وہ اس سے بہت بڑا انڈہ دینا شروع ہوجائے

گی۔ مرغی تو وہی ہے، اس کی جسامت بھی وہی ہے لیکن جتنا انڈہ پہلے دے رہی ہے اس سے بہت بڑا انڈہ دے گی۔ تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اس طرح جب تم کسی قوم کا کردار اپناؤ گے تو نتیجہ وہی ہوگا کہ تم بھی ویسے ہی ہو جاؤ گے۔ اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم (سنن ابوداؤد) کہ جس قوم کی مشابہت اختیار کرو گے۔ میدانِ حشر میں جب صفیں بنیں گی، جب آپ کے پروردگار کے سامنے انہیں صف در صف پیش کیا جائے گا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں۔ جس کی جس قوم سے مشابہت ہوگی وہ اسی کی صف میں کھڑا ہوگا اور ارشاد ہوگا: لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ۔۔۔ لوگو! تم تو ویسے ہی خالی ہاتھ آ گئے جیسا خالی ہاتھ میں نے تم کو پیدا کیا تھا۔ کہاں گیا تمہارا اقتدار، مال و دولت، لاؤ لشکر، قوم برادری کا جتھا جس پر تم نازاں تھے اور جس پر تم نے اللہ کی اطاعت بھی چھوڑ دی اور مخلوق پر ظلم کرتے رہے۔ آج وہ کرّ و فر اور شان و شوکت کہاں؟ تم تو ویسے ہی آ گئے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے، خالی ہاتھ۔ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾ بلکہ تمہارا دنیا میں تو یہ خیال تھا کہ یہ آخرت کا وعدہ ویسے ہی ایک بات ہی ہے۔ کہاں قیامت ہوگی اور کون دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ اور کہاں جزا و سزا؟ تم کہتے تھے یہ ویسے ہی مولویوں نے باتیں گھڑ رکھی ہیں۔ یہ ہر کام میں بندے کو بے لذت کرتے ہیں اور زندگی کو بے لطف کر دیتے ہیں، ہر وقت موت کی اور قبر کی اور آخرت کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب قصے کہانیاں ہیں، مر گئے، ہڈیاں چورا چورا ہو گئیں، گوشت مٹی کھا گئی پھر کون زندہ ہوگا؟ فرمایا، بَلْ زَعَمْتُمْ۔۔۔ تمہارا زعم اور تمہارا خیال تو یہ تھا کہ یہ کچھ نہیں ہوگا اور اللہ نے قیامت کا کوئی وقت مقرر نہیں فرمایا، خوانخواہ ان لوگوں نے باتیں بنا رکھی ہیں لیکن ہوگا یہ کہ جب صف در صف کھڑے ہو جاؤ گے: وَوُضِعَ الْكِتٰبُ۔۔۔ تو اعمال کی کتاب کھول کر ہر شخص کے سامنے کر دی جائے گی۔ اپنا اپنا کردار ہوگا، ہر شئے اس میں لکھی ہوگی اور سامنے کھول کر رکھ دی جائے گی کہ دنیا سے تم یہ لائے ہو، یہ وہ مال ہے جو دنیا سے تم کما کر لائے ہو۔ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ۔۔۔ اور جو اُس میں لکھا ہوگا جب پڑھیں گے تو اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلّم!) آپ دیکھیں گے کہ جرم کرنے والے لرز رہے ہوں گے کہ خدایا یہ کیا ہوا۔ ہر چھوٹے بڑے گناہ کی فہرست سامنے آ جائے گی، تحریر سامنے ہوگی۔ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ۔۔۔ وہ کہیں گے یہ کیسی کتاب ہے، یہ کیسی عجیب کتاب ہے۔ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا۔۔۔ کہ اس نے تو چھوٹا بڑا کوئی گناہ چھوڑا ہی نہیں۔ اس نے تو وہ بھی لکھے ہوئے ہیں۔ جن کی ہمیں یاد ہی بھول گئی جن کا ہمیں خیال ہی نہیں کہ ہم سے یہ گناہ بھی ہوا تھا۔ یہاں تو وہ بھی لکھا پڑا ہے جس کو ہم گناہ سمجھتے ہی نہیں تھے جس کی ہمیں پروا نہیں تھی کوئی چھوٹی بڑی بات اس نے نہیں چھوڑی سب کا احاطہ کر لیا۔

دنیا میں تو اس نے پروا نہیں کی لیکن وہاں پتا چلے گا فرمایا: وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۔۔۔ جو دنیا میں کرتے رہے وہ اس دن مجسم ہو کر اُن کے سامنے آجائے گا، اُن پر بیتنا شروع ہو جائے گا۔ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ عذاب، الجنس الاعمال ہوتا ہے۔ یعنی جیسا کسی نے عمل کیا ہو ویسی اسے اس عمل کی سزا ملتی ہے۔ زبان سے کیا ہے، زبان کو سزا ملے گی۔ آنکھوں سے کیا ہے، آنکھوں کو سزا ملے گی، کانوں سے کیا ہے، کانوں کی سزا ہو گی۔ جیسا جرم کیا ہو گا اسی جرم کا جو نتیجہ ہے وہ مجسم ہو کر آجائے گا، اسی کو وجود عطا ہو جائے گا اور وہ بندے پہ طاری ہو جائے گا۔ فرمایا: وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۔۔۔ پھر اسے حاضر پائیں گے، محسوس کریں گے۔ اُن پر بیتے گی جو انہوں نے کیا تھا۔

وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿٤٩﴾ تمہارا پروردگار کسی پر زیادتی نہیں کرے گا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، اللہ کی کتاب نے وضاحت کر دی کہ کس کس جرم کی سزا کیا کیا ہے۔ واقعہ معراج شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو مشاہدات فرمائے، برزخ میں لوگوں کو سزائیں ملتی دیکھیں وہ بھی تو بیان کر دی گئی کہ کس جرم کی کیا سزا ہے۔ حدیث شریف میں جگہ جگہ تفصیل ملتی ہے کہ کس جرم کی کیا سزا ہے۔ فرمایا دنیا میں تو جرم کر کے تم بھول گئے لیکن اس جرم کی وہ شعاعیں جو اس سے وقوع پذیر ہوئیں، اُس کے جو اثرات تھے وہ تو اللہ کے نزدیک باقی رہے۔ جب میدانِ حشر میں کھڑے ہوں گے تو وہی مجسم کر کے بھیج دیے جائیں گے۔ اللہ کریم تمہارا پروردگار ہے، ربّ ہے، ربّ پالنہار ہے۔ وہ خالق ہے، مالک ہے، کریم ہے، رحیم ہے تو یہ بھی اُس کی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ گندم سے گندم اُگائے اور جَو سے جَو۔ یہ بھی اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ ہر فعل کا وہ وہی نتیجہ دے جو حقیقتاً اُس نے اُس کا مقرر کیا ہو گا۔ اللہ کریم کی طرف سے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی جائے گی۔ لوگوں نے یہ مصیبتیں اپنے لیے اپنے ہاتھوں پیدا کی ہوں گی۔

سورۃ الکہف رکوع 7 آیات 50 تا 53

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَہٗ وَذُرِّیَّتَہٗٓ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَھُمْ لَکُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾ مَآ اَشْھَدْتُّھُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِھِمْ ۪ وَمَا کُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّیْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾ وَیَوْمَ یَقُوْلُ نَادُوْا شُرَکَآءِیَ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْھُمْ فَلَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَھُمْ وَجَعَلْنَا بَیْنَھُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ مُّوَاقِعُوْھَا وَلَمْ یَجِدُوْا عَنْھَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو تو سب نے کیا مگر ابلیس (نے نہ کیا) وہ جنات میں سے تھا پس اس نے اپنے پروردگار کے حکم کی نافرمانی کی۔ سو کیا تم اُس کو اور اس کی اولاد (چیلے چانٹوں) کو میرے سوا دوست بناتے ہو اور حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں ظالموں کے لیے (شیطان کی دوستی) برا بدل ہے ﴿۵۰﴾ ان کو نہ تو آسمانوں اور زمین کے پیدا کرتے وقت بلایا اور نہ خود ان کو پیدا کرتے وقت۔ اور میں ایسا نہ تھا کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بناتا ﴿۵۱﴾ اور جس دن وہ (اللہ) فرمائے گا جن کو تم ہمارا شریک سمجھتے تھے ان کو بلاؤ تو وہ ان کو بلائیں گے پھر وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک ہلاکت کی جگہ بنا دیں گے ﴿۵۲﴾ اور تب مجرم آگ کو دیکھیں گے پس وہ جان لیں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور وہ اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے ﴿۵۳﴾

تفسیر ومعارف

ابلیس، انسانیت کا دشمن ہے۔ آدمؑ کی اولاد کے ہر فرد سے دشمنی کرتا ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ میں اسی کی وضاحت ہے کہ انسان میں اتنی غیرت تو ہونی چاہیے کہ وہ دشمن کا کہنا نہ مانے۔ اپنے دشمن کو پہچانے، اس کے فریب میں آکر اپنے پروردگار کی نافرمانی نہ کرے۔ قرآنِ حکیم نے تو صاف صاف بتادیا کہ ہر ایک کے نامہء اعمال میں اسی کے اعمال ہوں گے۔ اللہ کی طرف سے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی، تھوڑی سی حیاتِ مستعار میں لوگوں نے یہ ساری مصیبتیں خود اپنے ہاتھوں اپنے لیے پیدا کی ہوں گی۔

فرمایا، یہ کیسے عجیب لوگ ہیں کہ انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ ابلیس ان کا ازلی دشمن ہے۔ فرمایا: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ۔۔۔ جب ان کے جدِ امجد آدم علیہ السلام کو ہم نے پیدا فرمایا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، آپ علیہ السلام کی تعظیم بجالاؤ، اُن علیہ السلام کی عظمت کا اعتراف کرو تم سب میری مخلوق ہو لیکن میرے حکم کے بندے ہو، حکم ملے تو بجالاتے ہو، لیکن آدم علیہ السلام کی عظمت اور تعظیم اس وجہ سے ہے کہ یہ حاکم سے آشنا ہوگا، اس کے سینے میں، مَیں نے وہ دل رکھا ہے جو میری معرفت سے منور ہوگا تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اس نے نہ صرف اپنے پروردگار کے حکم کی نافرمانی کی بلکہ انسان دشمنی کا مرتکب ہوا۔ اس کی یہی انسان دشمنی اس کی اولاد میں بھی جاری ہے۔

ابلیس جنات میں سے تھا:

فرمایا: كَانَ مِنَ الْجِنِّ ۔۔۔ وہ جنات میں سے تھا۔ اس زمین پر جنات بہت پہلے سے آباد تھے۔ یہ اُن میں سے تھا لیکن اس نے بہت ریاضت کی، اتنی محنت کی کہ اللہ نے اسے اتنے درجے دیے کہ فرشتوں میں شمار ہونے لگا۔ اسی لیے یہاں علیحدہ سے ابلیس کا ذکر نہیں کیا بلکہ اسے فرشتوں میں شمار فرمایا وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ۔۔۔ کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا۔

ایک سوال:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صدیوں سجدے کرنے کے بعد اور جنوں سے اُٹھ کر فرشتوں میں شامل ہونے کے بعد ابلیس گمراہ کیوں ہوا؟ قرآنِ حکیم میں سورۂ بقرہ میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ فرمایا: اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۚ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ:34)

ابلیس نے غرور میں آ کر انکار کیا، تکبر کیا اور وہ (علمِ الٰہی میں) تھا ہی کافروں میں سے۔ اس کے نہاں خانۂ دل میں اپنی بڑائی کا گمان تھا وہ عبادت بھی کرتا رہا تو خود کو بڑا بنانے کے لیے۔ یہ ابلیسی روش ہے۔ جس نے بھی اپنائی وہ ہمیشہ کے لیے تباہ ہو گیا۔

اولیاء اللہ کی خدمت میں وقت گزارنے والے بعض ایسے ہوتے ہیں۔ لوگ ان کے بارے بھی یہی سوال کرتے ہیں کہ ایک بندے نے اللہ کے کسی ولی کے ساتھ وقت گزارا، تربیت حاصل کی، برسوں مجاہدے کیے، پڑھا پڑھایا تو اس سب کا کچھ اثر تو ہونا چاہیے تھا وہ پھر کیوں بھاگ گیا؟ ہم نے اپنی حیاتِ مستعار میں ایسے لوگ دیکھے ہیں جنھوں نے اللہ کے مقرب بندوں کے ساتھ برسوں وقت لگایا لیکن مرتد ہو کر مرے۔

جب جماعت میں صرف تین یا چار ساتھی تھے تو اس وقت ایک ساتھی تھا۔ بہت مجاہدے کرنے والا اور تیز مشاہدات رکھنے والا عجیب شخص تھا۔ اس کا نام غالباً مہر علی شاہ تھا۔ ایسا شخص میں نے نہیں دیکھا۔ وہ مشاہدے کے لیے آنکھ بند نہیں کرتا تھا۔ کھلی آنکھوں، آپ سے بات بھی کر رہا ہے اور برزخ کو بھی دیکھ رہا ہے۔ بات بھی کر رہا ہے اور منازل بالا کو، فرشتوں کو بھی دیکھ رہا ہے۔

انہی دنوں یہاں ایک شخص کو کسی بڑے سخت جن نے پکڑ رکھا تھا۔ اس کے منہ سے کفریہ کلمات کہلواتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے ذکر کیا تو میں اس کو ساتھ لے کر حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف چل پڑا۔ ان دنوں ٹرانسپورٹ کا ملنا محال تھا۔ میرے پاس بھی تب گاڑی نہیں تھی۔ یہاں سے ہم تلہ گنگ گئے، وہاں سے آدھی رات کو ٹرک پر بیٹھ کر دندہ شاہ بلاول پہنچے وہاں سے پیدل حضرت جیؒ کی مسجد میں پہنچے۔ فجر کی نماز ہو چکی تھی، حضرت جیؒ ذکر کروا چکے تھے۔ مجھ سے پوچھا، اس وقت کیسے آئے؟ عرض کی اس شخص کو جن نے پکڑ رکھا ہے، یہ کفریہ کلمات بکتا ہے، انسانوں کو سجدے کرتا ہے۔ حضرتؒ ناراض ہوئے کہ سارا دن، ساری رات سفر میں ضائع کر کے علی الصبح ایک جن والا پکڑ کر لے آئے ہو۔ بہر حال اسے بٹھایا، مسجد میں سوکھی گھاس بچھی ہوئی تھی۔ آپ نے ساتھ بٹھا لیا، ذکر کروایا، توجہ دی تو وہ تڑپنے لگا۔ مسجد کے صحن میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک جاتا اور کہتا، اللہ ہے، اللہ ہے۔ اس طرح اللہ نے اسے ہدایت دی۔ پھر حضرتؒ نے فرمایا اسے مہر علی شاہ کے پاس کچھ دنوں کے لیے چھوڑ دو۔ وہ ذکر کراتا رہے۔ اس کا بھائی اس کے ساتھ تھا وہ اسے لے کر مہر علی شاہ کے پاس چلا گیا۔ دوسرے تیسرے دن میں نے اسے پھر دیکھا وہ یہاں پھر رہا تھا میں نے اس سے کہا تمہیں تو دس پندرہ دن مہر شاہ علی شاہ کے پاس رہنے کو کہا گیا تھا۔ وہ کہنے لگا مجھے مہر علی شاہ نے واپس بھیج دیا۔ میں نے حضرتؒ کو بتایا۔ آپ بہت ہنسے اور کہنے

لگے۔ مہر علی کہتا ہے، میں ایسا بندہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا یہ دن میں کئی کئی بار باروضو کرتا ہے۔ اس کا اپنا عالم یہ تھا کہ تہجد کے لیے وضو کرتا تو سارے دن کی نمازیں اسی وضو سے پڑھتا۔ عشاء کے بعد تھوڑا بہت آرام کرتا پھر تہجد کا وضو کر لیتا یعنی وہ چوبیس گھنٹے باوضو رہتا۔ اتنا کم کھاتا اور اتنا کم سوتا۔ بہت مشقت اور مجاہدہ کرتا تھا۔ اس نے ایسا بندہ اپنے پاس رکھنا گوارا نہیں کیا جو دن میں کئی بار وضو کرے۔ وہ لڑکا ٹھیک ہوگیا۔ آج بھی زندہ ہے۔ داڑھی ہے، نماز روزہ کرتا ہے ذکر نہیں کرتا۔ یہ اس کی قسمت۔ اس واقعے کا بہر حال گواہ ہے۔

مہر علی کو اپنی بڑائی کے گھمنڈ نے گھیر لیا۔ اسے حضرتؒ نے بہت سمجھایا لیکن وہ اپنی رائے پر اڑ گیا۔ حضرتؒ نے فرمایا، تمہاری یہ رائے تمہیں تباہ کر دے گی اور پھر بالآخر وہ اپنی ضد پر قائم رہ کر تباہ ہوگیا۔ منازل سلب ہوگئے۔ ہر چیز جاتی رہی۔ پورے ملک میں پھرتا رہا ایک روز میں نے دیکھا حضرتؒ کی خدمت میں آیا۔ کہنے لگا، جب سے آپ کے در سے گیا ہوں، ملک کا کونا کونا چھان مارا ہے۔ جہاں تک جا سکتا تھا گیا ہوں، کوئی جگہ نہیں چھوڑی، معروف گدی نشین، مشہور لوگوں تک پہنچا ہوں وہاں اور سب کچھ ہوتا ہے اس نعمت کا کسی کو پتا ہی نہیں۔ مجھ سے یہ بڑا ظلم ہوا۔ میں توبہ کرتا ہوں۔ آپ مجھے قبول فرمالیں۔ حضرتؒ نے فرمایا، یہ نعمت ایسی ہے کہ اس کی ناقدری کی جائے تو توبہ مشکل ہو جاتی ہے۔ میں تمہیں منع نہیں کرتا، اللہ قبول فرمالے وہ کریم ہے لیکن جو کچھ تمہارے پاس تھا وہ بات گئی۔ اب پھر سے لطائف سے شروع کرنا ہوگا۔ اب پہلے سبق سے شروع ہو جاؤ۔ وہ رات وہیں ٹھہرا، ہمارے ساتھ ذکر بھی کیا لیکن شاید پھر وہ اس بات کو برداشت نہ کر سکا یا اللہ کریم نے اس کی توبہ قبول نہ کی۔ رب بے نیاز ہے وہ تو کسی کا محتاج نہیں۔ بعد میں اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ دوسرے لوگوں سے سنا کہ کہتا پھرتا تھا کہ کوئی خدا نہیں ہے (نعوذ باللہ) یہ پتھر بھی خدا ہے، فلاں چیز بھی خدا ہے اسی پر اس کا انجام ہوا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنا عرصہ ایک ولیٔ کامل کے ساتھ لگ کر پھر یہ گمراہ کیوں ہوا؟

یہ آیۂ مبارکہ اس کا جواب دے رہی ہے کہ صدیوں کے مجاہدے کے بعد، ترقی پا کر فرشتوں میں شامل ہونے کے بعد ابلیس اپنی بڑائی کے زعم میں مبتلا ہو کر گمراہ ہوا اللہ کریم ہیں کہ جب تک اس نے اپنے تکبر کا اظہار نہیں کیا تب تک اس پر پردہ ڈالے رکھا۔ اُسے اس کی عبادت کا اجر بھی دیتے رہے، درجات بھی بلند کرتے رہے۔ جب اس نے نافرمانی کی تو اس کا بھید کُھل گیا، ہر چیز سلب ہوگی اور وہ مردود ہو کر بارگاہِ الٰہی سے نکالا گیا۔

اس آیۂ مبارکہ میں اس کے بھید کھلنے کا واقعہ ارشاد ہو رہا ہے کہ جب سب کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو

سب آدم علیہ السلام کی تعظیم بجالائے۔ سجدۂ تعظیمی کیا، بارگاہِ الٰہی میں سرِ تسلیم خم کردیا سوائے ابلیس کے۔ اسے اس کی بڑائی نے تباہ کرڈالا۔ قرآنِ حکیم میں دوسری جگہ ارشادِ باری ہے: قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ۔۔۔ فرمایا، جب میں نے تجھے حکم دیا تو تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا۔ کہنے لگا: قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ۔۔۔ میں اس سے (آدم علیہ السلام سے) بہتر ہوں۔ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (الاعراف:12) آپ نے مجھے آگ سے پیدا فرمایا اور اس کو (آدم علیہ السلام کو) مٹی سے۔ آگ تو بلند ہے، ہر چیز کو جلا دینے والی ہے، طاقتور ہے اور مٹی کو تو ہر کوئی روندتا پھرتا ہے۔

ابلیسی روش:

اس ابلیسی روش سے اللہ پناہ دے۔ یہی روش ابلیس کو تباہ کر گئی اور مشائخ کے ساتھ رہ کر بھی گمراہ ہوجانے والے اس روش پر کاربند ہوتے ہیں۔ ابتداء ہی سے ان کے دلوں میں یہ چیز چھپی ہوتی ہے۔ جب وہ بات سامنے آتی ہے تو اس پر نتیجہ مرتب ہوجاتا ہے۔ اللہ بڑے کریم ہیں۔ جب تک اظہار نہیں ہوتا اس پر پردہ ڈالے رکھتے ہیں، اس کا پردہ چاک نہیں کرتے۔ جس طرح کوئی یہ خواہش کرے کہ فلاں کو قتل کردوں گا تو اس دلی ارادے پر اُسے سزا نہیں دی جاتی اسی طرح جب تک کسی کے دل میں پیر بننے کی خواہش، اپنی بڑائی کا زعم جیسی برائیاں پوشیدہ رہتی ہیں اور وہ اس پر نیکی کا غلاف چڑھائے رکھتا ہے تو اس کا پردہ قائم رہتا ہے جب یہ چیز سامنے آجائے تو پھر ساری محنتیں ضائع چلی جاتی ہیں، بندہ راندۂ درگاہ ہوجاتا ہے۔

یہی جواب یہ آیۂ کریمہ دے رہی ہے فرمایا: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ۔۔۔ جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے وہ اکڑ گیا حالانکہ وہ تو جنوں میں سے تھا، اُس کو یہ بھی حیا نہ آئی کہ جن ہوکر اسے اللہ نے فرشتوں میں شامل کردیا تھا۔ اسے اپنے ربّ کی نافرمانی زیب نہیں دیتی تھی۔ لیکن اس نے کی۔ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ۔۔۔ اس نے اپنے پروردگار کے حکم کی نافرمانی کی۔ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ اور اے انسانو! تم آدم علیہ السلام کی اولاد ہو، تم اپنے والد کے ساتھ ہوگے یا اس منکر کے ساتھ جس نے تمہارے جدِّ امجد آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کی بجائے مردود ہونا پسند کیا۔ کیا تمہیں اتنی غیرت نہیں آتی؟ تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ تمہارا دشمن ہے۔ تم شیطان کو اور اس کی اولاد کو دوست بنا لیتے ہو، اس کے ساتھ چل پڑتے ہو۔ تمہیں شرم بھی نہیں آتی؟

شیطان اور اس کی اولاد نہ صرف اولادِ آدمؑ کی دشمن ہے بلکہ تعداد میں کثیر ہے۔ ان کی عمریں بھی طویل ہیں علامہ دمیریؒ نے 'حیات الحیوان' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں الف سے لے کر ے تک مختلف حیوانات کے نام، ان کی خصوصیات اور تمام تفصیلات درج کی ہیں۔ ان کے ذریعے حاصل ہونے والے فوائد اور عجیب وغریب نسخے بھی لکھے ہیں۔ اس کتاب میں یہ حدیثِ مبارکہ بھی نقل کی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے فرمان کے مطابق جتنی تعداد زمین پر انسانوں کی ہے اس سے نو (9) گنا زیادہ تعداد، جِنّات کی ہے۔ چونکہ جنات ہزاروں برس پہلے زمین پر آباد ہوئے، ان کی آبادی بڑھ گئی۔ انسانوں اور جنوں کی تعداد ملا کر جو تعداد بنتی ہے اس سے نو (9) گنا زیادہ شیطان کی اولاد ہے۔ یہ اعداد وشمار عہد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہیں۔ اس ارشاد کو چودہ سو پچاس سال بیت گئے ہیں۔ اس عرصے میں ہر مخلوق کی تعداد میں اضافہ ہو چکا ہے۔ شیاطین کی عمریں بہت طویل ہوتی ہیں۔ اللہ نے شیطان کو قیامِ قیامت تک کی مہلت دی تھی۔ اس کی اولاد بھی ہزاروں برس جیتی ہے۔ جنات کی عمریں بھی ہزاروں برس ہوتی ہیں تو ان کی تعداد کتنی زیادہ ہو چکی ہوگی، یوں آج ایک ایک انسان کے ساتھ شیطانوں کا ایک جھنڈ پھرتا ہوگا!

فرمایا، اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِىۡ وَهُمۡ لَـكُمۡ عَدُوٌّ ۔۔۔ اور تم ان کو دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ بِئۡسَ لِلظّٰلِمِيۡنَ بَدَلًا ۞ اللہ کی نافرمانی خود بڑا ظلم ہے پھر اللہ کے نافرمان سے دوستی ایک اور بڑا ظلم ہے۔ اور ظالموں کو بہت بُرا بدلہ دیا جائے گا، ظالموں کا انجام بہت بُرا ہوگا۔ ذرا غور کرو شیطان تمہارا ازلی دشمن ہے۔ تمہارے والد کی عظمت کا انکار کر کے یہ مردود ہوا کیا اب تم اس سے اور اس کے چیلوں سے، اس کی اولاد سے دوستی کرتے ہو اور اللہ کی نافرمانی کرتے ہو، کیا تمہیں حیا نہیں آتی؟ اگر پھر بھی کرنا چاہتے ہو تو کر کے دیکھ لو، برائی کا بدلہ بڑا تکلیف دہ ہوگا، بہت بُرا ہوگا، بہت سخت عذاب سے دوچار کرے گا۔

مَاۤ اَشۡهَدْتُّهُمۡ خَلۡقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَا خَلۡقَ اَنۡفُسِهِمۡ ۖ وَمَا كُنۡتُ مُتَّخِذَ الۡمُضِلِّيۡنَ عَضُدًا ۞ جو لوگ اللہ کی کائنات میں اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں، انبیاءؑ کے ارشادات کی پروا نہیں کرتے کیا یہ زمینوں اور آسمانوں کے بنانے میں میرے مددگار تھے، کیا یہ خالق ہیں کہ یہ جانتے ہیں کیا کرنا چاہیے؟ کسی چیز کا موجد یعنی بنانے والا ہی جانتا ہے کہ اس چیز کی خوبیاں یا خامیاں کیا ہیں اور یہ کہ اس چیز کو کیسے استعمال کرنا ہے؟ یہ جو میری کائنات میں اپنی پسند سے جینا چاہتے ہیں کیا کائنات بنانے میں

میرے شریک تھے کہ اپنی رائے سے جان گئے ہیں کہ یہاں رہنے کا سلیقہ کیا ہے۔ اگر یہ بنانے والے نہیں تھے تو انہیں بنانے والے کے حکم کے مطابق یہاں رہنا چاہیے۔ یہ تو خود مخلوق ہیں۔ کیا یہ اپنے آپ کے بنانے میں بھی شامل تھے؟ انہیں تو اپنا بھی نہیں پتا کہ ربّ العالمین نے ہمیں کس طرح بنایا ہے۔ فرمایا، ہم نے انہیں تخلیق کیا، دنیا میں آئے، زندگی عطا ہوئی، ہوش سنبھالی تو سمجھ بوجھ آئی ورنہ تو انہیں ہوش ہی نہیں تھی کہ اللہ کریم نے انہیں کیسے تخلیق فرمایا۔ اللہ کریم کی قدرتِ کاملہ کا اپنا نظام ہے۔ اس نے اولادِ آدمؑ کو جاری رکھنے کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ کس طرح مٹی کے ذرات کو انسانی خلیوں (Human Cells) میں تبدیل کر دیتا ہے۔ کتنے مراحل (Process) سے گزارتا ہے۔ زمین کے ذرات سے کوئی درخت اُگا، اس پر پھل آیا، انسان کی غذا بنا، زمین سے گھاس، چارا اُگا، کسی جانور نے کھایا، اُس کے پیٹ سے دودھ بنا، اس کا گوشت انسانی غذا بنا۔ جس جس کا حصّہ تھا غذا کی شکل میں اس تک پہنچا۔ جو حصّہ ان کی اولادوں کا تھا وہ مراحل سے گزرتا ہوا باپ کے صلب میں محفوظ ہو گیا اور آنے والی نسلوں کے دنیا میں آنے کا سبب بنا۔ ہر آنے والے کا رزق اسی مٹی میں محفوظ رہا اور یوں ایک تسلسل جاری ہے۔ کیا یہ اس سارے عمل میں بھی شریک تھے؟ انہیں تو اپنی تخلیق کا بھی نہیں پتا یہ زمین و آسمان کیا بنائیں گے؟ یہ کس طرح اللہ کی کائنات میں اپنی مرضی سے رہنا چاہتے ہیں، اس کا تو کوئی جواز ہی نہیں بنتا۔ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾ ایسے گمراہ لوگ جو اپنی ذات کے بارے صحیح فیصلہ کرنے سے عاری ہیں اور اپنی عمر غلط طور پر بسر کر کے مہلتِ عمل ضائع کر رہے ہیں کیا ان کو اللہ کریم آسمانوں اور زمینوں کے بنانے میں بلاتے؟

فرمایا، وہ وقت جلد آ رہا ہے۔ يَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ ۔۔۔ جب ہم اُن سے مخاطب ہوں گے، اُن کو حکم دیں گے کہ بلاؤ ان لوگوں کو جن کو تم میرا شریک سمجھتے تھے۔ جن کے بارے تمہارا عقیدہ تھا کہ فلاں تمہیں اولاد دیتا ہے، فلاں روزی رساں ہے، فلاں صحت دیتا ہے، فلاں دیگر کاموں کا ذمہ دار ہے۔ آج انہیں بلاؤ ذرا روبرو بات ہو جائے، اُن سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔ میری ذات کو پکارنے سے تمہارے لب و دہن محروم تھے تو آج اُن کو بلاؤ، میدان حشر، میرے روبرو اُن سے بات ہو جائے اور سچ واضح ہو جائے۔ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا ۔۔۔ جن کو یہ پوجتے رہے انہیں پکاریں گے، وہ کوئی جواب نہیں دیں گے۔ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾ درمیان میں جہنم دہک رہی ہوگی۔ بڑی ہلاکت خیز اور تباہ

کن جگہ ہوگی، جہاں سے یہ بھاگ کر نہیں جا سکیں گے۔

ایمان نہ لانا، اپنی نجات کا راستہ بند کرنا ہے:

فرمایا، اللہ کے نافرمان، نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے نافرمان، دین کا انکار کرنے والے، آخرت کا انکار کر کے اپنی عمریں ضائع کرنے والے مجرم جب دوزخ کو، اس کے بھڑکتے شعلوں کو دیکھیں گے۔ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا ۔۔۔اور یہ جان لیں گے کہ اب تو اس میں گرنے والے ہیں، اب تو دوزخ میں گر جائیں گے۔ وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا﴿۵۳﴾ اس وقت اُن کے لیے کوئی راہِ فرار نہ ہوگی کہ اس سے بچ کر کہیں اور چلے جائیں۔ انہوں نے اپنے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا ہوگا۔ جب اللہ کی نافرمانی، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی نافرمانی کی، ایمان تک نہ لائے تو گویا انہوں نے اپنے لیے نجات کے سارے راستے بند کر دیے۔ صرف جہنم سامنے ہے جس میں گریں گے۔ جس طرح دنیا میں کھلی آنکھوں سے گناہ کیا کرتے تھے اسی طرح آج جہنم کو بھی آنکھوں سے دیکھ کر اس میں گریں گے۔ دنیا میں اللہ کو مان لیتے تو گناہوں سے بچتے لیکن جنہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت چھوڑی انہوں نے نجات کا راستہ چھوڑا انہوں نے جہنم سے نکلنے کا راستہ ہی بند کر دیا۔ انہیں دوزخ میں گرنا ہی پڑے گا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

سورۃ الکھف رکوع 8 آیات 54 تا 59

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾

اور یقیناً ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر طرح کی مثال بیان فرمائی ہے اور انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑا کرنے والا ہے ﴿۵۴﴾ اور لوگوں کے پاس جب ہدایت آ گئی تو ان کو ایمان لانے سے اور اپنے پروردگار سے بخشش مانگنے سے کس چیز نے روکا سوائے اس کے کہ (انتظار کریں) انہیں بھی پہلوں جیسا معاملہ پیش آئے یا عذاب ان کے سامنے آ موجود ہو ﴿۵۵﴾ اور ہم

پیغمبروں کو صرف اس لیے بھیجتے ہیں کہ (لوگوں کو) خوش خبری سنائیں اور (عذاب سے) ڈرائیں اور جو کافر ہیں وہ باطل (کی سند) سے جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس سے حق کو پھسلا دیں (جگہ سے ہٹا دیں) اور انہوں نے ہماری آیات کو اور جس (عذاب) سے ان کو ڈرایا جاتا ہے کو مذاق بنا رکھا ہے ﴿۵۶﴾ اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا کہ اسے پروردگار کے کلام سے سمجھایا گیا تو اس نے اُس سے منہ پھیر لیا اور جو (اعمال) اپنے ہاتھوں آگے بھیج چکا وہ بھول گیا۔ یقیناً ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ اس کو (حق کو) سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں بوجھ (کہ سن نہ سکیں) اور اگر آپ ان کو راہِ راست کی طرف بلائیں تو ہرگز کبھی بھی راہِ راست پر نہ آئیں گے ﴿۵۷﴾ اور آپ کا پروردگار بخشنے والا رحمت والا ہے۔ اگر ان کے کرتوتوں پر ان کو پکڑنے لگے تو ان پر فوراً عذاب بھیج دے بلکہ ان کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے کہ اس (کے عذاب) سے ہرگز کوئی پناہ کی جگہ نہ پائیں گے ﴿۵۸﴾ اور یہ بستیاں ہیں (جو ویران ہیں) جب انہوں نے ظلم کیا تو ہم نے ان (کے باشندوں) کو ہلاک کر دیا اور ہم نے ان کی تباہی کے لیے ایک وقت مقرر کیا تھا ﴿۵۹﴾

تفسیر و معارف

قرآنِ حکیم اللہ کریم کی عظیم نعمت ہے۔ یہ ایک زندہ کتاب ہے جو زندہ لوگوں سے باتیں کرتی ہے اور زندگی کی بات کرتی ہے۔ اللہ کے یہ عظیم کتاب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مِن وعَن اس پر عمل فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ قرآن حکیم کی عملی تفسیر ہے۔

درِ توبہ کھلا ہے:

کتابِ الٰہی ہمیں بتا رہی ہے کہ اللہ غفور رحیم ہے اور دنیا کی حیاتِ مستعار اللہ کی رحمت ہے، اللہ کے بندو! آج تمہارے پاس موقع ہے، توبہ کر لو، اللہ سے معافی چاہو، اپنی اصلاح کر لو، دامانِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

تھام لو، اس سے چمٹ جاؤ۔ اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم کو اختیار کر لو ورنہ جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے تعلق ٹوٹ گیا اس کا بارگاہِ الٰہی میں نجات کا راستہ ختم ہو گیا۔ اگر یہ رشتہ توڑ دو گے تو پھر بچنے کا کوئی راستہ نہیں۔

فرمایا: وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ۔۔۔ ہم نے تمام موضوعاتِ زندگی پر سیر حاصل بحث کر کے ہر چیز کھول کر انسان کو بتا دی ہے۔ جو کچھ مرنے کے بعد پیش آنے والا ہے وہ ایک ایسی ہستی کی زبانی سنوا دیا ہے جسے اُس (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے بدترین دشمن بھی صادق اور امین کہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر اپنا ذاتی کلام نازل فرما کر ہم نے ہر بات الگ الگ کر کے واضح کر دی۔ بتا دیا کہ نیکی اور ثواب کیا ہے اور جرم و گناہ کیا ہے۔ گناہ ہو جائے تو توبہ کا طریقہ کیا ہے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے طفیل اللہ کریم نے اس اُمتِ مرحومہ پر وہ آسانی فرما دی جو پہلی اُمتوں کو نصیب نہ تھی۔ پہلی اُمتوں کے افراد سے گناہ ہوئے تو لوگوں نے توبہ بھی کی لیکن ان کی توبہ پر اللہ نے شرائط لاگو کر دیں کہ اتنے روزے رکھو، اتنے دن دنیوی زندگی کے مشاغل ترک کر کے پہاڑوں پر چلے جاؤ۔ بنی اسرائیل نے جب بت پرستی شروع کر دی اور پھر تائب ہوئے تو ان کی توبہ کی شرط یہ رکھی کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی ہے، اس کے آگے سر جھکایا ہے وہ سر کٹوا دیں اور جنہوں نے اسے سجدہ نہیں کیا۔ وہ اُن کے سر کاٹ دیں تو پھر توبہ قبول ہوگی۔ یوں ہزاروں لوگ قتل ہوئے تب جا کر توبہ قبول ہوئی۔ بھائی کے ہاتھوں بھائی، بیٹے کے ہاتھوں باپ اور باپ کے ہاتھوں بیٹے قتل ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی اُمت پر اللہ کریم نے یہ احسان فرمایا کہ نادم ہو جاؤ، توبہ کر لو اور اپنی اصلاح کر لو تو جو ہو چکا میں اسے معاف کرتا ہوں۔ گزشتہ کے بارے تم سے پوچھا ہی نہ جائے گا۔ اس سے بڑی رعایت کیا ہوگی؟ فرمایا، اللہ کریم نے یہ سب کچھ بڑی وضاحت سے قرآنِ حکیم میں بتا دیا لیکن انسان جھگڑنے والا ہے۔

عظمتِ الٰہی سے ناآشنائی جھگڑالو بنا دیتی ہے:

فرمایا: وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾ جب انسان کا مزاج بگڑتا ہے تو اسے اپنے بُرے، بھلے کی تمیز نہیں رہتی۔ ہر بات پر جھگڑا کرتا ہے، ہر بات پہ کج بحثی پر اتر آتا ہے۔ جو ذہن میں سما گئی وہی منوانا چاہتا ہے۔ عظمتِ الٰہی سے آشنائی ہو تو بندہ اپنی نہیں منواتا ذاتِ باری کی مانتا ہے، اپنی غلطی تسلیم کرتا ہے، توبہ کرتا ہے، اصلاح کے راستے پر گامزن ہوتا ہے اور جو اللہ کی بڑائی نہیں مانتے تو انسانی مزاج ایسا ہے کہ جب بگڑتا ہے تو پھر اپنے اندر ہی اندر اپنی اَنا پال لیتا ہے۔ کہتا ہے میری ہی بات مانی جائے خواہ وہ بات غلط ہو، بے دلیل ہو۔

فرمایا: وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَهُمُ الۡهُدٰى۔۔۔ اگر انسان کا یہ مزاج نہ ہوتا تو جب ان کے پاس ہدایت آگئی تھی، اللہ کا عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوگیا، اللہ کی کتاب آگئی تو پھر اس کو کیوں نہیں مانتے، رکاوٹ کیا ہے؟ لوگوں کو کس نے روکا ہے کہ اللہ کی بات نہ مانو، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع نہ کرو۔ کسی نے نہیں روکا، ان کے اندر جو گھمنڈ ہے، اَنا ہے، اپنی من مانی کرنا چاہتے ہیں، صرف اس نے روکا ہوا ہے۔ ایسے ہر انسان کو اس کے اپنے مزاج نے روک کر تباہی کی طرف کھڑا کیا ہوا ہے۔

ختمِ نبوت کے بجائے تکمیلِ نبوت کہنا مناسب ہے:

ایسی عظیم کتاب جس کے نزول کے بعد کسی نئی کتاب کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ایسے عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کہ جس کے بعد قیامت تک کسی نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہ رہی، جس (صلی اللہ علیہ وسلّم) پر نبوت مکمل ہوگئی۔ رہتی دنیا تک کے لیے قرآن کے احکام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات میں ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ ہر زمانے میں جو تبدیلیاں آئیں اور جو آتی رہیں گی ان سب کے لیے قرآن وسنت کے ارشادات کافی ہوں گے۔ تمام دنیوی اور انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین غیر مبدّل نہیں ہوتے۔ ان میں ترامیم کرنا پڑتی ہیں۔ پھر ایک ملک کے قوانین کا اطلاق دوسرے ملکوں پر نہیں ہوتا کہ ہر قوم کی تہذیب جدا ہے، زبانیں جُدا ہیں، موسم الگ ہیں، اوقات میں فرق ہیں۔ ایسے قوانین میں تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے۔ قرآنِ حکیم کیسی عظیم الشان کتاب ہے جس نے جو قانون آج سے پندرہ سو سال پہلے بتایا آج تک اس میں کسی تبدیلی کی، کسی ترمیم کی ضرورت ہی پیش نہ آئی اور نہ قیامت تک آئے گی۔ حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وسلّم کیسا عظیم الشان رسول ہے کہ جس نے جو ارشاد فرما دیا، قیامت تک کے لیے اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

اسے ہم ختمِ نبوت کہتے ہیں۔ یہ بات درست ہے لیکن اس کا خوبصورت پہلو یہ ہے کہ کہا جائے کہ نبوت مکمل ہوگئی، نبوت کی تکمیل ہوگئی۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی اس کے یہی معنی ارشاد فرمائے ہیں۔ ارشادِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مفہوم ہے کہ نبوت گویا ایک عمارت ہے۔ بہت خوبصورت ہے۔ کوئی اسے دیکھتا ہے، کوئی اس کے گرد پھرتا ہے تو اسے ایک اینٹ کی جگہ خالی نظر آتی ہے وہ حیرت سے اس جگہ پر انگلی رکھتا ہے کہ اتنی خوبصورت عمارت میں یہ جگہ تو خالی ہے؟ فرمایا، میں ہی وہ اینٹ ہوں جو وہاں چُن دی گئی اور نبوت مکمل ہوگئی۔

اللہ کا ایسا عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر نبوت کی تکمیل ہوگئی اور کسی نئے نبی کی حاجت ہی باقی نہ رہی تو اللہ کی اتنی بڑی نعمت کی قدر نہ پہچانی، انہیں کس چیز نے روکا، یہ کیوں ایمان نہیں لاتے، کیوں قرآن کو نہیں سمجھتے؟ وَيَسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّهُمۡ۔۔۔ کیوں توبہ نہیں کرتے؟

عظمتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان نہ لانے کا سبب:

فرمایا، اس کا سبب وہی اَنا ہے جس نے پہلی قوموں کو بھی آخری دم تک کفر پر قائم رکھا۔ یہ بھی پہلی قوموں کی طرح بگڑے، یہ اپنے آپ کو منوانا چاہتے ہیں۔ اپنے آپ کو منوانے کا حق تو صرف اس ہستی کو ہے جو سب کا خالق ہے۔ فرمایا، تم مخلوق ہو، تم کیا منوا سکتے ہو۔ تمہیں اس کی بات ماننا پڑے گی جو اس کائنات کا خالق ہے جو تمہارا خالق ہے۔ تمہارے پاس اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم تشریف لائے، قرآن نازل ہوا تو کیوں نہیں مانتے؟ کیا تب تک انتظار کرو گے جب تک پہلی قوموں نے انتظار کیا تھا۔ اور پہلی قوموں نے جب انکار کیا تو انکار کے سبب ان پر عذاب آ گیا اور وہ تباہ ہو گئے۔ فرعون بھی جب غرق ہوا، برزخ کھل گیا تو کہنے لگا میں ایمان لاتا ہوں۔ اللہ کریم نے ارشاد فرمایا، اب تیرا ایمان قبول نہیں۔ ایمان لانے کا وقت وہ تھا جب اللہ کا نبی علیہ السلام چل کر تیرے پاس آیا تھا۔ آج جب آخرت نظر آ رہی ہے تو ایمان لا رہے ہو! آخرت کو دیکھ کر تو سب ایمان لے آئیں گے لیکن اس وقت ایمان لانا قبول نہیں ہوگا۔ **اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾** پہلی قومیں جو تباہ ہوئیں کیا تم بھی انہی کی طرح انتظار کرنا چاہتے ہو کہ تباہی، اور بربادی آ جائے تو پھر مانیں گے۔ یاد رکھو پھر تمہاری کوئی نہ سنے گا۔

انبیاءؑ کی بعثت کا مقصد:

فرمایا: **وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ**۔۔۔ انبیائے کرامؑ کی بعثتِ عالی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ بھلائی کرنے پر اچھے انجام کی بشارت دیتے ہیں اور برائی کے انجام کی بروقت خبر دے دیتے ہیں۔ دنیا میں ہی بتا دیتے ہیں کہ کن کاموں پر جنت ملتی ہے، راحتیں اور انعامات ملنے ہیں اور کون سے کاموں پر عذاب مرتب ہوں گے اور انہیں بھگتنا ہوگا۔ انبیاءؑ کا منصبِ جلیلہ صرف یہ رہا ہے کہ بھلائی کے بہتر انجام کی خوش خبری دے دیں اور گناہ کرنے والے کو گناہ کے انجام سے باخبر کر دیں۔ انبیاءؑ کا مقصد زبردستی پکڑ کر منوانا نہیں ہوتا۔

اللہ کریم نے ہر فرد کو دو امور میں آزادی دی ہے۔ دو باتوں کا حق ہر فرد کے پاس ہے۔ ایک زندہ رہنے کا حق، دوسرا عقیدہ رکھنے کا حق۔ زندگی اللہ نے دی ہے، اللہ ہی زندگی واپس لینے کا حق رکھتا ہے۔ کسی بندے نے کسی کو حیات نہیں دی اور وہ کسی سے حیات لے نہیں سکتا۔ شرعی حکم کے مطابق، قاضی کسی کو قتل کی سزا دے اور اسے قتل کیا جائے تو اس کی زندگی اللہ نے واپس لی۔ شرعی حکم کے علاوہ ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کام اسلامی حکومت

کے شرعی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ ہر کس و ناکس اس کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتا اور نہ کسی کو اپنی رائے سے قتل کر سکتا ہے۔

دوسرا حق ہے مذہب رکھنے کا۔ کوئی کسی سے زبردستی کوئی عقیدہ نہیں منوا سکتا۔ کوئی یہودی رہنا چاہے، عیسائی بننا چاہے یا مسلمان۔ یہ ہر فرد کی آزادی ہے اس کا حق ہے جو چاہے بنے۔ ہر ایک اپنے انجام کو پالے گا۔ اللہ کے پاس جائے گا تو جو عقیدہ اختیار کیا تھا اس پر باز پرس ہوگی۔ اس کا جواب اسے اللہ کو دینا ہے، اللہ اس سے حساب لے لے گا۔ از خود لوگوں کو واجب القتل قرار دے کر قتل کر دینا یہ صریحاً ناجائز ہے، اس کی قطعاً اجازت نہیں۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنا عقیدہ وہ رکھے جو وہ چاہتا ہے۔ ہاں! آپ تبلیغ کر سکتے ہیں، بتا سکتے ہیں کہ اسلام بہترین راستہ ہے لیکن تبلیغ کا طریقہ مستحسن ہونا چاہیے۔ خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ، بھلائی چاہتے ہوئے، نرمی اور محبت سے بات کی جائے اور زبردستی ہرگز نہ کی جائے۔ انبیاءؑ کی دنیا میں تشریف آوری کا مقصد دوسروں کی خیر خواہی اور بھلائی ہے تاکہ دنیا میں رہتے ہوئے لوگوں کے سامنے جنت و دوزخ کا نقشہ پیش کر دیں۔ انہیں نیکی کی ترغیب دلائیں، برائی سے بچنے میں مدد کریں اور ہر راستے کے انجام سے دنیا میں ہی باخبر کر دیں۔

گناہ کی خصوصیت:

گناہ کی، کفر کی خصوصیت یہ ہے کہ عظمتِ الٰہی کو دل سے مٹا دیتے ہیں۔ ہر بندے کی اپنی اَنا آ جاتی ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ اللہ کو مانو، وہ یہ کہتا ہے کہ میری مانو، جو میں کہتا ہوں وہ مانو۔ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ ۔۔۔ وہ ناروا طریقے سے، باطل اور ناحق طریقے سے جھگڑا کرتے ہیں اور اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حق کو ٹال دیں۔ بے دلیل اور بغیر کسی جائز و مناسب بات کے خوامخواہ کا جھگڑا کرتے ہیں۔ اس طرح تو حق ٹل نہیں سکتا۔ حق تو حق ہے۔ چونکہ ان کے پاس کوئی دلیل تو ہوتی نہیں اس لیے وہ مذاق اڑانے پر اتر آتے ہیں۔ فرمایا: وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾ جس کے پاس دلیل ہوتی ہے وہ دلیل سے جواب دیتا ہے جس کے پاس دلیل نہیں ہوتی وہ جھگڑا کرتا ہے۔ فرمایا، اہلِ باطل بے سند باتیں کرتے ہیں۔ اعمالِ بد کے نتیجے میں جو عذاب آئیں گے، اُن سے جب ڈرایا جاتا ہے تو وہ اللہ کی آیات کا، دلائل اور نشانیوں کا مذاق اڑاتے ہیں، کہتے ہیں بھلا ایسے بھی کبھی ہو سکتا ہے کہ آگ کا کمرہ ہو، آگ کا لباس ہو، آگ ہی اوڑھنا بچھونا ہو!

فرمایا اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا، اس سے بڑا ظالم کون ہوگا: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ

عَنْهَا۔۔۔کہ جس کو اللہ کی دعوت آئے، جس سے اللہ کریم اپنے کلام، کتابِ الٰہی کے ذریعے باتیں کریں، اللہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم جسے اللہ کے ارشادات پہنچائے اور وہ منہ پھیر کر چل دے کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

دنیا میں بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں لیکن سب سے بڑا ظلم، اللہ کے احکام کی پروا نہ کرنا ہے فرمایا: وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ۔۔۔اس سے بڑا ظالم کون ہے جسے اللہ نے اپنے کلام سے سمجھایا کہ یہ عمل تمہارے لیے نفع بخش ہے اور یہ نقصان دہ ہے اور وہ کہے کہ مجھے اس نصیحت کی ضرورت نہیں اور اپنے گناہوں کو بھول جائے۔ جو کرتوت کر کے آگے بھیجتا رہا وہ اسے یاد نہ رہیں۔

احکامِ الٰہی سے لا پروائی کی سزا:

جو احکامِ الٰہی کی پروا نہ کرے اور اپنے گناہوں کو بھول جائے، فرمایا دنیا میں اُسے اس کی یہ سزا ملتی ہے: اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا۔۔۔کہ ہم ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دیتے ہیں، پردہ ڈال دیتے ہیں، پھر انہیں سمجھ ہی نہیں آتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ پاک کا مفہوم ہے کہ گناہ کرنے سے دل پر ایک سیاہ نقطہ پیدا ہوجاتا ہے۔توبہ کرلے اور اصلاح کر لے تو اللہ کریم اسے مٹا دیتے ہیں۔ اگر توبہ نہ کرے اور مزید گناہ کرے تو مزید سیاہی بڑھتی ہے۔ اگر گناہ پر گناہ ہی کرتے جائیں تو سارا دل سیاہ ہوجاتا ہے۔ پھر اللہ کریم اس پر مہر کر دیتے ہیں کہ تو نے اتنا ظلم کیا کہ دل میں کوئی جگہ صاف نہ رہنے دی تو پھر یونہی سہی۔

گناہ کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی گناہ کرتا ہے تو اسے احساسِ گناہ ہوتا ہے۔ یہ احساس زندہ رہے تو بندہ نادم ہوتا ہے۔ اصلاح کرتا ہے لیکن جو اتنا ظلم کرے کہ اس کا احساسِ گناہ ہی ختم ہوجائے تو پھر اس کی سمجھ بوجھ ختم ہوجاتی ہے۔ اللہ اس کے دل پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ بھلے سے بھلی بات بھی کرتے رہو اسے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ حق سننے سے بہرے ہوجاتے ہیں۔ فرمایا: اَنْ يَّفْقَهُوْهُ۔۔۔ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ حق کو سمجھ نہ سکیں۔ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا۔۔۔اور کوئی اچھی بات سن نہیں سکتے۔ انہیں آواز تو سنائی دیتی ہے لیکن اس بات کی اچھائی سمجھ نہیں آتی۔ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا﴿۵۷﴾ انہیں اس لاپروائی، روگردانی کی یہ سزا ملتی ہے کہ اب انہیں کوئی ہدایت کی طرف بلائے بھی تو وہ ہدایت پا نہیں سکتے۔

آج دنیا میں کوئی فرد ایسا نہیں جس تک کسی نہ کسی طرح اللہ کی دعوت نہ پہنچ رہی ہو۔ آج سائنسی آلات موجود

ہیں، اوقات معلوم کرنے کے جدید ذرائع موجود ہیں۔ دنیا کا نقشہ سامنے رکھیں، اور جہاں جہاں مسلمان ملک ہیں ان کی ترتیب دیکھیں، سورج کی رفتار دیکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ چوبیں گھنٹے کا کوئی ایک سیکنڈ ایسا نہیں ہے کہ کہیں نہ کہیں، دنیا میں کسی نہ کسی مسجد میں اللہ اکبر کی آواز بلند نہ ہو۔ اس سے بڑی دعوت الی اللہ کیا ہوگی؟ ہم اپنے گاؤں، شہر کو دیکھ لیں کتنی مساجد ہیں جن میں پانچ بار اذان دی جاتی ہے اور سننے والوں میں سے کتنے ہیں جو اس آواز پر کان ہی نہیں دھرتے۔ اذان سن کر مسجد جانا تو دور کی بات ہے، اذان کے لیے چند لمحے خاموش بھی نہیں ہوتے، پرواہ ہی نہیں کرتے جو ہنسی مذاق، گفتگو چل رہی ہوتی ہے اسے جاری رکھتے ہیں۔ اتنا لحاظ بھی نہیں کرتے کہ اللہ کی طرف سے دعوت مل رہی ہے تو تھوڑی دیر خاموش ہی ہو جائیں۔

پاکستان بننے سے پہلے برصغیر میں ہندو اور مسلمانوں کی رہائش قریب قریب ہوتی تھی۔ جب ہندوؤں کی بارات گزرتی تو خوب باجے گاجے، ڈھول تماشے ہوتے تھے۔ جب بارات مسجد کے قریب آتی تو وہ ڈھول تماشے بند کر دیتے اور مسجد کے آگے سے خاموشی سے گزر جاتے کہ مسلمانوں کی مسجد ہے، اللہ کا گھر ہے، اتنا ادب ہندو بھی کرتے تھے۔ اب مسلمانوں کی باراتیں بھی ہندوؤں کی طرز پر ڈھول تماشے کرتے ہیں پھر یہ ادب بھی نہیں کرتے کہ اذان ہو رہی ہے، جماعت ہو رہی ہے، خاموش ہو جائیں۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ پھر ان پر ایسا وقت آجاتا ہے کہ ان کے گناہوں کے سبب ان پر یہ سزا مرتب ہو جاتی ہے کہ دلوں پر پردہ پڑ جاتا ہے، کان حق بات نہیں سن سکتے، آنکھیں حق کو دیکھ نہیں سکتیں اور یہ اپنی دھن میں گمراہی کی طرف بڑھتے رہتے ہیں۔ انہیں کوئی بڑی دلسوزی سے ہدایت کی طرف بلائے، فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا۝ تو بھی یہ راہ راست پر نہیں آئیں گے کیونکہ اللہ نے انہیں اپنی بارگاہ سے نکال دیا ہے۔

اللہ کریم سے معافی مانگنی چاہیے، توبہ کرنی چاہیے، اپنے لیے، اپنی بہتری کے لیے، اپنی آخرت کے لیے اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ سوائے اطاعتِ الٰہی کے، اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اللہ کریم ہمیں اس کی توفیق دیں، ہماری توبہ قبول فرمائیں اور نیکی کی توفیق دیں۔ آمین

پروردگارِ عالم بہت بخشنے والے بڑی رحمت والے ہیں:

کفار کی ہٹ دھرمی کے باعث ان کے حصولِ علم کے ذرائع پر پردہ ڈال دیا گیا، اُن کے کان اچھائی سننے سے محروم ہیں، آنکھیں حق دیکھنے سے محروم ہیں، ان کے دل بھلائی قبول کرنے سے عاری ہو گئے ہیں۔ یہ انہیں ان کے گناہوں کی سزا ملی ہے۔ اس کے باوجود فرمایا: وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ۔۔۔ آپ کا

پروردگار بہت ہی بخشنے والا، بہت بڑی رحمت والا ہے یعنی ان کے گناہوں کے جو اثرات مرتب ہو رہے ہیں وہ تو فطری ہیں کہ اگر کوئی آگ میں ہاتھ ڈالے گا تو جلے گا۔ اسی طرح ان کی آنکھوں، کانوں اور دل پر جو پردے پڑ گئے ہیں یہ ان کے گناہوں کا نتیجہ ہے ورنہ اللہ تو بہت کریم ہیں۔ اللہ چاہتے تو ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں تباہ کر دیتے، ان سے ان کی زندگی چھین لیتے، آسمان سے عذاب نازل کر دیتے، زمین میں غرق کر دیے جاتے لیکن اللہ کریم بہت درگزر کرنے والے، بہت بخشنے والے، بہت رحم کرنے والے ہیں۔ ذُوالرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ۔۔۔ اللہ کریم اگر ان کے اعمال پر گرفت کرتے تو ان پر عذاب آچکا ہوتا، وہ تباہ ہو چکے ہوتے۔ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾ لیکن اللہ نے ان کے لیے وقت مقرر کر رکھا ہے، انہیں فرصت دے رکھی ہے۔ جب تک اللہ نے ان کی حیات مقرر کی ہے تب تک انہیں مہلت دے رکھی ہے۔ ہاں! جب موت آئے گی، نامہء اعمال ختم ہو جائیں گے، دارالعمل ختم ہو جائے گا، دارالجزا شروع ہو جائے گا پھر یہ بھاگنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے۔ سوائے عذاب کے کچھ نصیب نہیں ہوگا، کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی کہ عذابِ الٰہی سے بھاگ کر کہیں چلے جائیں۔

فرمایا: وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾ ایسے لوگوں کی بستیاں اور ان کے نشانات آج بھی موجود ہیں جن کے رہنے والوں نے ظلم کیے تو ہم نے ان کے رہائشیوں کو ہلاک کر دیا۔ انہوں نے اپنی مہلتِ عمل ضائع کر دی، اللہ کی طرف سے توبہ کا موقع ملا، اسے ضائع کر دیا تو پھر اُن کی دُنیوی زندگی کا وقت تمام ہو گیا اور جو وقت ان کے لیے مقرر تھا اس پر ہلاک ہو گئے۔

سورۃ الکھف رکوع 9 آیات 60 تا 70

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَیْنِهِمَا نَسِیَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا٘ لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اَرَءَیْتَ اِذْ اَوَیْنَاۤ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ٘ وَمَاۤ اَنْسٰىنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ٘ وَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰۤى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَاۤ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَكَیْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ قَالَ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَاۤ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْـَٔلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰۤى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے خادم سے فرمایا کہ جب تک میں دو سمندروں کے ملنے کی جگہ پر نہ پہنچ جاؤں میں سفر جاری رکھوں گا یا یونہی زمانہ دراز تک چلتا رہوں گا ﴿۶۰﴾ پس جب وہ دونوں ان کے ملنے کی جگہ پہنچے تو اپنی مچھلی کو دونوں بھول گئے تو اس (مچھلی) نے سمندر میں سرنگ کی طرح اپنا راستہ بنایا۔ پس جب دونوں (وہاں سے) آگے بڑھے تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے خادم سے فرمایا کہ

ہمارے لیے صبح کا کھانا لاؤ بے شک ہم اس سفر سے بہت تھک گئے ہیں ﴿۶۲﴾ اس نے کہا دیکھیے جب ہم اس پتھر کے قریب ٹھہرے تھے تو بے شک میں مچھلی (کے تذکرہ) کو بھول گیا اور مجھ کو شیطان ہی نے بھلا دیا کہ آپ سے اس کا ذکر کروں اور اس نے عجیب طرح سے (زندہ ہو کر) سمندر میں اپنا راستہ بنالیا ﴿۶۳﴾ فرمایا یہی تو (وہ مقام) ہے جس کی ہم کو تلاش تھی سو دونوں اپنے پاؤں کے نشانات دیکھتے ہوئے واپس لوٹے ﴿۶۴﴾ تو (وہاں) انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جس کو ہم نے اپنی خاص رحمت دی تھی اور ہم نے اس کو اپنے پاس سے علم بخشا تھا۔ ﴿۶۵﴾ موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے کہا (خضرؑ سے) کہ کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں اگر آپ کو جو علم (اللہ کی طرف سے) سکھایا گیا ہے اس میں سے مجھے بھی بھلائی کی باتیں سکھا دیں ﴿۶۶﴾ انہوں نے کہا یقیناً آپ میرے ساتھ رہ کر ہرگز صبر نہ کر سکیں گے ﴿۶۷﴾ اور جس بات کی آپ کو خبر ہی نہ ہو اس پر آپ کیسے صبر کر سکتے ہیں ﴿۶۸﴾ فرمایا اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور میں آپ کے ارشاد کے خلاف نہیں کروں گا ﴿۶۹﴾ انہوں نے کہا پھر اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہیں تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیے گا جب تک میں خود اس کا ذکر آپ سے نہ کر دوں ﴿۷۰﴾

تفسیر و معارف

اللہ کریم انبیاء علیہم السلام کی تربیت خود فرماتے ہیں:

اللہ کریم کی بارگاہ اتنی عالی ہے کہ اس کے بہت ہی مقرب بندوں سے کوئی لغزش ہو جائے حتیٰ کہ انبیاءؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ان کی شان کے برعکس غیر ارادی طور پر کوئی بات ہو جائے یعنی جو مقام و مرتبہ نبیؑ کا ہے اس کی شان سے کم تر کوئی بات ہو جائے تو اسے بھی خطا سمجھا جاتا ہے اور نبیؑ کی تربیت کرنے کے لیے خاص حالات سے گزارا جاتا ہے۔ ورنہ انبیاء تو معصوم ہوتے ہیں۔ عصمت خاصۂ نبوت ہے۔ ہر نبیؑ معصوم ہوتا ہے۔ کسی نبی سے گناہ

نہیں ہوتا، گناہ سے پاک ہوتا ہے، گناہ کرتا ہی نہیں۔ اس کے باوجود قرآن حکیم میں جا بجا ارشاد ہوا کہ انبیاءؑ علیہم السلام کی تربیت کے لیے اللہ کریم اپنے مقربین کا محاسبہ فرماتے رہے۔ یاد رہے انبیاءؑ علیہ السلام کے بارے قرآن حکیم میں جو الفاظ تنبیہ کے لیے استعمال ہوئے وہ اللہ کریم کا اپنے مقربین سے خطاب ہے اور انبیاءؑ کی شان کے مطابق ہے۔ اللہ کریم کا اپنے مقربین کی تربیت کا انداز ہے۔ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم پر جب اصحاب کہف کے بارے سوال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، میں اس کا جواب کل دوں گا تو پندرہ روز تک وحی نازل نہ ہوئی۔ پندرہ روز بعد وحی نازل ہوئی تو فرمایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ کیوں نہ فرمایا کہ اللہ نے چاہا تو کل جواب دوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ان شاء اللہ کہنا چاہیے تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمانا عنداللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی شانِ عالی سے میل نہیں کھا رہا تھا تو اللہ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ان حالات سے گزارا اور پھر فرمایا کہ آئندہ یاد رکھیے کہ آئندہ کی بات ہو تو ساتھ ان شاء اللہ لگا لیا کریں۔

اسی تربیتِ الٰہی کی دوسری مثال یہاں بیان ہوئی ہے۔ فرمایا: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا۝

اس آیۂ مبارکہ کی تفسیر میں بخاری اور مسلم کی ایک حدیث مبارک ملتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ کسی نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا اس وقت روئے زمین پر تمام انسانوں میں سے سب سے زیادہ علم والا کون ہے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: "میں سب سے زیادہ علم والا ہوں۔"

موسیٰ علیہ السلام کی بات تو ٹھیک تھی۔ آپ علیہ السلام اولو العزم رسول تھے، صاحب کتاب تھے، ربّ العالمین سے شرفِ ہمکلامی نصیب تھا تو آپ علیہ السلام سے بڑا جاننے والا اور کون ہوگا! لیکن اللہ کریم نے فرمایا کہ آپ علیہ السلام کو یہ بات زیب نہیں دیتی تھی۔ آپ علیہ السلام کو معاملہ میرے سپرد کر دینا چاہیے تھا اور یہ کہنا چاہیے تھا کہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں یا یہ کہ اللہ نے مجھے سب سے زیادہ علم دیا ہے۔ لیکن آپؑ نے یہ نہیں کہا تو اب آپ جائیں اور میرے ایک بندے کو دیکھیں جو نبی بھی نہیں ہے۔ ایک ولی اللہ ہے، دنیا میں زندہ نہیں، دنیا سے رخصت ہو چکا ہے، اسے دیکھیں کہ اسے ہم نے کس قسم کے علوم دیے ہیں۔ کیا وہ آپؑ کے پاس ہیں؟ ہر قابلیت کی تقسیم میری اپنی ہے، جس کو جو چاہتا ہوں دیتا ہوں۔

موسیٰ علیہ السلام نے حکمِ الٰہی کی اطاعت کی اور اپنے خادم سے کہا کہ مجھے خواہ ساری زندگی چلنا پڑے میں اطاعتِ الٰہی میں چلتا رہوں گا جب تک میں وہاں نہ پہنچ جاؤں جہاں میرے اللہ نے مجھے پہنچنے کا حکم دیا ہے۔ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ۔۔۔ اللہ نے مجھے وہاں پہنچنے کا حکم دیا ہے جہاں دو بحر ملتے ہیں۔ مجمع البحرین سے مراد وہ

جگہ ہے جہاں دو دریا ملتے ہیں اور حکم دیا ہے کہ اللہ کے اس بندے کو وہاں ملوں جسے اللہ نے عجیب علم عطا فرمایا ہے۔ یوشع بن نون جو بعد میں خود نبیؑ مبعوث ہو گئے وہ آپؑ کے خادم کے طور پر آپؑ کے ساتھ تھے۔ اس زمانے میں آج کل جیسی سہولیات تو نہیں تھیں، نہ ایسی سواریاں نہ نقشے۔ اللہ کریم نے انہیں ایک نشانی عطا فرمائی تھی کہ اُن کے پاس ایک مچھلی تھی۔ اللہ کریم نے فرمایا جب آپ مقررہ جگہ پر پہنچیں گے تو یہ مچھلی زندہ ہو کر پانی میں چلی جائے گی اور میرے اس بندے کی نشاندہی کرے گی۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾ جب وہ مجمع البحرین پر پہنچے تو موسیٰ علیہ السلام آرام کرنے کے لیے چٹان پر لیٹ گئے۔ اونگھ آ گئی۔ اسی اثناء میں مچھلی زندہ ہو کر پانی میں چلی گئی۔ جہاں سے گزرتی گئی وہاں ایک سرنگ بنتی گئی اور راستہ بنتا گیا۔ آپؑ آرام کر کے اٹھے اور چل دیے۔ کافی آگے جا کر حضرت یوشع سے صبح کا کھانا مانگا۔ ارشادِ باری ہے: فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾ آپؑ نے اپنے خادم سے کھانا طلب فرمایا، کہا ہمارے لیے کھانا لاؤ۔ آج تو ہم تھک گئے ہیں۔ چٹان سے آگے چلنے کے بعد جو سفر ہم نے کیا اس نے تو ہمیں تھکا دیا ہے۔

ایک لطیف نکتہ:

موسیٰ علیہ السلام اپنے خادم کے ساتھ کئی دن رات سفر کرتے رہے اور مجمع البحرین تک کے سفر میں انہیں تھکاوٹ نہیں ہوئی۔ جب وہاں سے آگے گئے تو تھکاوٹ محسوس ہوئی۔ گویا جہاں تک کا سفر حکمِ الٰہی تھا وہاں تک کے سفر میں تھکاوٹ کا نہ ہونا، اطاعتِ الٰہی کا ثمر ہے اور قبولیت کی دلیل۔ جہاں کا سفر حکمِ الٰہی سے نہیں تھا گو وہ سفر بھی ارادۃً نہیں کیا گیا تھا محض بھول گئے تھے تو اس سفر میں تھکاوٹ آ گئی۔

یہاں عوام الناس کے لیے سمجھنے کا مقام ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ جب تک بندہ اطاعتِ الٰہی پر رہتا ہے، حق پر، سیدھے راستے پر رہتا ہے اس پر بوجھ نہیں پڑتا۔ جب حق سے ہٹتا ہے تو بوجھ گھیر لیتے ہیں پھر دنیوی پریشانیاں، تفکرات اور مصیبتیں گھیر لیتی ہیں۔ اور اگر بندہ اطاعتِ الٰہی کے اندر کام کرتا رہے تو اس پر دنیوی بوجھ نہیں آتے۔

چونکہ انہوں نے جہاں تک پہنچنا تھا وہاں سے آگے چل پڑے تو اس زائد سفر نے انہیں تھکا دیا۔ پیچھے جہاں منزل تک کا سفر تھا وہاں تھکاوٹ کا نام نہیں تھا۔ غرض اس وقت آپ علیہ السلام کے خادم نے عرض کی: قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿٦٣﴾ کہ جب آپؑ چٹان پر آرام فرما رہے تھے، جب ہم چٹان پر رُکے ہوئے تھے تو مچھلی زندہ ہو کر

پانی میں چلی گئی اوراس نے پانی میں سرنگ بنا کر راستہ بنا دیا اور مجھے یاد نہ رہا کہ میں آپؑ کی خدمت میں عرض کرتا۔ شیطان نے میرے ذہن سے یہ بات محو کرادی، مجھے بھلادیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۚ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾ یہی تو وہ مقام تھا جس کی تلاش میں ہم نکلے تھے اور یہیں ہمیں پہنچنا تھا۔ پھر وہ آپس میں بات چیت کرتے ہوئے اپنے قدموں کے نشانات پر واپس چل پڑے تا کہ اس مقررہ جگہ پر پہنچیں۔ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ ۔۔۔ تو وہاں انہوں نے ہمارے ایک بندے کو پایا۔ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

علمِ لدُنّی:

فرمایا، وہاں انہوں نے ہمارے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی خاص رحمت سے نوازا تھا اور اسے ہم نے اپنے پاس سے علم بخشا تھا یعنی اس نے کسی سے سیکھا نہیں تھا، کسی کتاب سے پڑھا نہیں تھا بلکہ وہ علم ہم نے اسے براہِ راست عطا کر دیا تھا۔ یہ اللہ کی ایک نعمت ہے جسے علمِ لدُنّی کہتے ہیں۔

فرمایا: عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ ۔۔۔ ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ۔ اس کا مطلب ہے کہ علمِ لدُنّی صرف حضرت خضر رحمۃ اللہ علیہ سے مختص نہیں تھا بلکہ اللہ کے بہت سے ایسے بندے تھے جن میں سے ایک وہ تھے۔ پہلی امتوں میں بھی ایسے بندے تھے اور اُمتِ مرحومہ میں تو ایسے بندے زیادہ ہیں کیونکہ اس امت پر اللہ کی رحمتیں زیادہ ہیں۔ یہ اللہ کے ایسے بندے ہوتے ہیں کہ بغیر ظاہری ذرائع کے، علومِ حق انہیں عطا کر دیے جاتے ہیں۔ اللہ کی ذات وصفات، آخرت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی عظمت، قرآن حکیم کی صداقت، حق کے متعلق ان کے دل کھول دیے جاتے ہیں اور علوم کے خزانے انہیں عطا ہوتے ہیں۔ جو خزانے انہیں عطا ہوتے ہیں وہ اکتسابی علوم سے بالاتر ہوتے ہیں۔ ہر پڑھنے لکھنے والا اُن رازوں اور بھیدوں کو نہیں پا سکتا جو اللہ کریم علم لدُنّی والوں کو عطا فرما دیتا ہے۔ حدیث مبارک کے مطابق حضرت خضر بنی اسرائیل کے ایک ولی اللہ تھے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری (۱۵۔ ۶۴) میں امام ربانیؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت خضرؑ اپنے عہد کے قطبِ مدار تھے۔ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ان کا وصال ہو چکا تھا۔ اللہ کریم تکوینی امور میں اُن کی روح سے یہ کام لے رہے تھے۔ اولیا اللہ میں سے بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ اولیاء اللہ کو اللہ کریم قرب الٰہی کی کیفیات عطا فرماتے ہیں، یہ کیفی منازل ہیں۔ اہل اللہ شریعت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ ذکر اذکار، عبادات میں مجاہدہ کرتے ہیں، اپنے مشائخ سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی برکات پاتے ہیں۔ اللہ کریم ان کو بلند درجات عطا فرماتے

ہیں۔ایسے لوگ جب ایک خاص مقام سے آگے چلے جاتے ہیں تو ان کی روحیں بعد از وصال ملاءُ الاعلیٰ اور عرشِ عظیم کے رہنے والے فرشتوں کی طرح ہوجاتی ہیں۔جس طرح فرشتوں سے تقدیر کے کام لیے جاتے ہیں، ان ارواح سے بھی بعض ایسے کام لیے جاتے ہیں۔سب سے لے یا کسی، کسی سے یہ اللہ کی تقسیم ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق:

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی روح بھی بعد از وصال ملاالاعلیٰ میں شامل ہوگئی تھی۔ میں نے یہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، کسی کتاب میں کسی نے ذکر نہیں کیا۔اور جو کتابیں لکھتے ہیں، یہ ان کا موضوع بھی نہیں ہے۔وہ علمِ ظاہر سے، سنی سنائی یا دیکھی ہوئی باتوں کے حوالے سے لکھتے ہیں یہ باتیں کیفی ہیں اور کیفیات ان تک پہنچتی نہیں ہیں۔

حضرت خضر رحمۃ اللہ علیہ بہر حال اللہ کے ایک مقرب بندے تھے اپنے زمانے کے قطبِ مدار تھے اور دنیا میں موجود قطبِ مدار کے ساتھ ہی ہمیشہ ہوتے ہیں۔آج بھی اللہ نے جس شخص کو اس منصب سے نوازا ہوگا وہ اس کے ساتھ رہتے ہوں گے، اس کے ساتھ تعاون رکھتے ہوں گے۔

فرمایا: قَالَ لَهُ مُوسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾ موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر رحمۃ اللہ علیہ سے ملے اور فرمایا کہ اللہ کریم نے مجھے آپ کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ میں دیکھوں آپ کو کیسے علوم عطا ہوئے ہیں تو کیا میں آپ کے ساتھ کچھ روز رہ سکتا ہوں؟ تاکہ آپ کو اللہ کریم نے جو سکھایا ہے وہ آپ مجھے بھی بتائیں۔

موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت مسلّم ہے، آپ علیہ السلام اولوالعزم رسول تھے، صاحبِ کتاب تھے، اللہ سے بات کرنے کا شرف آپؑ کو حاصل تھا اور خضر رحمۃ اللہ علیہ ایک ولی اللہ تھے تو کہاں ایک ولی اور کہاں اللہ کے رسول علیہ السلام! ولی تو نبیؑ کی کی خاکِ پا کو نہیں پاسکتا۔سارے ولی بھی اکٹھے ہوجائیں تو نہیں پاسکتے لیکن علم کے شعبے الگ الگ ہیں۔

علومِ تشریعی اور علومِ تکوینی:

موسیٰ علیہ السلام کے علوم ان کی شریعت پر مبنی تھے یعنی تشریعی علوم تھے۔خضرؒ سے جو کام لیا جاتا وہ تکوینی تھا۔وہ کام جو اللہ کریم اپنی قدرتِ کاملہ سے کرتے ہیں ان امور کا علم اور وہ علوم علومِ تکوینی کہلاتے ہیں۔ تکوینی علوم انبیاءؑ کے پاس نہیں ہوتے۔انبیاءؑ کے علومِ تشریعی ہوتے ہیں۔جس شریعت کو لے کر وہ مبعوث

ہوتے ہیں اس کے تمام احکام، امت کی ساری ضروریات کے پورا کرنے کے جائز وسائل وذرائع کے تمام علوم انبیاءؑ کو عطا فرمائے جاتے ہیں۔

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ حضور! آپؑ میرے ساتھ رہ کر برداشت نہیں کر پائیں گے اس لیے کہ آپؑ کے علوم تشریعی ہیں۔ ان میں شرعی حدود و قیود ہیں۔ حلال حرام، جائز ناجائز، غلط صحیح کے احکام ہیں اور مجھے اللہ کا جو حکم ملتا ہے کہ یہ کر دو، میں وہ بجالاتا ہوں۔ یہ اللہ کی مرضی ہے۔ ان کاموں پر آپؑ کی شریعت وارد نہیں ہوتی نہ ان کاموں کے کوئی ظاہری اسباب ہوتے ہیں نہ وہ نظر آتے ہیں اور وہ کام اللہ کے حکم پر ہوجاتے ہیں۔ میرے ساتھ آپؑ رہیں گے تو کچھ ایسے کام ہوں گے جو شرعاً جائز نہیں ہوں گے تو آپؑ اعتراض کریں گے۔

اس میں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ شریعت کا اطلاق بندوں پر ہوتا ہے۔ اللہ تو شریعت کا پابند نہیں وہ تو خود شریعت عطا کرنے والا ہے۔ اللہ کی مقرر کردہ تقدیر جب نافذ ہوتی ہے تو جو اللہ چاہے وہ ہوجاتا ہے۔ یہ تکوینی امور ہیں اور تکوینی علوم آپؑ کے پاس نہیں ہیں آپؑ کے پاس علوم تشریعی ہیں۔ میں تکوینی علوم کے مطابق کام کروں گا تو آپؑ کو اس پر اعتراض ہوگا۔ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿٦٨﴾ اور جن امور کا ان کی حقیقت کا اور پس منظر کا آپؑ کو علم نہیں ان پر آپؑ صبر کیسے کر سکتے ہیں؟ آپؑ برداشت نہیں کر سکیں گے اور میرا آپؑ کا ساتھ پھر کیسے ہوگا؟ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿٦٩﴾ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، آپ مجھے ان شاء اللہ بڑا صبر کرنے والا پائیں گے، بڑا تعاون کرنے والا پائیں گے۔ میں آپ کی کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں کروں گا اور نہ آپ کے ارشاد کے خلاف کچھ کروں گا۔ آپ کو جو حکم ہوگا، آپ وہ کریں میں اس کی مخالفت نہیں کروں گا۔

خضر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شرط لگا دی: قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿٧٠﴾ کہنے لگے، پھر میری ایک شرط ہے کہ میرے کام تو آپؑ کو عجیب لگیں گے لیکن آپؑ مجھ پر سوال نہیں کریں گے جب تک میں خود نہ بتادوں۔ اللہ کی طرف سے جب مجھے حکم ہوا تو میں آپؑ کو وضاحت کر دوں گا ورنہ آپ ازخود سوال نہیں کریں گے اس لیے کہ یہ تکوینی امور ہیں اور ان پر شریعت کا اطلاق نہیں ہوتا۔

سورۃ الکھف رکوع 10 آیات 71 تا 74

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فَانۡطَلَقَا ٝ حَتّٰۤی اِذَا رَکِبَا فِی السَّفِیۡنَۃِ خَرَقَہَا ؕ قَالَ اَخَرَقۡتَہَا لِتُغۡرِقَ اَہۡلَہَا ۚ لَقَدۡ جِئۡتَ شَیۡئًا اِمۡرًا ﴿۷۱﴾ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ اِنَّکَ لَنۡ تَسۡتَطِیۡعَ مَعِیَ صَبۡرًا ﴿۷۲﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذۡنِیۡ بِمَا نَسِیۡتُ وَ لَا تُرۡہِقۡنِیۡ مِنۡ اَمۡرِیۡ عُسۡرًا ﴿۷۳﴾ فَانۡطَلَقَا ٝ حَتّٰۤی اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا فَقَتَلَہٗ ۙ قَالَ اَقَتَلۡتَ نَفۡسًا زَکِیَّۃًۢ بِغَیۡرِ نَفۡسٍ ؕ لَقَدۡ جِئۡتَ شَیۡئًا نُّکۡرًا ﴿۷۴﴾

تو دونوں چل دیے یہاں تک کہ جب کشتی میں سوار ہوئے تو (خضرؑ نے) اس (کشتی) میں دراڑ ڈال دی تب انہوں نے فرمایا کہ کیا آپ نے کشتی میں اس لیے دراڑ ڈال دی تا کہ اس میں سوار غرق ہو جائیں یقیناً آپ نے بڑی عجیب بات کی ﴿۷۱﴾ انہوں نے کہا کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ بے شک آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکیں گے ﴿۷۲﴾ انہوں نے فرمایا یہ مجھ سے بھول ہوئی ہے اس پر گرفت نہ کیجیے اور میرے معاملے میں مجھ پر مشکل نہ ڈالیے ﴿۷۳﴾ پھر دونوں چلے یہاں تک کہ وہ (راستے میں) ایک لڑکے سے ملے تو انہوں نے (خضرؑ نے) اسے قتل کر دیا انہوں نے فرمایا کیا آپ نے ایک بے گناہ شخص کو بغیر قصاص کے (ناحق) قتل کر دیا؟ یقیناً یہ تو آپ نے بہت بے جا حرکت کی ہے ﴿۷۴﴾

تفسیر ومعارف

حضرت خضرؑ کی شرط قبول کرنے کے بعد حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ دونوں چل پڑے۔ فَانْطَلَقَا حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا۔۔۔راستے میں دریا آ گیا جو کشتی کنارے پر کھڑی تھی دونوں اس میں سوار ہو گئے تا کہ دوسرے کنارے جا پہنچیں۔ کشتی والے نے ان کو دیکھا کہ بہت نورانی چہرے ہیں، نیک و پارسا لوگ ہیں۔ مفسرین کے مطابق اس نے بطورِ خدمت ان سے کرایہ بھی نہ لیا اور نہایت عزت واحترام سے کشتی میں سوار کرالیا۔ جب وہ کشتی چلی تو خضرؑ نے کشتی کو ایک طرف سے چیر دیا۔

یاد رہے اولیاء اللہ کی کرامات کے ظہور پذیر ہونے کا اپنا ایک انداز ہے جیسے اس واقعے میں ہوا کہ خضرؑ نے انگلی سے اشارہ کیا اور کشتی میں بال آ گیا، اس میں ایک دراڑ آ گئی۔ آج کل لوگ کراماتِ اولیاء اللہ کا انکار کرتے ہیں یا گمراہ لوگوں کے شعبدوں کو کرامات سمجھتے ہیں۔ یہ دورِ حاضر کا فتنہ ہے۔ ایسے ہی کسی مولوی صاحب کی تحریر پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اعتراض کر رہے تھے کہ خضر رحمۃ اللہ علیہ نے کلہاڑا اٹھایا اور کشتی پھاڑ دی تو صرف موسیٰ علیہ السلام کو ہی کیوں نظر آیا، ساری کشتی سواریوں سے بھری ہوئی تھی، انہیں کیوں نظر نہ آیا؟ ان معترضین کو صرف بزرگوں کی کرامات کا انکار کرنے کا شوق ہے اس لیے لکھ دیا کہ انہوں نے کلہاڑے سے کشتی پھاڑ دی جبکہ بات حقیقت کے برعکس ہے۔ اگر وہ کلہاڑا استعمال کرتے تو سواریاں چیخ اٹھتیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ خضر رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور کشتی میں دراڑ آ گئی جسے دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام نے گرفت کی۔ فرمایا: قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ﴿٧١﴾ فرمانے لگے، آپ نے تو کمال کر دیا۔ اس کشتی والے نے ہماری اتنی عزت افزائی کی، ہم سے کرایہ بھی نہیں لیا۔ اس کی کشتی میں اتنی سواریاں سوار ہیں، کشتی دریا کے درمیان میں ہے اور آپ نے اس میں دراڑ ڈال دی ہے اس طرح پانی کشتی میں آ جائے گا، کشتی ڈوب جائے گی۔ آپ نے ان کے احسان کا اچھا بدلہ چکایا!

خضرؑ نے عرض کی: قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٢﴾ خضرؑ نے یاد کرایا کہ میں نے تو پہلے عرض کیا تھا کہ آپؑ میرے ساتھ رہ کر ہرگز صبر نہ کر سکیں گے کہ آپؑ کے پاس شریعت کے علوم ہیں اور کسی کی کشتی پھاڑ دینا شرعاً ناجائز ہے لیکن مجھے اللہ کی طرف سے حکم ہوا۔ اللہ تو قادر ہے جو چاہتا ہے، کرتا ہے، اس کے کاموں میں کیا بہتری ہے وہ خود جانتا ہے اور وہ مخلوق کے لیے بہتر ہی کرتا ہے۔ مجھے حکم ہوا کہ اسے پھاڑ دو تو میں نے پھاڑ دی۔ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ

عُسۡرًا ﴿۷۳﴾ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، مجھ سے بھول ہوگئی، مجھے وعدہ یاد نہیں رہا۔ میں نے آپ کا کام دیکھا تو میں بے قرار ہوگیا کہ یہ تو شرعاً درست نہیں ہے لہٰذا آپ درگزر کریں اور مجھے ساتھ چلنے دیں۔ میری بھول پر گرفت نہ کریں، مجھے کسی آزمائش یا مشکل میں نہ ڈالیں۔

فَانۡطَلَقَا ٝ حَتّٰۤی اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۔۔۔ پھر چل پڑے یہاں تک کہ ایک بچے کو ملے جو کھیل کود میں مشغول تھا۔ خضر رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بھی خرقِ عادت کے طور پر قتل کر دیا۔ کوئی اشارہ کیا یا اسی طرح کا کچھ کیا کہ وہ بچہ مر گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فوراً گرفت کی۔ قَالَ ۔۔۔ آپؑ نے فرمایا: اَقَتَلۡتَ نَفۡسًا زَکِیَّةًۢ بِغَیۡرِ نَفۡسٍ ؕ لَقَدۡ جِئۡتَ شَیۡـًٔا نُّکۡرًا ﴿۷۴﴾ ایک معصوم اور بے گناہ بچے کو آپ نے بغیر کسی وجہ سے، بغیر کسی جواز کے قتل کر دیا یقیناً یہ آپ نے بہت ہی بے جا حرکت کی۔ اور شریعت کے احکام کے خلاف عمل ناقابلِ برداشت ہے۔ اسی سے علمائے حق نے یہ واضح کیا ہے کہ شریعت کا علم رکھنے والوں کا غیر شرعی اعمال پر گرفت کرنا ضروری ہے اور شریعت کے خلاف ہوتا دیکھ کر خاموش رہنا صحیح نہیں۔

بے شمار لوگوں کی اصلاح کا سبب بننے والی قرآن تفسیر

حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کی

اردو تفسیر آڈیو، وڈیو اور لکھی ہوئی تینوں طرح کی دیکھیں، سنیں یا ڈاؤن لوڈ کریں۔

پنجابی تفسیر وڈیوز دیکھیں ڈاؤن لوڈ کریں۔ قرآن کا اردو ترجمہ اور کتابیں ڈاؤن لوڈ کریں۔

قرآنِ کریم کی تلاوت اور حضرت صاحب کا اردو ترجمہ آڈیو۔ کمپیوٹر اور موبائل پر سننے کے لیے ڈاؤن لوڈ کریں۔ حضرت جی کا کلام حمد اور نعتیں آڈیو وڈیو سنیں اور ڈاؤن لوڈ کریں۔

دلچسپ سوال جواب پر مشتمل ٹی وی پروگرام اَلمرشد کی تمام 125 اقساط کی وڈیوز دیکھیں

www.QuranTafseer.net

حضور نبی پاکؐ کے حضور آج بھی روحانی طور پر حاضری ممکن ہے اور ہزاروں مرد و خواتین یہ سعادت رکھتے ہیں۔ لیکن کیسے؟

تصوف تزکیہ روحانیت ، ذکر، روحانی سلسلہ ،روح، کشف، بیعت ان تمام موضوعات کو سمجھنے کے لیے حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کے وڈیو بیانات اور کتابیں موجود۔

طریقہِ ذکر جس سے دل سے لے کر جسم کا ہر باڈی سیل اللہ اللہ ذکر کرنے لگ جائے۔

حضور نبی پاک ﷺ کے حضور روحانی طور پر حاضری کی سعادت۔

یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے اور مکمل رہنمائی کے لیے ویب سائیٹ وزٹ کریں۔

اس پوسٹ کو زیادہ سے زیادہ شیئر کر کے آپ بھی اس نیک کام کا حصہ بنیں۔